پاکستان میں غزل کے نعت گو شعراء

(صاحبانِ مجموعہ ہائے غزل و نعت)

مرتب:

سید محمد قاسم

سرورق: سید محمد وہیب الحسن

پاکستان میں غزل کے نعت گو شعراء

(صاحبانِ مجموعہ ہائے غزل و نعت)

مرتبہ

سیّد محمد قاسم

تذکرہ ہاؤس، اے ۱۳۶، سیکٹر ۱۱-بی، نارتھ کراچی

فون: 021-36996413

رنگِ ادب پبلی کیشنز

نگرانِ اشاعت
شاعر علی شاعر
0336-2085325

کتاب	:	پاکستان میں غزل کے نعت گو شعراء (صاحبانِ مجموعہ ہائے غزل و نعت)
مرتبہ	:	سید محمد قاسم تذکرہ ہاؤس، اے ۱۳۰۹، سیکٹر ۱۱-بی، نارتھ کراچی فون: 021-36996413
سرورق	:	صولت عاطف
اشاعت	:	2018ء
ناشر	:	رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی 0345-2610434 021-32761100 rangeadab@yahoo.com www.facebook.com/rangeadab
تزئین کار	:	شیرازی شاعر 0300-2054154
طباعت	:	ذکی پرنٹرز، میکلوڈ روڈ، کراچی
تعداد	:	500
صفحات	:	560
قیمت	:	=/800 روپے

انتساب

پیارے بھائی

شاکر کنڈان

کے نام

سیّد محمد قاسم کی دیگر تصانیف

پاکستان کے نعت گو شعرا	(تذکرہ و منتخب کلام)	جلد اوّل
پاکستان کے نعت گو شعرا	(تذکرہ و منتخب کلام)	جلد دوم
پاکستان کے نعت گو شعرا	(تذکرہ و منتخب کلام)	جلد سوم
پاکستان کے نعت گو شعرا (زیر طبع)	(تذکرہ و منتخب کلام)	جامع ایڈیشن
خاک میں پنہاں صورتیں	(کراچی کے مرحوم شعرا کا تذکرہ)	
سیرت امام سیرین	(سیرت نگاری)	
تذکرہ	(ادبی جریدہ)	

◆◆◆

فہرست

(یہ فہرست حروف تہجد کے اعتبار سے ترتیب دی گئی ہے)

(آ)

(الف)

(ح)

(خ)

(ذ)

(ر)

(س)

(ش)

(ص)

(ض)

(ظ)

(ع)

(غ)

(ف)

(ق)

(ک)

(گ)

(ل)

(م)

(ن)

(ہ)

(ی)

◆◆◆

مقدمہ

سید محمد قاسم کے تذکرے
''پاکستان میں غزل کے نعت گو شعراء''
کا انتقادی جائزہ

از: خیام العصر محسن اعظم ملیح آبادی

(شاعر، نقاد، محقق)

اُردو کے تذکروں میں کچھ ایسے تذکرے بھی ہیں، جن میں تخلیق کار کے ذکر کے ساتھ مختصراً نقد و نظر بھی ہوتا ہے۔ ایسے تذکروں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس میں کلام نہیں، تاریخ نگاری، سوانح نویسی اور تذکرہ لکھنا آسان کام نہیں۔ اس میں تفتیش و تفحص اور تحقیق کی گھاٹیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ کُل وقتی کام ہوتا ہے، تحقیق و تفحص کا میدان سر کرنا، جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ہمارے پاکستان کے ثقہ تذکرہ نگاروں میں ایک معتبر نام سید محمد قاسم صاحب کا بھی ہے۔ تذکرہ نگاری کے ضمن میں تحقیق و جستجو کی ریاضت و محنت میں منہمک اس پیکر جہد و عمل سے میری چند سرسری سی ملاقاتیں ہوئی ہیں لیکن میں نے ان کا تمام ہی موقر تحریری کام دیکھا ہے، یعنی ان کے تالیفی و تصنیفی کاموں میں معتبر تذکرے بنام ''پاکستان کے نعت گو شعراء'' تین جلدیں، ''خاک میں پنہاں صورتیں'' (کراچی کے مرحوم شعراء) ''آثار ابن سیریں'' ایک محقق سوانحی، تالیف و تصنیف جس میں امام سیریں کے کوائف، حیات اور علمی خدمات نہایت واضح انداز میں بیان کی ہیں۔ قاسم صاحب ایک ماہنامہ ''تذکرہ'' کے نام سے نکالتے تھے اس میں گاہ گاہ

میں نے ان کے مختصر مضامین اور شذرات دیکھے، ہیں جو خاصے معلوماتی ہیں اور ان میں تحقیقی شعور ملتا ہے۔

سید محمد قاسم بھی ان محسنینِ ادب میں سے ہیں جنہوں نے اپنے تذکروں میں سیکڑوں شعراء کو گمنامی سے بچالیا ہے۔ میرے علم میں ہے کہ کراچی میں بہت سے ایسے شاعر تھے جو شہرت یافتہ نہیں تھے، مگر اپنی عظمتِ شاعرانہ، بلندیٔ کلام اور قادر الکلامی میں اپنا مثیل نہیں رکھتے تھے۔ ان کے نام سے بھی کوئی واقف نہیں رہا تھا مگر سید محمد قاسم صاحب کے تذکروں میں "پاکستان کے نعت گوشعراء" اور "خاک میں پنہاں صورتیں" میں وہ لوگ بھی نظر آئے جو گمنام ہو چکے تھے، ان کی وفات کو عرصہ بیت چکا تھا۔ انہیں اُردو شعری ادب کی تاریخ میں زندہ کر دیا ہے۔

جناب سید محمد قاسم درسِ نظامیہ کے فارغ التحصیل ہیں اور انہوں نے فاضل اُردو کا امتحان بھی امتیازی نمبروں سے پاس کیا ہے۔ میں نے ان سے چند ملاقاتوں میں اندازہ کیا ہے وہ ڈگری یافتہ ہی نہیں وہ در حقیقت ان ثقہ و معتبر علمی افراد میں سے ہیں جو تعلیم یافتہ کہلانے کے کماحقہ مستحق ہیں۔ ان کا علم منقولی اور معقولی نہایت ٹھوس ہے، وہ گہرے اور مشاہدے اور مطالعے سے مستیز ہیں وہ اپنی گفتگو اور تحریری امور میں دلیل و برہان کے حامل فرد ہیں وہ اپنے مطالعے اور مشاہدے سے جو نتیجہ اخذ و استنباط کرتے ہیں وہ حکم کا درجہ رکھتا ہے۔ ادب و شاعری کی تاریخ پر ان کی خصوصی عمیق النظری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ان کی فکر و تحقیق و جستجو میں جھول نظر نہیں آتا۔ وہ ایسے تذکرہ نگار اور سوانح نویس ہیں جو دوٹوک بات کہنے کے قائل ہیں وہ صوری و معنوی انداز فکر و نظر میں گول مول (مذ ور) بات کہنے سے گریز کرتے ہیں۔ وہ اپنے تذکروں میں جن باتوں کا حوالہ دیتے ہیں۔ ان میں تاریخی و تحقیقی عینیت اور حقیقت واضح انداز میں ملتی ہے۔ وہ جب کسی پر کچھ لکھتے ہیں تو مثبت و مستند امور کو لے لیتے ہیں جس کی سند میں جھول نظر آتا ہے اسے چھوڑ دیتے ہیں وہ مضمون کو طویل کرنے کی جستجو میں رطب و یابس سے حذر کرتے ہیں۔ وہ جمودی اور قیاسی امور کے ادراک سے سمجھوتا نہیں کرتے ان کے یہاں تحرک اور تدبر ساتھ ساتھ سفر کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ انتقادی تناظر میں ایک دیانت دار سوانح اور تذکرہ نگار کے روپ میں عہد حاضر کے مستند و ممتاز مورخانہ نگاہ رکھنے والے تذکرہ نگار ہیں۔ ان کے تذکروں میں جھول بہت کم نظر آتا ہے۔

میں نے ان کی تحریروں سے اخذ کیا ہے وہ جب کسی شاعر کی شاعرانہ حقیقت اور صلاحیت پر بات کرتے ہیں تو جستجو کرتے ہیں کہ دوسرے تذکرہ نگاروں نے کیا لکھا ہے اس کے دیے ہوئے حوالے میں تحقیق میں توانائی کی کتنی مقدار اور بینائی کتنی موجود ہے۔ فنکار (شاعر) کے متعلق جو کچھ تحریر ہوا ہے اس کے سیاق وسباق کی روشنی میں بھی دیکھتے ہیں اور اپنے انتقادی چاک پر اسے گھماتے ہیں اس کے نتیجے میں جو کچھ سامنے آتا ہے اسے اجمالی انداز میں لکھتے ہیں۔ میں نے ان کے تذکروں میں دیکھا ہے۔ وہ سنہ ولادت اور ارتحال پر خاص توجہ دیتے ہیں۔ تذکروں میں جو تاریخ ولادت اور وفات کا فرق نظر آیا اسے انہوں نے کثرت رائے کی بنیاد پر اپنے تذکروں میں تحریر کیا ہے۔ سید محمد قاسم صاحب کو میں نے نہایت دیانت دار، اور اصول پسند تذکرہ نگار پایا ہے انہوں نے کوئی بات جہاں کہیں سے لی ہے اس کا ذکر کر دیا ہے اپنی ذاتی کوشش وجستجو اور تحقیق کے علاوہ جن تذکروں سے استفادہ کیا ہے ان کی ایک فہرست بھی اپنے اظہاریئے میں لکھ دی ہے۔ ادھر حال میں جن حضرات نے اردو ادب اور اس کے متعلقات کے بارے میں جو پی ایچ ڈی کے مقالات تحریر کیے ہیں اور شائع بھی ہو گئے ہیں ان میں سید محمد قاسم صاحب کے تذکروں سے بھی مدد لی گئی ہے۔ میرے خیال میں یہ بات کسی تذکرہ نگار کے لیے باعث افتخار ہے جناب قاسم موصوف کی تحریر کردہ کتب تذکرہ سے حوالے دینا ان کے تذکروں کا مستند ہونا ثابت ہوتا ہے مگر مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ ان پی ایچ ڈی کے مقالات میں سید محمد قاسم صاحب کے تذکروں اور ان کے نام کو پردۂ اخفا میں رکھا گیا ہے میں اسے ادبی بد دیانتی کے مترادف سمجھتا ہوں۔ پی ایچ ڈی کے مقالات چونکہ تالیفی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ وہ تصنیف کامل کے زمرے میں نہیں آتے۔ ان میں جن کتب سے اخذ واستنباط اور حوالہ لیا گیا ہو ان کا ذکر کرنا لازمی ہے۔

سید محمد قاسم صاحب نے جو تذکرے لکھے ہیں وہ اپنے حوالوں اور متن کے اعتبار سے سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ قاسم موصوف نے انہیں کڑی انتقادی چھلنی میں چھان لیا ہے۔ جو اپنی تحقیق لکھی ہے اس میں کوئی کلام نہیں' یہ بات میں صرف اس بنیاد پر کہہ رہا ہوں کہ میں نے ان کے تمام تذکروں کو بالاستیعاب تنقیدی تناظر میں پڑھا ہے۔ سید محمد قاسم موصوف کے تمام تذکرے اور زیر نظر تذکرہ "پاکستان میں غزل کے نعت گو شعراء" کا تذکرہ مختصر ضرور ہے مگر سند کے مرتبے پر فائز

رہے اس تذکرے میں بھی قاسم موصوف نے اس پر خصوصی توجہ دی ہے کہ جن شعرائے کرام کے مجموعہ غزل دستیاب ہیں اور نعت کے مجموعے بھی ہیں اور جن کے نعت کے مجموعے نہیں ہیں مگر ان کے مطبوعہ غزلیہ کلام میں نعتیں ہونے کی اساس پر انہیں زیر نظر تذکرے میں شامل کیا ہے۔ قاسم صاحب اس تذکرے کی تالیف اور جمع و تدوین میں بڑی محنت اور جستجو فرما رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں جہاں تک ممکن ہو ایسے ہی شعراء تذکرے کا حصہ بنیں جن کے غزل اور نعت کے مجموعے موجود ہیں۔ یا صرف غزل یا نعت کے مجموعے دستیاب ہیں۔ ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس تذکرے میں زیادہ سے زیادہ شعراء آ جائیں جو غزل کے ساتھ نعت ختمی مرتبت بھی کہتے ہیں۔ موصوف کے اس تذکرے میں وہ شعراء بھی شامل ہیں جو حیات ہیں اور جو زندہ نہیں ان کو بھی ان کے مجموعوں کی بنیاد پر شامل تذکرہ کیا ہے اس ضمن میں وہ لائبریریوں میں جا کر تحقیق کا فریضہ بڑی دلجمعی سے ادا فرما رہے ہیں یہ ان کے ایک دیانت دار، محقق اور تذکرہ نگار ہونے پر دلیل مسکت ہے ایک بڑے تذکرہ میں جو خوبیاں جمع ہونی چاہئیں وہ سید محمد قاسم صاحب کو رب کائنات نے عطا فرمائی ہیں۔

تذکرہ نگاری بھی ایک دشوار ترین کام ہے۔ تذکرہ نگار میں ان چند اہم خصوصیات کا ہونا ضروری ہے مثلاً اس میں مورخانہ شعور بدرجہ اتم پایا جاتا ہو۔ اس میں سوانحی اور تاریخی امور پر جرح و تعدیل کے عمل سے گزرنے کی پوری توانائی موجود رہے۔ اس میں انتقادی اور تحقیقی بصیرت موجود رہے یہ تمام شرائط اور خوبیاں اگر کسی تذکرہ نگار میں موجود ہیں تو وہ ایک بڑا مستند تذکرہ نگار ہے میری انتقادی رائے میں وہ کسی مستند و معتبر تذکرہ نگار سے کم درجے پر فائز نہیں۔ میں انہیں عہد حاضر کے ثقہ تذکرہ نگاروں کی صف میں دیکھ رہا ہوں ان کی تحقیق و جستجو اور تفحص کے محاکے لائق اطمینان ہیں۔ راقم الحروف (خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی) نے عربی، فارسی اور اردو کے قدیم و جدید اکثر تذکرے پڑھے ہیں اور انتقادی نظر سے دیکھے ہیں۔ ان تذکروں میں کچھ ایسے تذکرے بھی ہیں جن میں تذکرہ نگار ذاتی پسند و ناپسند علاقائی لسانی اور قومی نہج پر غیر جانب داری کی راہ سے ہٹ گئے ہیں۔ اپنے بیان میں بڑی ہوشیاری سے ڈنڈی ماری ہے۔ یہ عمل دیانت و امانت کے خلاف ہے میں نے سید محمد قاسم صاحب کو اس قسم کی جانبداری سے بری پایا ہے۔ وہ اس بیان کردہ طرف داری کو اصول تذکرہ نگاری کے خلاف جانتے ہیں۔ انہوں نے ہر

تعلق اور جانب داری سے بلند تر ہو کر تذکرے تالیف کیے ہیں۔

میں نے سید محمد قاسم صاحب کے تمام تذکرے اور زیر نظر تذکرہ "پاکستان میں غزل کے نعت گو شعراء" بھی پڑھا ہے اس تذکرے میں ابھی کچھ امور تحقیق طلب ہیں جن کی درستی کے لیے وہ کوشاں ہیں اور مزید معلومات جمع کر رہے ہیں۔ جن کا جائزہ لینے کے بعد انہیں شامل اشاعت کیا جائے گا۔ قاسم موصوف کے مطبوعہ تذکروں پر جن سنجیدہ و دور بین اور معاملہ فہم حضرات نے اپنی انتقادی و تحسینی آراء دی ہیں۔ میں اپنی انتقادی رائے کو ان سے متصادم نہیں پاتا۔ انہوں نے حتی المقدور صحت بیان اور حوالوں کی روشنی میں جو کچھ لکھا ہے اس پر بھروسا کیا جائے گا۔ میں نے ان کے تذکروں کے بارے میں وہ ثقہ و معتبر حضرات جو علم تاریخ اور تذکرہ نگاری کے فن اور اصول پر گہری نظر رکھتے ہیں جب ان سے تبادلۂ خیالات کیا تو انہوں نے سید محمد قاسم صاحب کے تذکروں کی سند کے بارے مثبت، اور معقول رائے کا اظہار کیا۔ ان کی تذکرہ نگاری اور امور تحقیق و جستجو کو سراہا ہے۔ ان میں سے کچھ معتبر و ثقہ نام یہ ہیں:

پروفیسر یاسین خان بہار شاہجہان پوری، پروفیسر رئیس علوی، رفیع الدین راز، فراست رضوی، شاعر جمالیات و لمسیات رونق حیات، منظر عارفی، ڈاکٹر عزیز احسن، معین اثر چشتی، عبید اللہ ساگر، نعیم انصاری، شارق رشید، محمد اختر غزالی، یوسف راہی چاٹگامی وغیرہ ان کے علاوہ جن معتبر اور ثقہ حضرات کی تفصیلی و اجمالی آراء جناب سید محمد قاسم کے تینوں تذکروں بنام "پاکستان کے نعت گو شعراء" میں ہیں یا رسائل و جرائد میں شائع ہوئی ہیں ان میں سے یہ محترم حضرات ہیں:

افسر ماہ پوری (مرحوم)، ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی (مرحوم) علی حیدر ملک (مرحوم) ڈاکٹر عزیز انصاری، (مرحوم)، پروفیسر سہیل اختر (مرحوم) مولانا عبدالستار (مرحوم) اختر لکھنوی (مرحوم) پروفیسر ہارون الرشید، شفیق احمد شفیق، ڈاکٹر شہزاد احمد، زاہد رشید، شبیر احمد انصاری، فصیح چغتائی وغیرہ بھی ہیں۔ ان مذکورہ حضرات کی انتقادی و تحسینی آراء کو عہد حاضر کے اہل قلم میں اعتبار حاصل ہے۔ ان کی آراء کے معتبر حوالے کسی بھی لکھاری کے لیے سند کا درجہ رکھتے ہیں ان حضرات نے جو آراء تحریر کی ہیں وہ تذکرہ نگاروں کی مجبوریوں اور جادۂ تحقیق و تفحص میں پیش آنے والی دشواریوں کے تناظر میں ہیں۔ انہوں نے انتقاد و تحسین کی کند چھری تذکرہ نگار کے گلے پر رکھ کر تنقیص کا رویہ

اختیار نہیں کیا ہے۔ وہ تذکرہ نگاروں کی ایسی فروگذاشت اور سہو پر انگلی نہیں رکھتے جس سے تذکرہ نگار کا حوصلہ پست ہو جائے۔ اس عمل سے کتاب کے قاری کو بھی کوئی فائدہ یا نقصان نہیں ہوتا۔ معمولی فروگزاشت اور سہو صرف محققین کے لیے وجہ تذبذب بنتی ہیں اور کسی کے لیے نہیں۔ ویسے تنقیص کے لیے تو ثقہ سے ثقہ کتاب میں گنجائش نکالی جا سکتی ہے مگر ایسی موشگافی یعنی بال کی کھال نکالنا تنقید نہیں صرف تنقیص ہے اس عمل سے تذکرہ نگاری ہو یا سوانح نگاری یا واقعہ نگاری یا تاریخ لکھنا اس میں خلل پڑتا ہے۔ لکھنے والے کا عزم و حوصلہ پست ہو جاتا ہے اس کے تحقیقی و تفتیشی عمل کے ارتقاء میں دیوار کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی فروگزاشت و سہو کے ضمن میں تو اردو کا پہلا تذکرہ ''نکات الشعراء'' مولف میر تقی میر ''گلشن بے خار'' محرر غلام مصطفیٰ خان شیفتہ ''آب حیات اور سخندان فارس مولف محمد حسین آزاد دہلوی شعرالعجم تذکرہ نگار مولانا شبلی نعمانی، گل رعنا وغیرہ عربی، فارسی، اردو کے تذکروں میں ایسے کئی ہیں جو قابل گرفت ہیں مگر مبصرین اور ناقدین نے ان سے صرف نظر اس لیے کیا ہے کہ تذکرہ نگار کے لیے بعض ایسی مجبوریاں سامنے آجاتی ہیں جنہیں وہ رہنے دیتا ہے اس لیے بُعد زمانی راہ میں حائل ہو جاتا ہے اور حوالے نہیں ملتے۔

سید محمد قاسم صاحب کو اپنے تذکرے مرتب کرنے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے خود ذاتی تحقیق و جستجو کے ساتھ سینکڑوں کتب کا مطالعہ جن سے شعراء کا احوال معلوم ہو اور ان کے تناظر میں اپنا تذکرہ مرتب کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے جسے انہوں نے حتی المقدور حزم و احتیاط سے پیش کرنے کی سعی جمیل کی ہے۔ اس ضمن میں وہ کتنے ہی مشہور و معروف اور غیر مشہور و گمنام شعراء کو منصۂ شہود پر لے آئے ہیں۔ یہ ان کا اور کئی تذکرہ نگاروں کی اردو ادب کی تاریخ پر احسان عظیم ہے۔ ورنہ بیسویں اور اکیسویں صدی کے بہت سے شعراء گوشہ گمنامی کی نذر ہو جاتے۔ معمولی فروگزاشتوں اور سہو اور حوالوں سے ملنے والے مواد کی روشنی میں اگر کہیں کچھ سہو نظر آجائے تو وہ قابل گرفت ہرگز نہیں۔ سید محمد قاسم نے اپنے تذکرے لکھنے میں جو محنت شاقہ اٹھائی ہے اسے پیش نظر رکھنا چاہیے۔ ان میں جو محاسن و زوائع ہیں ان کی داد و تحسین ہونی چاہیے۔ وہ اپنے ہم عصر تذکرہ نگاروں میں ایک معتبر نام ہیں۔ تذکرہ نگاری کے بعض امور میں وہ سبقت لے گئے ہیں ان کی تذکرہ نگاری کی زبان صحافیانہ نہیں بلکہ علمی و انشائی ہے۔ ان کی تحریریں سریع

التاثیر اور واضح ابلاغ کی حامل ہیں۔ نثر میں ژولیدگی و پیچیدگی نہیں۔ ثقل بیان سے مبرا ہے۔ سلاست وروانی کی خوبی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کا مطالعہ پہناور ہے۔ جہاں وہ تخلیقی انداز کی نثر لکھتے ہیں۔ اس میں انشائی حسن جھلکتا ہے۔ تالیفی انداز کی نثر کو اپنے اسلوب تحریر میں ڈھالنے کے فن سے پوری طرح واقف ہیں۔ لفظیات کا استعمال ان کی اکثر تخلیقی تحریروں میں برمحل نظر آتا ہے۔ الفاظ کا استعمال مفہوم اور متن کی رعایت سے کرنے پر مہارت ہے۔

سید محمد قاسم صاحب عمرانیات، تاریخی وجغرافیائی معلومات کے مبادی ہی نہیں انتہائی امور پر بھی دسترس رکھتے ہیں۔ اس تناظر میں بھی شاعر کا تعارف بڑی عمدگی سے پیش کرتے ہیں اس کے حوالے پروفیسر سہیل اختر مرحوم نے اپنے ایک مبسوط مضمون ''پاکستان کے نعت گو شعراء'' میں دیے ہیں۔ میں انہیں کو اپنے مندرجہ بالا بیان کی شہادت میں پیش کر رہا ہوں جن میں صنعت، ایجاز واختصار کی خوبی بدرجہ اتم نظر آتی ہے۔ وہ تفصیل کو اجمال کا حسن دینے میں کمال رکھتے ہیں۔ بے شک وہ ماقل ودل کے ماہر نثر نگار ہیں۔ اس ضمن میں پروفیسر سہیل اختر نے جو ان کی تعارفی تحریروں سے اقتباسات دیے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

> ''عارف سیمابی...... سیالکوٹ، ہماری ملی اور دفاعی تاریخ میں ایک اہم مقام رکھتا ہے اور دور جدید میں اختراعی ساز وسامان بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ پاکستان کے قومی شاعر علامہ اقبال کی جائے پیدائش بھی یہی شہر ہے۔ یہاں ہر شعبہ زندگی میں اہم کارنامے انجام دینے والے لوگ ہوتے رہے ہیں۔ شعر وادب کے حوالے سے یہ زمین خاصی زرخیز ثابت ہوئی ہے۔''

ان چند سطور پر غور فرمائیں تو تفصیل کا اجمال موجود ہے۔ سیالکوٹ کی تاریخ سمٹ کر آ گئی ہے۔ فیض واقبال جیسے بین الاقوامی شہرت کے ممتاز ترین شاعروں نے یہیں جنم لیا ہے۔ کھیلوں کے سامان اور دیگر امور یعنی سن انیس سو پینسٹھ کی جنگ میں سیالکوٹ تاریخ کا روشن حصہ ہے۔

مندرجہ ذیل اقتباس بھی ملاحظہ فرمایئے:

> ''احمد ظفر کی ولادت راولپنڈی میں انیس سو چھبیس میں ہوئی

۔دنیا فانی ہے' انسان عشرت کدے سے نکل کر سفر لافانی پر روانہ ہو جاتا ہے۔ احمد ظفر جو راولپنڈی میں پیدا ہوئے تھے گوجرانوالہ کی مٹی انہیں راس آئی اور سولہ اگست دو ہزار ایک کو اسی سرزمین میں ابدی نیند سو گئے۔''

جناب سید قاسم روایتی انداز کے تعارف کو اپنے اسلوب نگارش کی تازگی سے زیادہ دلکش بنا دینے کے ہنر سے واقف ہیں۔

جناب قاسم موصوف کبھی کبھی کسی کے تعارف کے ساتھ تاریخ سے بھی پردہ اٹھا دیتے ہیں اس ضمن میں درج ذیل اقتباس دیکھیے:

''نعیم میرٹھی...... میرٹھ جہاں راون کی سسرال تھی۔ میرٹھ جسے اندر پرتی، کے سلسلے میں پانڈوؤں کے سب سے بڑے بھائی یدھشٹر نے پاہی نامی معمار کو جاگیر کے طور پر دیا تھا اور جہاں اس نے اپنا محل تعمیر کیا تھا اس محل کے آثار آج تک اندر کوٹ نامی محلے میں پائے جاتے ہیں۔ جاٹوں کی روایت کے مطابق یہاں مہاراٹھ گوٹھ آباد تھا اور یہی مہاراٹھ' بگڑ کر میرٹھ بن گیا ہے۔''

اسی تاریخی تناظر میں مندرجہ ذیل اقتباس بھی ملاحظہ فرمایئے:

''صوفی غلام حسین...... ''سرگودھا'' یہ دو لفظ سر' اور گودھا کا مرکب ہے۔ ہندی زبان میں ''سر'' کے معنی تالاب یا جوہڑ کے ہیں اور گودھا ایک فقیر کا نام تھا۔ اس فقیر کی نسبت سے ''گودھے والا سر'' پڑا لیکن کثرت استعمال سے اس کا نام سرگودھا ہو گیا۔''

سید محمد قاسم کی تاریخی معلومات کی یہ اقتباسات شہادت ہیں:

''حزیں صدیقی...... ملتان شہر کی کھدائی کے دوران آثار قدیمہ سے تعلق رکھنے والی جو چیزیں برآمد ہوئی ان کی تحقیق سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ تین ہزار سال قبل مسیح میں ملتان ایک تہذیبی وتمدنی شہر تھا ۔چینی سیاح'' ہوان سانگ'' نے اس شہر کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔'' کتاب

الہند'' میں مشہور مفکر ابوریحان البیرونی نے بھی اس کا تذکرہ کیا ہے۔
ملتان کو اصل شہرت اسلامی عہد حکومت میں حاصل ہوئی۔''

''سید محسن علوی..... لکھنؤ کا، کاکوروی خاندان، شعر وادب کے حوالے سے کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ علامہ درد کاکوروی کا شمار قادر الکلام شعراء میں ہوتا ہے۔ اسی خاندان کے علامہ نورالحسن نیر کاکوروی وہ فاضل ہیں جن کے سر اردو زبان کی پہلی لغت ''نوراللغات'' ترتیب دینے کا سہرا بندھا ہے جو چار ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے۔''

مندرجہ بالا اقتباسات کی روشنی میں اردو زبان کے ممتاز و منفرد تذکرہ نگار سید محمد قاسم کی منفرد تذکرہ نگاری سے انکار کسی صورت ممکن نہیں اس سے ان کے تبحر علمی اور تاریخ سے کماحقہ آگاہی کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ شاعر کے تعارف کے ساتھ عمرانیات، جغرافیائی و تاریخی روشنیاں بھی بکھیرتے نظر آتے ہیں۔ انتقادی تناظر میں وہ صف اوّل کے تذکرہ نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ایک روشن خیال، جہاں دیدہ اور نقد و نظر کی خوبی سے متصف لکھاری ہیں۔ انتخاب کلام میں بھی ان کی اعلیٰ سخن فہمی کو دخل ہے۔ ان کا استحسان سخن بلا کا ہے۔ اس کے عروقِ شعریہ میں روح شاعری گردش کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ اچھی شاعری کے سلیم الحواس قاری ہیں استلذاذ سخن ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ کوئی تذکرہ نگار اگر اعلیٰ شعری شعور کا حامل نہ ہو وہ شاعر کی شاعرانہ عظمت اور فکر و آگہی کا کماحقہ اظہار نہیں کر سکتا۔ سید محمد قاسم شاعر نہیں ہیں مگر شاعرانہ نفسیات اور مزاج رکھتے ہیں اس کی گواہی وہ نعتیں اور غزلیں ہیں جو انہوں نے زیر نظر تذکرے ''پاکستان میں غزل کے نعت گو شعراء'' کے لیے منتخب کی ہیں۔ اگر کوئی غزل اور نعت شعری استحسان کی حامل نہیں سمجھتے اس کا انتخاب نہیں کرتے اگر خود کسی شاعر نے انتخاب کر کے دی ہوں اور وہ انہیں پسند نہ آئیں تو دوسری غزل اور نعت کا مطالبہ کرتے ہیں یا اس کے مجموعۂ غزلیات و نعت سے منتخب کرتے ہیں۔ یہ بات ان کے اعلیٰ سخن فہم ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

سید محمد قاسم صاحب کی نظر میں ''نعت ادب عالیہ سے آگے کی چیز ہے۔'' وہ فرماتے ہیں ''میں سمجھتا ہوں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد میں صرف ایک آنسو بھی حاصل زندگی قرار پا سکتا

ہے۔ بعض شاعر غلو سے کام لیتے ہیں اور نبوت والوہیت میں جو فرق ہے اسے طاق بے احتیاطی پر رکھ دیتے ہیں ایسے حالات میں بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ نیکی برباد گناہ لازم۔'' وہ حمد و نعت کے درمیان جو خط فاصل ہے اس پر نظر رکھتے ہیں انہوں نے ایسی نعتیں منتخب نہیں کی ہیں جن میں عبد و معبود کا فرق محسوس نہ ہو۔ قاسم موصوف نے جو تذکرے ''پاکستان کے نعت گو شعراء'' کے نام سے لکھے ہیں ان کے تین حصے ہیں ان کے علاوہ ''خاک میں پنہاں صورتیں'' اور ''پاکستان میں غزل کے نعت گو شعراء'' بھی دو تذکرے ہیں۔ جن میں نعتوں کا انتخاب بڑی احتیاط سے کیا ہے۔ وہ نعتیں بڑی احتسابی ہیں ان میں عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تڑپ بولتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ وہ معیاری نعتیں انتخاب کرنے کے ماہر تذکرہ نگار ہیں۔ ان کی تحریر کردہ کتب تذکرہ میں نعتوں کا بڑا سرمایہ نہایت معیاری، مترنم، سلیس و رواں اور سریع الاثر ہے۔ شاعری میں جو زبان استعمال ہونا چاہیے اس سے پوری طرح واقف ہیں۔ پھر نعت میں جو زبان آنا چاہیے اس کا ادراک بھی انہیں ایک تجربہ کار شاعر کی طرح ہے۔ انتقادی روش میں وہ بیدار دماغ اور بصیرت سے متصف تذکرہ نویس ہیں۔

سید محمد قاسم صاحب انتقادی سوجھ بوجھ رکھنے والے شخص ہیں وہ اردو نعتیہ ادب ہی پر گہری نظر کے حامل نہیں غزل اور نظم کے سرمائے پر بھی عمیق نظر رکھتے ہیں۔ وہ قدیم و جدید، نیم جدید اور جدید و مابعد جدید کا شعور بھی رکھتے ہیں۔ وہ صرف ایک معتبر تذکرہ نگار ہی نہیں ادب و شعر کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی تحقیقی مضامین لکھتے ہیں۔ محمد قاسم موصوف صرف کتب شعر و ادب ہی کا مطالعہ نہیں کرتے جیسا کہ میں سطور بالا میں لکھ آیا ہوں کہ وہ نقد و نظر کا ذوق بھی رکھتے ہیں۔ کتب انتقاد بھی ان کے مطالعے میں رہتی ہیں۔ وہ قدیم و جدید نقد نگاری سے پوری طرح واقف ہیں۔ شعر و ادب کے موضوع پر تو وہ ایک مستند شخص ہیں ہی۔ معارف اسلامیہ اور تاریخ پر بھی ان کی نظر گہری ہے۔ وہ ہر موضوع کی کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں ان کا شغل ہی لکھنا اور مطالعہ ہے یہی وجہ ہے کہ مطالعے کا اثر ان کے تذکروں میں بھی محسوس ہوتا ہے۔ انتقادی نظر رکھنے کے سبب وہ جب کسی پر نقد و نظر کرتے ہیں تو وہ ان سے خفا ہو جاتا ہے۔ وہ خود بھی کشادہ دل اور معاملہ فہم انسان ہیں ان پر اگر مثبت تنقید کی جائے تو اسے قبول کر لیتے ہیں، کج بحثی نہیں کرتے۔ یہی وہ دوسروں سے بھی

چاہتے ہیں۔ مگر کیا کیا جائے کہ ہمارے لکھاریوں کی لنکا میں سب ہی باون گز کے ہیں۔ غلطی اور سہو قبول کرنا توہین سمجھتے ہیں۔ بس قاسم صاحب سے لوگوں کا اختلاف ان کے انتقادی شعور اور حق گوئی کے سبب ہے مگر میں نے قاسم موصوف کو نظر انداز کرنے والا اور عفو و درگزر کی خو کا حامل شخص پایا ہے وہ ایک نیک سیرت اور با کردار آدمی ہیں ان سے مل کر ایک شرف آدمیت سے متصف شخص کا تصور ابھرتا ہے۔ وہ ایک باشرع صوفی منش انسان ہیں۔ راسخ العقیدہ مسلمان ہیں۔ وہ مختلف مسالک اور فقہی مکاتب سے بلند ہو کر سوچتے ہیں۔ فرقہ واریت سے انہیں کوئی لگاؤ نہیں۔ وہ دین کی روح پا جاں نثار ہیں۔ اصل کے بجائے فروع کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں ان کا ظاہر و باطن ایک ہے۔ وہ مصلحت کوشی سے کام نہیں لیتے۔ کھری اور حق بات کہنا ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ سید محمد قاسم تمام ہی حق گو علما اور صلحا سے متاثر ہیں۔ حنفی العقیدہ ہیں۔ میانہ روی ان کا جادہ زندگی ہے۔ وہ مولانا احمد رضا خان، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اور حسن النباء سے متاثر نظر آتے ہیں اور انہیں تینوں کی تصانیف و تالیفات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ متشدد و مذہبی شخص مطلق نہیں ہیں۔ خدا نے ان کو حلم و تدبر کی روشنی عطا فرمائی ہے انہوں نے دارالعلوم امجدیہ میں دورۂ احادیث سے خود کو فیضیاب کیا ہے ان کی زندگی علماء اور مشائخ کے سائے میں گزری ہے جس نے ان کو پاک باطن بنا دیا ہے۔ یہ تو ان کی ذاتی زندگی کا کچھ احوال تھا جو میں نے اس لیے بیان کر دیا ہے تاکہ ان کی حقیقی شخصیت سامنے آجائے۔

سید محمد قاسم سرد و گرم زمانہ چشیدہ انسان ہیں انہوں نے زندگی حساس اور بیدار دماغ انسان کی صورت میں گزاری ہے۔ وہ حالات زمانہ اور تجربات کی آگ میں تپے ہوئے شخص ہیں۔ علمی ادبی، دینی مشاغل کے ساتھ رزق حلال، پر زندگی گزاری ہے۔ اسٹیل ملز میں ملازم تھے اب ریٹائرڈ ہیں۔ ان کے سب صاحبزادگان تعلیم یافتہ ہیں اور اعلیٰ مناصب پر فائز ہیں۔ ان کی بنات بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ان کی شریک حیات بھی تفسیر قرآن کا کورس کر چکی ہیں۔ اپنی اولاد کی تربیت دینی ماحول میں فرمائی ہے۔

پچیس مئی سنہ دو ہزار سترہ (۲۰۱۷) کو سٹی کلب کراچی میں ایک تقریب اعتراف کمال و فخر علم و ادب کے طور پر منعقد کی گئی مہمان خصوصی جن کے لیے تقریب کا انعقاد کیا گیا اور ان کی علمی فکری

تصنیفی وتالیفی اور ان کی شاعری جو اپنا ایک خاص اسلوب رکھتی ہے اس پر راقم الحروف (خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی) صدر تقریب ہذا نے ان کی علمی خدمات اور شاعرانہ عظمت پر مقالہ پیش کیا۔ فراست رضوی نے ان کی علمی خدمات پر مقالہ پڑھا۔ شاعر جمالیات ولمسیات رونق حیات نے اظہار فرمایا۔ تقریب کے بعد تصنیف وتالیف اور تذکرہ نگاری کے موضوع پر جناب محمد رئیس علوی سے گفتگو میں سید محمد قاسم صاحب کی تذکرہ نگاری کا ذکر بھی ہوا۔ انہوں نے سید محمد قاسم صاحب کی تذکرہ نگاری کے متعلق بڑی اہم رائے دی کہ "ان کے تذکرے میری نظر سے گزرے ہیں۔ ان میں اجمالی انداز ہے انہوں نے حتی المقدور تحقیق سے کام لیا ہے اور ان کا تبصرہ بھی بعض شعراء پر ناقدوں والا ہے۔ اس اعتبار سے وہ ایک منفرد تذکرہ نگاروں میں شمار ہوں گے۔" یہ تقریب ادبی تنظیم "نیازمندان کراچی" الموسس رونق حیات نے منعقد کی تھی۔ اس کا حوالہ بر سبیل تذکرہ اس لیے کردیا ہے کہ سید محمد قاسم کی تذکرہ نگاری کے متعلق متبحر عالم وفاضل اور شاعر ونقاد جناب رئیس علوی کی رائے سے بھی ناظرین فیضیاب ہوجائیں۔ جب تک کسی کی خوبی اور کمال فن کا اظہار ملک کے صاحبانِ علم وفضل اور نقاد نہیں کرتے خواہ کوئی کتنا ہی صاحب کمال ہو اس کی خوبی صدف میں موتی کی طرح ہوتی ہے۔ اس صدف سے موتی کا نکلنا لازمی ہے۔

جناب محمد قاسم تذکرہ نگاری کے فن میں ایک گوہر بے بہا کا مقام رکھتے ہیں۔ ان کی خوبیوں کو اجاگر کرنا علم وادب کی خدمت کے مترادف ہے۔ کسی کی علمی وادبی خوبیوں کو چھپانا یا اس کی تذکرہ نگاری کی انفرادیت کے متعلق گول مول بات کرنا ادبی وعلمی بد دیانتی ہے۔ میں ایسے ناقدین کے بہت خلاف ہوں جو کسی کی خوبیوں کو سامنے نہیں لاتے۔ قارئین تذکرہ کو اس کی عظمت وانفرادیت سے آگاہ نہیں کرتے۔

ہمارے ملک کے ایک بیدار ذہن محقق ونقاد ڈاکٹر فرمان فتحپوری مرحوم کا بیان نقل کررہا ہوں یہ بیان کراچی کا دبستان نعت میں لکھا تھا:

> "اب اگر ہم تذکروں کے قدیم وجدید ناقدین کی آراء پر بیک وقت نظر ڈالیں اور تذکروں پر کڑی سے کڑی تنقید کو جائز رکھیں تو زیادہ سے زیادہ ان پر حسب ذیل اعتراضات وارد ہوسکتے ہیں:

۱۔ تذکروں میں حالاتِ زندگی عموماً بہت مختصر اور انتخاباتِ کلام اکثر طویل ہیں۔

۲۔ سوانح اور شاعر کے اندازِ سخن گوئی کے سلسلے میں تقریباً سب نے ایک ہی روش اختیار کی ہے۔

۳۔ شاعروں کے حالات میں ان کے سال پیدائش و وفات اور عمر و عہد کا کوئی خاص خیال نہیں رکھا گیا۔

۴۔ ایک شاعر کے اشعار دوسرے شاعر سے یا بعض اشعار کئی کئی شاعروں سے منسوب کر دیئے گئے ہیں۔

۵۔ اکثر تذکروں پر ایک دوسرے کی تقلید کا اثر نمایاں ہے۔ اور تازگی وندرت بہت کم نظر آتی ہے۔

۶۔ شعر کے محاسن میں زیادہ تر صنائع لفظی و معنوی کو اہمیت دی گئی ہے اور حسب ضرورت ان کو ظاہر کیا گیا ہے۔

۷۔ اکثر طرفداری سے کام لیا گیا ہے اور شعر کی تعریف و تنقیص ذاتی تعلقات کی بنا پر کی گئی ہے۔

۸۔ تنقیدی لب ولہجہ پر، جوش اخلاقی انداز غالب ہے اور عموماً سب کو اچھے الفاظ سے یاد کیا گیا ہے۔ زندوں کو درازی عمر کی دعا دی گئی ہے اور متوفین کو مغفرت کی۔

۹۔ اکثر شعرا کے اسلوب و سلیقہ شعر کے لیے مبہم الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن سے شاعر کی حیثیت واضح نہیں ہوتی لیکن ان خامیوں کے باوجود ان تذکروں کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔"

ڈاکٹر فرمان فتحپوری کے خیال میں جو تذکروں پر اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں ان کے اسباب کے ضمن میں پہلے ہی اس مضمون میں کچھ کی وضاحت کر چکا ہوں میں نے تو یہ بھی محسوس کیا ہے کہ اکثر تذکروں میں تحقیق کی اتنی کمی ہے کہ متشاعروں کو جو بحیثیت شاعر مشہور ہو گئے انہیں بھی

صاحب طرز اور عظیم شعراء کی صف میں لکھا گیا ہے اس نقص سے میرے خیال میں کوئی تذکرہ خالی نہیں ہے۔ بہت سے تذکرہ نگاروں نے وہی کلام نقل کر دیا ہے جو ان سے پہلے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے۔ بعد کے تذکرہ نگار نے دوسرا کلام نہیں لکھا اس سے صاف ظاہر ہے تحقیق کے بجائے نقل درنقل کا سلسلہ جاری ہے۔ سید محمد قاسم نے اس نقص کو دور کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری اس مسئلے پر سید محمد قاسم سے بالمشافہ گفتگو ہوئی۔ انہوں نے اس کمی پر زیادہ توجہ دینے کا وعدہ فرمایا ہے اور زیر نظر تذکرے میں موجود کلام جو دوسرے تذکروں میں بھی ہے اسے بدل دیں گے۔ اس کے لیے انہیں دوبارہ لائبریریوں اور اپنے پاس موجود تذکروں کو دیکھنا پڑے گا۔ اگر ایسا ہو جائے تو ان کا زیر نظر تذکرہ اختصاص کا حامل ہو جائے گا۔

سید محمد قاسم نے اپنے جتنے تذکرے تالیف و ترتیب سے گزارے ہیں وہ کوئی چند مشہور تذکروں کے مرہون منت بالکل نہیں انہوں نے سینکڑوں تذکرے مطالعے سے گزارے ہیں جن کا ذکر انہوں نے میرے استفسار پر کیا تھا۔ قدیم تذکروں کو چھوڑ کر جو ماضی قریب میں لکھے ہیں یا زمانہ حال میں مرتب ہوئے ان میں سے یہ ہیں:

۱۔ شعراء و شاعرات پاکستان — از: مہر یلی بھیتی مرحوم

۲۔ شعرستان سوائے پاکستان — از: نعمان تاثیر/مظہر صدیقی

۳۔ دبستانوں کا دبستان۔ (چار جلدیں) — از: احمد حسین صدیقی

۴۔ محفل جو اجڑ گئی/دو ہجرتوں کے اہل قلم۔ اردو کا دینی ادب۔ از: پروفیسر ہارون الرشید

۵۔ دبستان کراچی کے ممتاز شعراء — از: صبا ضیائی/نعیم الحق

۶۔ سفیران سخن (چار جلدیں) — از: شاعر علی شاعر

۷۔ سخنور — از: سلطانہ مہر

۸۔ تذکرہ نعت گو شاعرات — از: ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری

۹۔ کان پور نزدیک سے — از: خواجہ رضی حیدر

۱۰۔ اذان دہر۔ غیر مسلم حمد گو شعراء کا تذکرہ، ننانوے شاعرات کا تذکرہ، اردو حمد کا تذکرہ، گلشن حمد، خوشبوؤں کا سفر، پنجاب کے ممتاز اکیس نعت گو کا تذکرہ، نعت کی بہاریں ۱۰۳ نعت گو کا

تذکرہ، نعت رحمت پانچ سو سے زائد نعت گو کا تذکرہ، حریم ناز میں صدائے اللہ اکبر مرتب و مولف
از شاعر حمد و نعت طاہر سلطانی

۱۱۔ تذکرہ شاعرات پاکستان	از: شفیق بریلوی
۱۲۔ کراچی کا دبستان نعت	از: منظر عارفی
۱۳۔ کراچی میں مدفون شعراء	از: اظہر عباس ہاشمی
۱۴۔ پیمانہ غزل۔	از محمد شمس الحق
۱۵۔ کاروان رفتہ۔	از: ڈاکٹر ایوب قادری
۱۶۔ شہر ادب کانپور۔	از: ڈاکٹر سعید احمد
۱۷۔ تلامذۂ شاد:	از: سید نعمت اللہ مرحوم
۱۸۔ تذکرہ شعرائے میرٹھ	از: نور احمد میرٹھی مرحوم
۱۹۔ تذکرہ عثمانین	از: شاہ بلیغ الدین
۲۰۔ سخنوران کاکوری	از: حکیم نثار احمد علوی
۲۱۔ بہار دانش	از: قیصر سلیم
۲۲۔ تذکرہ شعرائے امروہہ	از: نقوش نقوی
۲۳۔ تذکرہ مسلم شعراء بہار چھ جلدیں	از: حکیم احمد اللہ ندوی
۲۴۔ تذکرہ شعرائے بدایوں دو جلدیں	از: شہید حسین شہید بدایونی
۲۵۔ سخنوران شہر دو جلدیں	از: محمد علی سوز
۲۶۔ تذکرہ ناموران سہوان	از: ہاشمی سہوانی اور وزیر الحسن زبیری
۲۷۔ تاریخ شعرائے روہیلکھنڈ پانچ جلدیں	از: شایان بریلوی، تعظیم نقوی
۲۸۔ عظمت رفتہ	از: ضیاالدین برنی
۲۹۔ نکہت اردو	از: پروفیسر درخشاں کاشف
۳۰۔ تذکرہ صوفیائے سندھ	از: اعجاز الحق قدوسی
۳۱۔ محراب معانی (شعرائے پیلی بھیت)	از: آفاق جعفری

۳۲۔ انتخاب شعرائے بدنام　　　　از: جلیل قدوائی

۳۳۔ اردو کے اُمی شعراء　　　　از: عزیز الکلام شاہ

۳۴۔ نعت ریسرچ سینٹر کراچی کی مرتب کردہ کتب جو سید صبیح الدین صبیح رحمانی کی نگرانی میں اشاعت پذیر ہوئیں ان سے بھی تذکرہ نگاری میں مدد ملتی ہے۔ بڑی تحقیقی کتابیں ہیں۔

۳۵۔ عالمی رنگ ادب کراچی کتابی سلسلہ میں شعراء کا تعارف

مضامین نیز انتقادی مقالات　　　　از: خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی

۳۶۔ اعتراف فن (انتقادی طویل مقالہ)　　　　از: خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی

۳۷۔ انتقادی آئینے (دو جلدیں بشکل خطوط)　　　　از: خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی

۳۸۔ بقیات مقالات شعرائے حمد و نعت مخطوط　　از: خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی

مندرجہ بالا تذکرے یا تذکرہ نما کتب سے جناب سید محمد قاسم نے بھی کچھ استفادہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں "میں نے جن کتابوں سے کسی شاعر کے بارے میں استفادہ کیا ہے وہ انتقادی تناظر میں کیا ہے۔ اگر کسی کے متعلق کئی تذکروں میں ذکر ہے اور ان میں کوئی تضاد پایا ہے تو اپنی صوابدید کی روشنی میں لکھا ہے۔ اس کے باوجود میرے تذکروں میں کوئی بات تاریخی تناظر میں سند پر پوری نہ اترتی ہو تو مجھے اس کی نشاندہی کرادی جائے تاکہ آئندہ کسی ایڈیشن میں اس جھول کو ختم کیا جاسکے۔" سید محمد قاسم نے کہیں بھی تعلّی سے کام نہیں لیا ہے وہ سہو کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں اس سے بہت کم لوگ بچتے ہیں۔ راقم الحروف کے انتقادی نتیجے میں موصوف ایک معتبر تذکرہ نگار ہیں۔ ان کے تذکروں میں خاصی توانائی بیان اور تحقیق کے امور کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ وہ عہد حاضر کے ذہین اور وسیع المطالعہ تذکرہ نگاروں میں گنے جاتے ہیں۔ تاریخ تذکرہ نگاری میں ان کا نام بھی جلی حروف میں لکھا جائے گا۔ ان کی تذکرہ نگاری کا دشوار کام اپنے آپ کو منوانے کی پوری توانائی سے متصف ہے۔ میری دعا ہے کہ جناب سید محمد قاسم کو ربّ کائنات مزید ہمت عطا فرمائے اور قوت تحقیق میں توانائی عطا فرمائے۔ آمین

◆◆◆

پیش لفظ

سفر جاری ہے

سیّد محمد قاسم

"پاکستان میں غزل کے نعت گو شعراء" کی تدوین کے مرحلے پر چند اہم محرکات میرے سامنے آئے ہیں ان میں تین مقالوں نے میری توجہ حاصل کی ہے جس میں ڈاکٹر عزیز احسن کا مقالہ "پاکستان میں اردو نعت کا ادبی سفر"، ڈاکٹر نثار ترابی کا مقالہ "جدید اردو غزل میں نعتیہ تخلیقی رویے کا وفور" اور عارف منصور مرحوم کا لکھا ہوا مقالہ "اردو نعت پر غزل کے اثرات" شامل ہیں۔

تذکرہ نویسی ادبی خدمات انجام دینے والوں کے لیے ایک نعمت ہے اور آئندہ کے مصنفین اور مؤلفین کو لکھنے کے لیے مواد فراہم کرتی ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے اور شعراء وادبا ماضی کا حصہ بنتے جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ ان کا وجود ہی معدوم ہو جاتا ہے تو پھر تذکرہ نویسی ہی ایک ایسی صنف ادب ٹھہرتی ہے جس سے ادباء و شعرا ادبی تاریخ میں محفوظ و زندہ ہو جاتے ہیں۔

تذکرہ ایک دینی وتہذیبی خدمت بھی ہے مذہبی اعتبار سے اس کی بڑی اہمیت ہے حقوق العباد اور احادیث کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مرنے والوں کے محاسن کو بیان کیا جائے اور جب کسی فرد کے محاسن بیان کیے جاتے ہیں تو لوگوں کے دلوں میں اس فرد کے لیے اچھے جذبات ابھرتے ہیں اور دوسروں کے لیے بھی محاسن لکھنے کی ترغیب ملتی ہے۔

مجھے خود اپنی ذات پر حیرت ہوتی ہے کہ میں طلسماتی اثر کے تحت ہوں اور کون جانتا ہے کہ ان شعراء میں ایسے افراد بھی ہوں گے جن کا تعلق اللہ کے ساتھ بہت ہی مضبوط ہو اور رسول اللہ ﷺ کی محبت وعقیدت ان کے رگ وجاں میں پیوست ہو۔ بھلا ایسے لوگوں کا تذکرہ کیوں نہ لکھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ خاکسار مستقل بنیادوں پر تذکرہ نویسی کا وارفتہ واسیر ہو کر رہ گیا ہے

۔الحمدللہ پاکستان کے نعت گوشعراء کی تین جلدوں میں 500 شعراء شامل تھے۔اب اس کا نیا ایڈیشن برادرم شاعرعلی شاعر اپنے ادارہ سے شائع کررہے ہیں جس میں 600 شعراشامل ہیں۔ خاک میں پنہاں صورتیں میں 580 شعراء کرام کا تذکرہ شامل اشاعت ہے جو کراچی کے مرحومین شعراء سے تعلق رکھتا ہے۔اللہ نے مجھ پر یہ کرم کیا کہ میں نے اس کی توفیق وعطا سے علامہ ابن سیرینؒ پر''آثار امام ابن سیرینؒ'' پیش کرنے کی سعادت وسرخوشی حاصل کی۔علاوہ ازیں آپ کے ہاتھوں میں جو کتاب''پاکستان میں غزل کے نعت گوشعراء'' ہے اس میں کم وبیش 160 شعراء کا تذکرہ پیش کیا گیا ہے۔''پاکستان میں غزل کے نعت گوشعراء'' جلد دوم پر بھی کام جاری ہے۔

قارئین کرام!اردوادب میں خیال کی وادی میں مست خرام رہنے والے شعراء حضرات کے فکری اُپج اور بلند پروازی ان کی غزلوں میں دیکھی اور محسوس کی جاسکتی ہے کہ انہوں نے ان گنت مسائل پر شعری اسلوب میں برجستگی کے ساتھ سیاسی،سماجی،اقتصادی،مذہبی رواداری اور ملکی انتشار کے تناظر میں اظہار خیال کیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں پاکستان میں غزل کے نعت گوشعراء کے تذکرے کو دوام بخشنے کی کوشش کی گئی ہے اس موقع پر اس امر کی صراحت بھی مناسب محسوس ہوتی ہے کہ یہ تذکرہ بنیادی طور پر پاکستان کے نعت گوشعراء سے ہی منسلک وماخوذ ہے۔علاوہ ازیں کچھ نئے شعراء بھی شامل تذکرہ ہوگئے ہیں اور اس عنصر کو نمایاں محسوس کیا جائے گا کہ ان نعت گوشعراء نے غزل کے میدان میں بھی اپنا جوفنی سفر طے کیا ہے اس کی حتی المقدور جھلک اس کتاب میں پیش کی گئی ہے۔اب اس مرحلے پر قارئین کرام کا یہ فرضِ منصبی بنتا ہے کہ وہ خود دیکھیں کہ ان شعرائے کرام نے غزل اور نعت کے لطیف مزاج اور مقام سے کس قدر آشنائی کا مظاہرہ کیا ہے۔

جب شعراء وادیٔ خیال سے نکل کر بابِ عقیدت کی شاہراہ پر آتے ہیں تو ان میں جوش کے بجائے ہوش غالب آجاتا ہے اور اظہارِ خیال کے لیے وہ الفاظ کے چناؤ میں منہمک ہوجاتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کے درمیان ایک حدِ فاصل رکھ کر وہ اپنا تخلیقی سفر جاری رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔اور یہی ہمارا تقاضۂ ایمان بھی ہے۔

اللہ رب العزت کا احسان ہے کہ ہمارے درمیان جو ادبی حلقہ ہے اس نے اپنی خدمات ہمیں اس طرح سے پیش کیں کہ ہم ان کے طرزِ عمل سے ممنونِ احسان ہوئے اور غزلوں کی فراہمی کے سلسلے میں ان تمام دوستوں اور کرمفرماؤں نے ہر ممکن تعاون کیا۔ خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی، شاکر کنڈان (سرگودھا)، جاوید انور ہاشمی، پروفیسر ہارون الرشید، ڈاکٹر شوکت اللہ جوہر، یوسف ورگ (لاہور)، شبیر احمد انصاری، شاعر علی شاعر، محمد احمد، حامد علی سید، یوسف زاہی چاٹگامی، نجیب عمر اور زاہد رشید۔ یہ وہ حضرات ہیں جو میرے دل میں ہمیشہ رہتے ہیں اور میں ان حضرات کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں کہ انہوں نے ہر قدم پر میری ہمت افزائی کی اور اپنے ہر ممکن سے تعاون سے نوازا۔

ناسپاس گزاری ہوگی اگر میں اپنے اہلِ خانہ کے تمام اراکین خورد و کلاں کا شکریہ ادا نہ کروں کیونکہ ان سب کی معنوی اعانت کے بغیر میں اپنے کام کی اصل تکمیل نہیں کرسکتا تھا اور اس امر کا اظہار بھی برملا کرنا چاہتا ہوں کہ میری بیٹی ثنا عاطف نے اس کارِ تحسیل میں مالی معاونت کرکے اپنی خوشی کا اظہار کیا اور میری دعائیں لیں۔ اللہ ربّ العزت ان کے صاحبزادگان صارم حسن اور باسم حسن کو زندگی کے تمام میدانوں میں بلند اقبال فرمائے۔ (آمین)

غزل

ہر ستم کی انتہا کر دی گئی
دل سے دھڑکن بھی جدا کر دی گئی

زندگی یوں تو عطا کر دی گئی
لاش تھی لیکن سجا کر دی گئی

اپنی صورت سے بھی ہوں نا آشنا
میری دنیا کیا سے کیا کر دی گئی

تیرے دیوانوں پہ تیرے شہر میں
زندگی جرم و سزا کر دی گئی

منزلِ امید تھی اتنی کٹھن
جراتِ دل نقشِ پا کر دی گئی

آرزو لکھنوی

(۱۸۷۳ء......۱۹۵۱ء)

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی ولادت سے تین ساڑھے تین سال قبل اودھ کے دارالخلافہ لکھنؤ میں سید انور حسین آرزو لکھنوی پیدا ہو چکے تھے۔ آپ کے والد میر ذاکر حسین بھی شاعر تھے۔ یاس تخلص اختیار کیا تھا۔ تاہم ان کا کلام دستبردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔ قیامِ پاکستان کے بعد آرزو لکھنوی کراچی آئے اور شعر و ادب کی میراث کو نہ صرف سنبھالا بلکہ پروان چڑھاتے ہوئے چار غزلیہ، ایک نعتیہ، نظموں کا ایک مجموعہ، اور ایک مثنوی کے علاوہ نثر میں ''نظامِ اردو'' (لسانیات) اور ''میزان الحرف خاص'' دو تصانیف بھی شائع کرائیں۔

''ارمغانِ آرزو''، ''دہانِ آرزو''، ''شانِ آرزو'' اور ''زبانِ آرزو'' کے ساتھ ہی ''سریلی بانسری'' کو بھی عرصہ دراز تک بطور سند زبان یاد کیا اور برتا گیا۔ ریڈیو پاکستان میں اصلاحِ تلفظ کے لیے بہزاد لکھنوی کے علاوہ آپ سے بھی کچھ مدت تک استفادہ کیا گیا۔

۱۸ رذی الحجہ ۱۲۸۹ھ بمطابق ۱۷ رفروری ۱۸۷۳ء کو دنیا میں آنے والے سید انور حسین آرزو لکھنوی ۹ ررجب المرجب ۱۳۷۰ھ بمطابق ۱۶ راپریل ۱۹۵۱ء کو کراچی میں دارِ فانی سے رخصت ہوئے۔ علی باغ میوہ شاہ میں ان کی آخری آرام گاہ ہے۔

نعت

وہی اِک شکل کہ اِس آئینہ خانے میں نہیں
خود نما کون ہے پھر حُسن اگر ہے خود بیں

ہے کہیں جلوۂ صد رنگ میں گم وحدتِ ذات
کہیں ہر رنگ میں یکتائی و حسن و تزئیں

چلتی پھرتی ہوئی پرچھائیاں سی چاروں طرف
پر کہیں پیشِ نظر پھر نہ مکاں ہے نہ مکیں

مصحفِ روئے پیمبر کی تلاوت میں ہے محو
مٹھیاں باندھے ہوئے رازِ مشیت کا امیں

ہاں اِک ایسی بھی جگہ ہے کہ جو ہے مرکزِ شوق
اور پھر جیسا مکاں ویسے ہی رُتبے کا مکیں

آرزو! جوشِ ولا توڑتا ہے قفلِ زباں
عجز کہتا ہے کہ بس بس اِسے رہنے دو یونہیں

غزل

بھولے بن کر نہ پوچھو بہتے ہیں اشک تو بہنے دو
جس سے بڑھے بے چینی دل کی ایسی تسلی رہنے دے

رسمیں اس اندھیر نگر کی نئی نہیں یہ پرانی ہیں
مہر پہ ڈالو رات کا پردہ ماہ کو روشن رہنے دو

روح نکل کر باغ جہاں سے باغ جناں میں جا پہنچے
چہرے پہ اپنے میری نگاہیں اتنی دیر تو رہنے دو

خندہ گل بلبل میں ہوگا گل میں نغمہ بلبل کا
قصہ ایک، زبانیں دو ہیں آپ کہو یا رہنے دو

اپنا جنونِ شوق دیا کیوں تمہیں رسوائی کا
بات کرو خود قابلِ شکوہ الٹے مجھی کو رہنے دو

پروفیسر آفاق صدیقی

(۱۹۲۸ء.......۲۰۱۲ء)

چالیس سے زائد تصانیف و تالیف و تراجم اور تحقیقی کتب کے ساتھ تازہ کار شاعر پروفیسر آفاق صدیقی ۴/مئی ۱۹۲۸ء کو موضع شیخ پور ضلع فرخ آباد بھارت میں پیدا ہوئے، پاکستان بننے کے بعد اکتوبر ۱۹۴۷ء میں کراچی آئے، کچھ عرصہ بعد سکھر گئے تو وہیں کے ہو رہے، سکھر میں ہی درس و تدریس کا آغاز کیا، ۱۹۷۴ء تک سکھر میں مقیم رہے، پروگیسیو ڈگری کالج کراچی میں شعبۂ اردو کے صدر رہے، اردو سندھی ادب و زبان کی معتبر شخصیت پروفیسر آفاق صدیقی ۶۳ سے زائد ایوارڈز حاصل کر چکے ہیں، خلیل [illegible] ان کے سہ ماہی بیلاگ کراچی نے اپریل تا جون ۲۰۰۹ء کی اشاعت میں پروفیسر آفاق صدیقی پر خصوصی گوشہ شائع کیا جو صفحہ ۹۰ تا ۱۵۶ تک پھیلا ہوا ہے، جس کو راقم سطر سطر پڑھنے کے بعد بھی پروفیسر آفاق صدیقی کی شخصیت کے حوالے سے ایسی تفصیل تک نہیں پہنچ سکا جسے مبسوط کہا جائے۔

ان کی شعری تصانیف میں "پاکستان ہمارا ہے" (ملی نغمے) "کوثر و تسنیم" (حمد و نعت و منقبت) ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی اب ناپید ہے، "قلب سراپا" (پہلا شعری مجموعہ) "بڑھائے جا قدم ابھی"، "ریزہ جاں" (شعری مجموعہ دوم) "نثر لطیف" (گیتوں کا مجموعہ) ہیں۔

نثری تصانیف میں ''تاثرات'' (تنقیدی مضامین) ''عکسِ لطیف'' (تحقیق شاہ لطیف) ''شاعرِ حق نوا'' (سچل سرمست کی شاعری اور شخصیت) ''پیامِ لطیف'' (شاہ لطیف کا پیام وکلام) ''احوالِ سچل'' (انتخاب کلام سچل سائیں) ''صبح کرنا شام کا'' (خود نوشت) ''میسرۃ البشر'' (تہذیب کا سفر باردوم) ''شخصیت ساز'' (مضامین) ''ادب جھروکے'' (مضامین) ''کون اختر حامد خان'' شامل ہیں۔

پروفیسر آفاق صدیقی کی مطبوعہ تالیفات میں ''بوئے گل ونالۂ دل'' (شیخ ایاز کا اُردو کلام) ''بابائے اردو وادیٔ مہران میں'' اور ''ریگزار کے موتی'' (شمالی سندھ کے شعراء) سرفہرست ہیں، جب کہ تراجم میں ''شاہ جو رسالو کا منظوم ترجمہ'' ''جدید سندھی ادب'' (تراجم نظم ونثر) ''سندھی ادب کے اُردو تراجم'' (تحقیق) ''شاہ لطیف اور عصر حاضر'' (تحقیق) ''ادب زاویے'' (مضامین) ''تصانیف کے آئینے میں'' (جائزے) ''ڈاکٹر محسن کی شخصیت اور تصانیف''، ''سندھی کہانیاں (سندھی افسانوں کا ترجمہ) ہیں۔

''ارمغانِ عقیدت'' ان کی وہ کتاب ہے، جس میں ان کی حمدیں، نعتیں اور کچھ مناقب کے ساتھ نثر کے اُن آٹھ خطبات کو بھی شاملِ اشاعت کیا گیا ہے جو انہوں نے سیرت نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے موضوع پر مختلف اوقات میں مختلف جگہوں پر بیان کئے۔

نعت

انگاروں کو پھول بنایا کملی والے آقاؐ نے
شعلوں میں گلزار کھلایا کملی والے آقاؐ نے

اِک دوجے کے خون کے پیاسے دشمن کی آنکھوں میں
پیار بھرا سنسار بسایا کملی والے آقاؐ نے

چھٹ گئے سارے گھور اندھیرے رات ہوئی دن جیسی اُجلی
کتنا سندر دیپ جلایا کملی والے آقاؐ نے

بھولے بھٹکے ٹھوکریں کھاتے کتنے سرکش گمراہوں کو
سیدھی سچی راہ چلایا کملی والے آقاؐ نے

طائف کی گلیوں سے پوچھو کن زخموں کا مرہم تھا
حرفِ دُعا جو لب پہ سجایا کملی والے آقاؐ نے

کیا تاثیر تھی اُس لہجے میں جس کے میٹھے بولوں سے
ہر پتھر کو موم بنایا کملی والے آقاؐ نے

کیسے بھلا آفاقؔ میں اُس کو لفظ و بیان سے نسبت دوں
جو رُتبہ اللہ سے پایا کملی والے آقاؐ نے

غزل

کیا زمیں کیا آسماں کچھ بھی نہیں
ہم نہ ہوں تو یہ جہاں کچھ بھی نہیں

دیدہ و دل کی رفاقت کے بغیر
فصلِ گل ہو یا خزاں کچھ بھی نہیں

پتھروں میں ہم بھی پتھر ہو گئے
اب غمِ سود و زیاں کچھ بھی نہیں

کیا قیامت ہے کہ اپنے دیس میں
اعتبارِ جسم و جاں کچھ بھی نہیں

کیسے کیسے سر کشیدہ لوگ تھے
جن کا اب نام و نشاں کچھ بھی نہیں

ایک احساسِ محبت کے سوا
حاصلِ عمرِ رواں کچھ بھی نہیں

کوئی موضوعِ سخن ہی جب نہ ہو
صرف اندازِ بیاں کچھ بھی نہیں

ابواللیث قریشی

(۱۹۳۲ء-۲۰۱۱ء)

ابواللیث قریشی ۶ مئی ۱۹۳۲ء کو غازی پور (ہندوستان) کے ایک گاؤں موضع بھوجاپور میں پیدا ہوئے تھے، اُن کا آبائی وطن اعظم گڑھ ہے۔ اُن کی تعلیم بی اے ہے، نیشنل بینک آف پاکستان میں ملازم رہے۔ اُنھوں نے شعر گوئی کا آغاز ۱۹۴۹ء سے کیا تھا۔ شاعری کے ساتھ ہی نثری مضامین بھی لکھتے رہے ہیں۔ تیس برس کی مشق کے بعد پہلا مجموعہ "لمسِ گریزاں" منظرِ عام پر آیا۔

اپنے بارے میں وہ کہتے ہیں: "عالمِ دین کا بیٹا ہوں مگر آپ اس کو کیا کہیں گے میں بینک میں بھی ملازمت کر کے روٹی کھاتا رہا اور شاعری بھی کرتا رہا۔ ملازمت اُفتادِ وقت ہے، اور شاعری شوق یا اُفتادِ طبع کہہ لیجیے، مجھے بہ یک وقت دونوں سے بہ حسن وخوبی نباہ کرنے کا سلیقہ ملا مگر اس فرق کے ساتھ، ایک جبر واکراہ کے ساتھ اور دوسرے سے بہ رضا ورغبت۔"

ابواللیث کا پہلا مجموعہ "لمسِ گریزاں" ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔ غالب کے فکری اُسلوب سے قربت کا احساس اُن کے اس مجموعے کو پڑھ کر ہوتا ہے، اور جو ادبی حلقوں میں خاصا مقبول ہوا، اس کے بعد اُن کی شاعری کا ایک اور مجموعہ "عکسِ لرزاں" کراچی سے ہی ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا، جب کہ اُن کا نعتیہ مجموعہ "تاباں تاباں" بھی کراچی سے شائع ہوا، جس میں عبد اور معبود

کے درمیان ایک حدِ فاصل شعوری طور پر موجود ہے، اور یہی امتیاز اُنہیں عہدِ حاضر کے نعت گو شعراء پر فوقیت دلاتا ہے۔ اِس قدر محتاط اور باشعور نعت نگار ہونے کے ساتھ ہی اُن کا کہنا یہ بھی ہے: "میرے مشاہدے میں اکثر یہ بات آئی ہے بعض نعت گو حضرات غلو، اغراق اور مبالغے سے اس قدر کام لیتے ہیں کہ مدحتِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) میں اللہ جل جلالہٗ کے اوصاف بھی شامل کر دیتے ہیں۔"

ابواللیث قریشی قرآن واحادیث پر ایمان رکھتے ہیں اور انہوں نے محبوبِ خدا، پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے اِس کا وعدہ بھی کر رکھا ہے، اِس کا اظہار وہ اپنی نعتیہ شاعری میں برملا کرتے ہیں۔ حال ہی میں موصوف کی خودنوشت (سوانح) "طوقِ حیات" کے نام سے آئی ہے، یہ سوانح عمری پڑھنے کی چیز ہے۔ اِس میں اُنہوں نے اپنے عہد کی تاریخ رقم کر دی ہے۔ "برسبیلِ غالب" کے نام سے غالب کی زمینوں میں مجموعۂ کلام بھی شائع ہوا ہے۔ "تاباں تاباں" کی شاعری پڑھنے کے بعد ایک اچھے نعت نگار کا تاثر اُبھرتا ہے اور اُن نعتوں کو پڑھنے کے بعد دل میں گداز کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

نعت

دربارِ رسالتؐ میں رسائی کی تمنا
یوں لگتا ہے جیسے ہو خدائی کی تمنا

سو جان شہِ کون و مکاںؐ تجھ پہ فدا ہو
کچھ اور نہیں تیرےؐ فدائی کی تمنا

دیکھا ہی نہیں خواب کبھی تختِ شہی کا
دل میں ہے ترےؐ در پہ گدائی کی تمنا

اے شمعِ حرم سوزِ پُر انوار عطا ہو
پروانے کو ہے شعلہ نوائی کی تمنا

یا شاہِ اُمم آپؐ کے دربارِ کرم میں
کب سے ہے مجھے نغمہ سرائی کی تمنا

دل میں ہے بہت گردِ کدورت سے اندھیرا
یہ آئنہ رکھتا ہے صفائی کی تمنا

غزل

بارہا یورشِ افکار نے سونے نہ دیا
فکر آزار ہے آزار نے سونے نہ دیا

بند تھیں دائرۂ خواب میں آنکھیں اپنی
فکر کی گردشِ پرکار نے سونے نہ دیا

تھی تصور میں نہاں خانۂ دل کی تصویر
رات بھر دیدۂ بیدار نے سونے نہ دیا

مجھ پہ اس طرح سے روشن تھی حقیقت اپنی
عمر بھر چشمِ خبر دار نے سونے نہ دیا

میں نے کچھ دھوپ میں جلتے ہوئے چہرے دیکھے
پھر مجھے سایۂ دیوار نے سونے نہ دیا

رات بھر بارشِ الہام رہی ہے دل پر
صبح تک ابرِ گہر بار نے سونے نہ دیا

لیثؔ موضوعِ سخن فکرِ بشر تھی، ہم تھے
اور پھر گرمیٔ گفتار نے سونے نہ دیا

اثر صہبائی

(۱۹۱۸.....۱۹۶۴ء)

خواجہ عبدالسمیع پال جو اثر صہبائی کے نام سے متعارف ہیں۔ ۱۸ر دسمبر ۱۹۰۱ء کو مولانا احمد دین پال کے گھر پیدا ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں اسلامیہ کالج، لاہور میں داخلہ لیا۔ اُنہوں نے فلسفہ میں ایم اے کیا اور ایل ایل بی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ وہ ایک قانون دان کی حیثیت سے پیشہ ورانہ خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ کو داتا گنج بخشؒ سے خصوصی عقیدت تھی اور آپؒ کے مرقد پر اکثر و بیشتر حاضر ہوا کرتے تھے۔

۶ر فروری ۱۹۵۸ء کو آپ مری کے سیسل ہوٹل میں مقیم تھے کہ آپ کو سرکار مدینہ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) کی زیارت خواب میں ہوئی اور اسی تاریخ سے آپ نعتیں کہنے لگے۔ "بحضورِ سرورِ کائنات (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم)" آپ کا نعتیہ مجموعہ ہے جو ایک صاحبِ نظر اور قادر الکلام شاعر کا ہدیۂ عقیدت ہے۔ ۱۹۶۴ء میں یہ مداحِ رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ لاہور میں مدفون ہیں۔

نعت

دو عالم میں ہے احترامِ محمدؐ
بلند آسماں سے مقامِ محمدؐ

ہر اک بام سے ہے پرے نخلِ طوبیٰ
پرے نخلِ طوبیٰ سے بامِ محمدؐ

نثار ان پہ تسنیم و کوثر کی موجیں
رواں جن لبوں پہ ہے نامِ محمدؐ

ہمیں واسطہ کیا مسیحؑ و خضرؑ سے
ہمارے مقدر میں جامِ محمدؐ

فلک جھک رہا ہے برے آستاں پر
آثر میں بھی ہوں اک غلامِ محمدؐ

غزل

مری ہر سانس کو سب نغمۂ محفل سمجھتے ہیں
مگر اہلِ دل آوازِ شکستِ دل سمجھتے ہیں

گماں کاشانۂ رنگیں کا ہے جس پر نگاہوں کو
اے اہلِ نظر گردِ رہِ منزل سمجھتے ہیں

الٰہی کشتیٔ دل بہہ رہی ہے کس سمندر میں
نکل آتی ہیں موجیں ہم جسے ساحل سمجھتے ہیں

طرب انگیز ہیں رنگینیاں فصلِ بہاری کی
مگر بلبل انہیں خونِ رگِ بسمل سمجھتے ہیں

پگھل کر دل لہو ہو ہو کے بہہ جاتا ہے آنکھوں سے
ستم ہے شمع کو جو زینتِ محفل سمجھتے ہیں

کہاں ہوگا ٹھکانہ برق رفتاری کی وحشت کا
کہ وہ منزل کو بھی سنگِ رہِ منزل سمجھتے ہیں

بگولے اڑ رہے ہیں جو ہمارے دشتِ وحشت میں
انہیں کو اے اثر ہم پردۂ محمل سمجھتے ہیں

احسان دانش

(۱۹۸۲.....۱۹۱۵)

سرزمین کاندھلہ (یوپی) گہوارۂ علم وادب اور علماء وفضلاء کا مسکن رہا ہے۔ اسی مٹی سے احسان بن دانش کا خمیر اُٹھا اور وہ غالباً ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوئے۔ وہ شاعرِ انقلاب، شاعرِ عوام اور شاعرِ مزدور کے القاب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ احسان ایک عہد ساز شخصیت کا نام ہے جس نے جہدِ مسلسل سے اپنی دنیا آپ بنائی۔

احسان بن دانش ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۸ء تک اُردو شاعر کی حیثیت سے پُورے برصغیر میں مشہور ہو چکے تھے۔ احسان نے ہر زمانے میں اپنی مثال آپ قائم کی۔ وہ کسی سے مرعوب ہونے والے انسان نہ تھے۔ ''جہانِ دانش'' ایک ایسے فرد کی خود نوشت ہے جو سچائیوں اور فروغ علم کے لیے تمام عمر کوشاں رہا۔ نثر و نظم میں اُنہوں نے متعدد کتابیں لکھیں۔

احسان دانش کی نعتیہ شاعری میں ایک نیا انداز نمایاں نظر آتا ہے۔ نبی کریم (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) سے محبت وعقیدت کی ایسی کیفیت اُن کی نعتوں میں موجود ہے جو سرشاری کی لہر رگ و پے میں دوڑا دیتی ہے۔ ''دارین'' آپ کی نعتوں کا مجموعہ ہے۔ ایک صاحب طرز نعت گو

سے وطن ۱۹۸۲ء میں محروم ہو گیا۔ آپ کی آخری آرام گاہ لاہور میں ہے:

ڈاکٹر عاصی کرنالی ''اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر'' صفحہ ۳۹۵ پر رقم طراز ہیں:

''احسان دانش شاعر فطرت بھی کہلاتے ہیں، شاعر مزدور بھی، فطرت سے ان کا رابطہ خدا شناسی اور معرفت الٰہی کا وسیلہ بنا اور شاعر مزدور ہونے کے ناطے ان میں فکر کا وہ رخ پیدا ہوا جس کا مقصد پسماندہ طبقوں کی زندگی میں انقلاب لانا اور معاشرے میں عدل و مساوات کا نظام پیدا کرنا ہے ظاہر ہے کہ ایسا شخص جس کی فکر میں خود انقلاب آفرینی ہو وہ اپنی شاعری اور خصوصاً نظم گوئی کی صورت میں اس ذات گرامی ہی کے پیغام کو عام کرتا ہے جو پیغمبر عمل و انقلاب بن کر دنیا میں آیا اور جس نے کائنات بشری کو عدل و اخلاق کے جوہر سے آراستہ کیا۔ طبع کی یہی سلامتی احسان دانش کو حمدِ الٰہی اور ثنائے مصطفیؐ کی جانب مائل کرنے کا فطری سبب بنی۔''

نعت

بتوں سے پھر گیا دل اب اُدھر دیکھا نہیں جاتا
درِ مولیٰ پہ ہوں اور سُوئے در دیکھا نہیں جاتا

رُخِ خیرالبشرؐ تو پھر رُخِ خیرالبشرؐ ٹھہرا
اِن آنکھوں سے درِ خیرالبشرؐ دیکھا نہیں جاتا

اِسی کوچے پہ بیٹھا ہوں یہیں سے مر کے اُٹھوں گا
گدا بے شک ہوں لیکن اور دَر دیکھا نہیں جاتا

دکھا بھی دے عطا کی ہے نظر جس کے لیے مجھ کو
اُٹھا بھی دے حجاباتِ نظر، دیکھا نہیں جاتا

مسلسل ہو رہی ہے جانے کیوں اُمت کی رسوائی
دعاؤں میں یہ افلاسِ اثر دیکھا نہیں جاتا

کھڑا ہوں کب سے محرابِ حرم کے سامنے واثق
نظر رہ رہ کے اُٹھتی ہے مگر دیکھا نہیں جاتا

غزل

وہ شوخ جو مجھ پہ مہرباں ہے
اب میرا حریف اک جہاں ہے

بھٹکے ہوئے رہرووں کی خاطر
آوازِ جرس رواں دواں ہے

کیا خضر کی جستجو سے حاصل
رہبر تو غبارِ کارواں ہے

تاروں میں یہ گفتگو تھی کل رات
انسان بلا کا سخت جاں ہے

ہے عشق و ہوس میں فرق لیکن
درکار ذرا سا امتحاں ہے

اک جست کا مرحلہ ہے دوری
دیوارِ حیات درمیاں ہے

مجھ سے بھی زیادہ خستۂ غم
دانش مرے غم کا رازداں ہے

احمد خیالؔ

لانڈھی جو مضافاتِ کراچی کا ایک خوبصورت پس منظر رکھنے والا علاقہ رہا ہے۔ یہاں پر بے شمار صاحب طرز غزل گو شعراء مقیم رہے اور پھر رفتہ رفتہ آبادیوں کے پھیلاؤ یا بہتر طرز رہائش کے حصول میں یہاں سے دوسری آبادیوں میں منتقل ہوتے گئے تاہم اس آبادی میں سن 1947ء سے قائم ادبی روایت اب بھی موجود ہے اور شعر و ادب کی فضا برقرار ہے۔

احمد خیالؔ 1959ء میں پیدا ہوئے، ایف۔ اے تک ان کی تعلیم ہے جناب کا ذریعۂ معاش سرکاری ملازمت ہے۔ کراچی ادب و ثقافت کے حوالے سے بلند مقام رکھتا ہے، اس شہر میں شعر و ادب سے تعلق رکھنے والے جونیئر افراد کی بہترین تربیت سینئر شعراء بڑے سلیقے سے کرتے رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ کراچی کی تمام آبادیوں میں شعراء پائے جاتے ہیں اور بزم شعر و ادب کی انگنت تنظیمیں فروغ ادب میں سرگرم عمل ہیں۔

احمد خیالؔ کا نعتیہ مجموعہ ''نفس نفس خوشبو'' منظر عام پر آچکا ہے اور نعتیہ ادب سے تعلق رکھنے والے لوگ اس مجموعے کو پڑھنے میں دلچسپی رکھتے ہیں:

ڈاکٹر عاصی کرنالی اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے ''اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر'' میں صفحہ ۶۲۷ پر رقم طراز ہیں: ''احمد خیال جذب عقیدت اور سوزِ دروں کے ساتھ شعر کہتے ہیں اور فن کی نزاکتیں بھی مدنظر رکھتے ہیں ان کے اشعار میں وہ تاثیر ہے جس کا سرچشمہ ان کی صداقتِ قلبی ہے۔ ان کا دل محبت رسول کی فراوانی سے سرشار ہے اور وہ ہجر کے عالم میں بھی کیفِ حضوری میں رہتے ہیں۔ مدینہ ان کا مرکزِ خیال بھی ہے اور مرکزِ نگاہ بھی۔''

نعت

قریہ قریہ بستی بستی کو بہ کو قلب و نظر
کرتے رہتے ہیں نبیؐ کی جستجو قلب و نظر

کاش ہو جائے زیارت سرورِ کونینؐ کی
مدتوں سے ہیں سراپا آرزو قلب و نظر

ہے یقیں اِن کو کہ آقاؐ خواب میں آجائیں گے
اس لیے رہتے ہیں اکثر با وضو قلب و نظر

جب تصور میں بساتے ہیں مدینے کی بہار
چار سُو پاتے ہیں حُسنِ رنگ و بو قلب و نظر

اُن کے ہی جلووں میں گم ہیں روز و شب صبح و مسا
بس انہیں کو دیکھتے ہیں چار سُو قلب و نظر

رحمتِ عالمؐ کے صدقے میں عجب کیا اے خیالؔ
دونوں عالم میں ہوئے جو سرخ رو قلب و نظر

رنگ لے آیا ہے آخر گریۂ پیہم خیالؔ
دیکھتے ہیں شہرِ بطحا روبرو قلب و نظر

غزل

دلوں میں ان کے گنجائش نہیں ہے
محبت کی جنہیں خواہش نہیں ہے

میں زندہ ہوں اگرچہ زندگی کی
میسر کوئی آسائش نہیں ہے

مرا یہ حوصلہ کہ آنسوؤں کی
مری پلکوں پہ آرائش نہیں ہے

وہ بزمِ اہلِ دل ہے یاد رکھو
جہاں نفرت کی گنجائش نہیں ہے

جہاں تفریق کی باتیں نہیں ہیں
جہاں رتبوں کی پیمائش نہیں ہے

بڑا وہ آدمی ہے جس کے دل میں
کوئی نفرت کی آلائش نہیں ہے

خیالِ یار ہے تازہ غزل ہو
گزارش ہے یہ فرمائش نہیں ہے

احمد ظفرؔ

ظفر علی احمد کی ولادت راول پنڈی (پوٹھوہار) میں ۱۹۲۶ میں ہوئی تعلیم وتربیت کے مدراج انسان اپنی بساط کے مطابق طے کرتا ہے اور جیسی صلاحیت موجود ہوتی ہے ویسے ہی حالات انسان کو اس کی اپنی پسندیدہ منزل تک پہنچا دیا کرتے ہیں، ظفر علی احمد کو ادبی حلقوں میں احمد ظفرؔ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اُردو اور پنجابی کے ممتاز شعراء میں ان کا شمار ہوتا تھا، ریڈیو پاکستان میں بحیثیت پروگرام پروڈیوسر خدمات سرانجام دیتے تھے، پنجابی تصانیف میں 'بیلے بیلے'' (۱۹۶۴ء)'' اکھ دریا وچ سورج بولے'' (۱۹۸۴ء) اور اُردو میں نثری ومنظوم تصانیف درج ذیل ہیں۔ ''حسن خزاں''، ''داستاں داستاں''، ''نذر غالب''، ''مجسے اور دریچے''، ''دل دونیم'' اور ''لازوال''۔

احمد ظفرؔ کو ختمی مرتبت (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے والہانہ عقیدت ومحبت رہی ہے جس کا اظہار انہوں نے ''صفات'' (نعتیہ مجموعہ) میں کردیا ہے یعنی کہا جاسکتا ہے کہ نعتیہ انداز فکر کو اپناتے ہوئے انہوں نے اپنا مدعا بیان کیا ہے۔

دنیا فانی ہے، انسان عشرت کدہ سے نکل کر سفر لافانی پر روانہ ہوجاتا ہے، احمد ظفرؔ جو راولپنڈی میں پیدا ہوئے تھے، گوجرانوالہ کی مٹی انہیں راس آئی اور ۱۶/ اگست ۲۰۰۱ء کو اسی سرزمین میں ابدی نیند سوگئے۔

نعت

خدا کی پہچان آپؐ سے ہے بشر کی پہچان آپؐ سے ہے
طلوعِ مہرِ سحر ہیں آقا سحر کی پہچان آپؐ سے ہے

خدائے برتر مکیں ہے جس کا تو گوشہ گوشہ حسیں ہے جس کا
حضورؐ! کعبہ خدا کا گھر ہے تو گھر کی پہچان آپؐ سے ہے

حضورؐ کی گفتگو کہ اب تک چمن چمن پھول کھل رہے ہیں
شجر کی شادابی شجر کی ثمر کی پہچان آپؐ سے ہے

بشر مقامِ بشر کی آگاہیوں کی منزل تک آ گیا ہے
دلوں میں نورِ یقیں کے روشن نگر کی پہچان آپؐ سے ہے

حضورؐ میری بساط کیا ہے حیات کیا ہے نجات کیا ہے
مگر مرا دل یہ کہہ رہا ہے ظفرؔ کی پہچان آپؐ سے ہے

غزل

یوں زمانے میں مرا جسم بکھر جائے گا
مرے انجام سے ہر پھول نکھر جائے گا

جام خالی ہے صراحی سے لہو بہتا ہے
آج کی رات وہ مہتاب کدھر جائے گا

سیلِ گریہ مری آنکھوں سے یہ کہہ جاتا ہے
بستیاں روئیں تو دریا بھی اتر جائے گا

ہو کوئی ابرِ گہربار سمندر کے لیے
دل کے صحرا سے جو چپ چاپ گزر جائے گا

آج یہ زلف پریشاں ہے زمانے کے لیے
کل یہی دور کسی طور سنور جائے گا

تیری ہر بات پہ مرجاتا ہوں مرتا بھی نہیں
کہ مری موت میں انساں کوئی مر جائے گا

اشک موتی سے بکھر جائیں گے راہوں میں جہاں
سوئے منزل بھی مرا دیدۂ تر جائے گا

نہ مکیں ہوں نہ مکاں شہرِ محبت کا ظفرؔ
دل مسافر نہ کسی غیر کے گھر جائے گا

احمد فاخرؔ

احمد فاخر کراچی کے معروف شعراء میں سے تھے۔ افسوس کہ ان کی تاریخ پیدائش و تاریخ وفات تک کوشش کے باوجود رسائی نہیں ہو سکی تھی مگر جستجوئے مزید کے بعد جناب خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی سے معلوم ہوا کہ ان کی تاریخ ولادت یکم اگست سن انیس چونتیس (۱۹۳۴ء) ہے لیکن تاریخ وفات کے بارے میں بتایا کہ "مجھے یاد پڑتا ہے سنہ انیس سو چورانوے (۱۹۹۴) میں انتقال ہوا تھا۔ انہیں نسیان کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ اسی بیماری میں کچھ عرصے مبتلا رہے اور فوت ہوئے" ان کی کلیات کا مقدمہ جناب خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی نے لکھا ہے۔ ان کی ایک مختصر سی تحریر سے اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ جب وہ ساتویں جماعت میں تھے تو تقسیم ہند کا عمل شروع ہوا جس کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ موقوف ہو گیا، جو دوبارہ ۱۹۵۳ء میں شروع ہوا، ۱۹۵۷ء میں انجمن اسلامیہ ہائی اسکول (مدھیہ پردیش) سے میٹرک پاس کیا، جب سولہ سال کی عمر تھی تو شعر گوئی کی ابتدا کر چکے تھے، اور "آسی" تخلص کرتے تھے، اصلاح سخن کے لئے عبد الشکور دلکش جبل پوری سے شرف تلمذ حاصل کیا (استاد کی طرف سے غزل میں چالیس پچاس اشعار کہہ کر صرف پانچ منتخب اشعار پڑھنے کی اجازت تھی۔

احمد فاخر نے جبل پور میں جلد ہی شہرت حاصل کر لی، والد صاحب محمد منیر آپ کی غزل گوئی کے خلاف تھے۔ ایک بار آپ کی غزلیات کا خاصا ذخیرہ تلف بھی کر دیا لیکن ان سے چھپ چھپا کر

غزل گوئی جاری رکھی، والد کی تلقین تھی کہ:

''اللہ اور اس کے محبوب (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تعریف

کرو تا کہ دین و دنیا میں شہرت اور آخرت میں ثواب حاصل کر سکو۔''

اس ہدایت نے احمد فاخرؔ کی شاعری کا رُخ بدلا۔ ۱۹۶۰ء میں والد صاحب رحلت فرما گئے، ۱۹۶۲ء میں آپ پاکستان آ گئے، اور کراچی میں سکونت اختیار کر لی، معاش کے لئے شعبۂ تعلیم کو اختیار کیا، اور سابقہ تخلص عاصی موقوف کر کے 'احمد فاخرؔ' قلمی نام اختیار کیا، اسی سال حضرت سلطان الصوفیاء شاہ محمد سلطان میاں قادری چشتی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہو کر تعلق مع اللہ کا سلسلہ قائم کر لیا، ۱۹۶۸ء میں جامعہ پنجاب سے اردو میں ایم اے کیا پاکستان کے موقر ادبی جرائد میں احمد فاخرؔ کا کلام شائع ہوتا رہا، بارہ ربیع الاول کی شب تھیوزوفیکل ہال کراچی میں ہونے والے عالی شان نعتیہ مشاعرے میں احمد فاخرؔ اکثر نظامت کی ذمہ داری سنبھالے نظر آتے تھے، ان کا انتقال کراچی میں ہوا۔ احمد فاخرؔ کا نعتیہ مجموعہ ''سبز گنبد نیلا آسمان'' شائع ہو چکا ہے۔ اس سے پہلے ان کا پہلا شعری مجموعہ ''خدوخال'' ۱۹۸۶ء میں کراچی سے شائع ہوا تھا۔

نعت

دل مدینے میں ملا عزمِ سفر سے پہلے
منزلِ شوق ملی راہ گزر سے پہلے

روشنی آپؐ کی یادوں کی جو پھیلی گھر گھر
لُٹ گئی شامِ الم نورِ سحر سے پہلے

آپؐ کی چشمِ توجہ ہے تعارف میرا
قطرۂ اشک ہی تھا میں تو گہر سے پہلے

ذکرِ طیبہ ہو تو بس میں نہیں رہتی آنکھیں
وہ تو سب جانتے ہیں دیدۂ تر سے پہلے

سائباں آپؐ کی رحمت کا بہت ہے ہم کو
ہم کہیں کے بھی تھے جو آپؐ کے در سے پہلے

ہم کو تو رحمتِ عالمؐ کے کرم سے فاخر
فیض ملتا ہے دعاؤں میں اثر سے پہلے

غزل

مسافتِ شبِ ہجراں طویل لکھتے رہے
ملے جو درد انہیں سنگِ میل لکھتے رہے

حکایتیں ہی نہیں لکھیں آگ کی ہم نے
حقیقتیں بھی □نبِ خلیل لکھتے رہے

جو قلب و جاں میں ہے خوشبو کسی کی زلفوں کی
اسی کو اپنی متاعِ جلیل لکھتے رہے

رہی یہ آس کہ سیراب ہوگی کشتِ حیات
سو جوہڑوں کو بھی دریائے نیل لکھتے رہے

نکل سکی نہ وہاں ایک بوند بھی فاخر
تمام عمر جن آنکھوں کو جھیل لکھتے رہے

احمد ندیم قاسمی

(۱۹۱۶ء۔۲۰۰۶ء)

احمد ندیم قاسمی ۲۰ر نومبر ۱۹۱۶ء کو انگہ ضلع خوشاب میں میر غلام نبی کے گھر میں پیدا ہوئے۔ اُن کا گھریلو نام احمد شاہ ہے۔ ابتدائی تعلیم انگہ میں پانے کے بعد اپنے چچا حیدر شاہ کے پاس کیمبل پور ضلع اٹک آگئے جو وہاں مجسٹریٹ ہونے کے ساتھ اعلیٰ ادبی اور شعر و سخن کا ذوق بھی رکھتے تھے۔ احمد ندیم قاسمی کی پرورش علمی ادبی اور تصوف آمیز ماحول میں ہوئی۔

احمد ندیم صاحب نے ۱۹۲۶ء میں میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۳۵ء میں بی اے کر لیا۔ ۱۹۳۷ء میں لاہور آگئے۔ ۱۹۳۹ء میں سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ تاہم اپنی اُفتادِ طبع کی بنا پر سرکاری ملازمت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ ن م راشد کی طرح انہوں نے بھی ابتدا میں اختر شیرانی کی شاگردی اختیار کی تھی۔ اُس کے بعد اخباری دنیا سے وابستہ ہو کر روزنامہ "امروز" کے اِدارتی عملہ میں شامل ہو گئے۔ یہ تعلق بھی تھوڑے ہی عرصے قائم رہ سکا۔ احمد ندیم قاسمی کو مولانا عبدالمجید سالک، حامد علی خان اور اختر شیرانی جیسے لوگوں کی صحبتیں میسر رہیں۔ جہاں جہاں اُردو لکھی پڑھی جاتی ہے، وہاں احمد ندیم قاسمی کو مختلف حوالوں سے جانا جاتا ہے۔ بہ حیثیت ادیب، افسانہ نویس، کالم نگار مشہور رہے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد ریڈیو پاکستان، پشاور میں ذوالفقار علی بخاری، سجاد سرور نیازی، رفیق غزنوی کے ساتھ احمد ندیم قاسمی بھی بہ طور اسکرپٹ رائٹر ملازم رہے۔ ترقی پسند تحریک اور پاکستان رائٹرز گلڈ میں فعال کردار ادا کیا۔ آمریت کے خلاف آوازِ حق بلند کرنے والوں میں آپ کا شمار کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ احمد ندیم قاسمی کا تعلق ایک صوفی خانوادے سے رہا ہے اس لیے ممکن ہے آنے والے زمانے میں اُن کے کلام میں تصوف کے تمام تلازمے دریافت کر لیے جائیں اور اُنہیں تصوف سے منسلک کر دیا جائے۔ اُن کا کہنا ہے "مُلّا کے مقابلے میں صوفی

بہت وسیع القلب ہوتا ہے۔'' صوفی مزاج نہ رکھنے کے باوجود وہ اپنے اسلاف کے ساتھ قلبی نسبت برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ ہر چند انہوں نے عمرِ عزیز کا وافر حصہ کمیونزم کی تبلیغ و اشاعت میں صرف کیا۔ تاہم زندگی کے آخری حصے میں اُن کو نعت نگاری سے شغف ہوا۔ اپنے نعتیہ مجموعے ''جمال'' میں ہادیٔ برحق خاتم النبیین (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو انہوں نے خوب صورت پیرائے میں خراج تحسین اور فلسفیانہ انداز میں ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا ایک نعتیہ مجموعہ ''جمال'' اور اُن کی متعدد تصانیف کے دو یا اس سے زائد ایڈیشن بھی شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کی کتاب ''دشتِ وفا'' پر ''آدم جی ادبی ایوارڈ'' دیا گیا۔

حکومتِ پاکستان اُن کی گراں قدر ادبی خدمات پر ''ستارۂ امتیاز'' بھی دے چکی ہے۔

مقتدرہ قومی زبان کی جانب سے احمد ندیم قاسمی کو نشانِ سپاس دیا جا چکا ہے۔ عالمی فروغ اُردو دوحہ قطر کی جانب سے ''لائف اچیومنٹ'' ایوارڈ دیا گیا۔

ڈاکٹر عاصی کرنالی ''اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر'' صفحہ ۴۰۰ پر احمد ندیم قاسمی کے بارے میں فرماتے ہیں: ''قاسمی صاحب کے نقطۂ نظر بلکہ عقیدۂ ایمانی کے مطابق حضورؐ ہی ہادیٔ انسانیت ہیں، حضورؐ ہی کی سیرت اور اسوۂ حسنہ میں انسانیت کے لیے منشورِ عدل و امن و محبت ہے اور حضورؐ ہی کی نگاہِ کرم پر ہماری سعادتِ دینوی و آخروی کا دارومدار ہے۔ قاسمی صاحب کے یہاں فنی اور معنوی محاسن سے آراستہ نعت، آفاقی موضوعات و مسائل کو اپنے دامنِ اظہار میں سمیٹ کر اور دردمندانہ لہجے میں بیان ہو کر نعت گوئی کے سفر کی ایک ارفع منزل میں نمودار ہوتی ہے۔

آپ بچوں کے بھی معروف ادیب تھے، آپ کی کثیر الجہات شخصیت پر تا دیر بہت کچھ لکھا جاتا رہے گا۔ اُردو ادب کی یہ بلند قامت شخصیت دنیائے ادب کو ۱۰ر جولائی ۲۰۰۶ء کو سوگوار چھوڑ گئی۔ آخری آرام گاہ لاہور میں ہے:

نعت

روح و بدن میں، قول و عمل میں، کتنے جمیل ہیں آپؐ
انساں ہے مسجودِ ملائک، اس کی دلیل ہیں آپؐ

آپؐ کی اک اک بات کلامِ الٰہی کی تفسیر
قرآں تو اجمالِ بلیغ ہے، اور تفصیل ہیں آپؐ

آپؐ کے ذکر سے کھلتے جائیں راز جہانوں کے
قدم قدم پہ وجود و عدم میں سب کے کفیل ہیں آپؐ

مکہ و طائف کی گلیوں میں سنگِ ستم کے ہدف
بدر و حنین کے میدانوں میں بطلِ جلیل ہیں آپؐ

روزِ ازل، انساں کو خدا نے اک منشور دیا
اور اسی منشورِ ہدایت کی تکمیل ہیں آپؐ

کتنے یقیں سے بڑھتا جائے آپؐ کی سمت ندیمؔ
اس کو کیا اندیشۂ شب، جس کی قندیل ہیں آپؐ

غزل

کون کہتا ہے کہ موت آئی تو مرجاؤں گا
میں تو دریا ہوں سمندر میں اتر جاؤں گا

تیرا در چھوڑ کے میں اور کدھر جاؤں گا
گھر میں گھر جاؤں گا صحرا میں بکھر جاؤں گا

تیرے پہلو سے جو اٹھوں گا تو مشکل یہ ہے
صرف اک شخص کو پاؤں گا جدھر جاؤں گا

اب ترے شہر میں آؤں گا مسافر کی طرح
سایۂ ابر کی مانند گزر جاؤں گا

چارہ سازوں سے الگ ہے مرا معیار کہ میں
زخم کھاؤں گا تو کچھ اور سنور جاؤں گا

زندگی شمع کی مانند جلاتا ہوں ندیمؔ
بجھ تو جاؤں گا مگر صبح تو کر جاؤں گا

اخترؔ شیرانی

(۱۹۰۵ء۔۱۹۴۹ء)

تحقیق ادب سے دل چسپی رکھنے والے لوگ حافظ محمود شیرانی کے علمی کارناموں سے کما حقہٗ آگاہ ہیں۔ دنیائے علم و ادب میں یقیناً اُن کو "پنجاب میں اُردو" اور "مقالاتِ محمود شیرانی" کے حوالے سے یاد کیا جاتا رہے گا۔ محمد داؤد خاں اُنھی حافظ محمود شیرانی کے گھرانے میں ڈونگرہ نامی بستی ریاست ٹونک راجستھان (انڈیا) میں ۴رمئی ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ٹونک میں حاصل کرنے کے بعد سولہ برس کی عمر میں لاہور میں وارد ہوئے۔ اُن کا زیادہ تر قیام لاہور میں رہا، جہاں ساحرؔ لدھیانوی سے اُن کی دوستی رہی اور اکیڈمک تعلیم کے بجائے اُنھوں نے اورینٹل کالج، لاہور میں ۱۹۲۱ء میں داخلہ لیا۔ پہلے منشی فاضل اور بعد ازاں ادیب فاضل کے امتحانات میں کام یابی حاصل کی۔ لاہور میں صحافت اور شاعری کے چرچے تھے، اس ماحول سے اخترؔ کا متاثر ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ پہلے "عالمگیر" نامی ادبی جریدے میں اُن کی تخلیقات شائع ہوئیں، پھر ملازمت کے بجائے اُنھوں نے صحافت کو ترجیح دی۔ اپنا ذاتی رسالہ "رومان" نکالا، جس کے باعث اُن کے والد اُن سے ناراض رہا کرتے تھے۔ جب کہ اُن کے بھائی مظہر محمود شیرانی اپنے والد کے نقشِ قدم پر چل کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور علمی و تحقیقی سرگرمیوں میں مصروف رہا کرتے تھے۔ ماہنامہ "نگار" لکھنو کے غزل گو شعراء نمبر کے صفحہ ۱۳۱ پر لکھا ہے کہ "ٹونک میں پیدا ہوا، لاہور میں پلا بڑھا اور شاید میرے انتقال کی خبر بھی سب سے پہلے لاہور میں چھپے گی، بعد میں ہندوستان یا ٹونک جائے گی۔"

اختر شیرانی نے بہت کم عمری میں شعروادب کی دنیا میں وہ مقام حاصل کرلیا تھا جس کی آرزو میں نامعلوم کتنے ادیب وشاعر رہا کرتے ہیں۔ اُن کے متعدد شعری مجموعے شائع ہوئے۔ اُنہوں نے فلمی وادبی جرائد کی ادارت کی اور لوگوں کے دلوں میں گھر کر گئے۔ شعری مجموعوں میں اختر شیرانی کی جو کتابیں منظرِ عام پر آئیں، اُن میں مشہور ہونے والی ''پھولوں کے گیت'' (۱۹۳۶ء)، ''نغمۂ حرم'' (۱۹۳۹ء)، ''صبحِ ساز'' (۱۹۴۵ء)، ''طیورِ آوارہ'' (۱۹۴۶ء)، ''لالۂ طور'' (۱۹۴۶ء)، ''اختر ستان'' (۱۹۴۶ء) کے علاوہ ''شہروُد'' (۱۹۴۹ء) میں شائع ہوئی۔ ''شعرستان'' ۱۳ سانیٹ اور ۴۰ نظموں پر مشتمل (۱۹۴۱ء)۔ نثری کتابوں میں ''ضحاک'' (ترکی ڈرامے کا ترجمہ) ''دھڑکتے دل'' (افسانے) ''آئینہ خانے میں'' (فلمی افسانے ۱۹۴۶ء)۔ ترجمہ عربی جوامع الحکایات ''اختر وسلمیٰ'' کے خطوط (۱۹۵۷ء) ''وہ بھی دیکھا، یہ بھی دیکھا'' (ڈرامے ۱۹۴۷ء) ''جنگ کے موقع پر ترانہ''، ''اعترافِ محبت''، ''انتظار''، ''او دیس سے آنے والے بتا''، ''اے عشق کہیں لے چل''، ''اے عشق ہمیں برباد نہ کر''، ''بستی کی لڑکیوں میں بدنام ہو رہا ہوں''، ''جوگن'' اور ''جہاں ریحانہ رہتی تھی'' ایسی نظمیں ہیں جنہیں سن کر نوجوانوں پر دیوانگی طاری ہو جاتی تھی۔ اختر رومان کو مفروضے سے نکال کر حقیقت کی دنیا میں لے آئے۔ اُنہوں نے ضمیر غائب کی جگہ روبہ رو تخاطب کا انداز برتا۔ شاعری میں مکالماتی فضا قائم کی۔ جس نے آنے والے شعرا کو ایک روش دی۔ اُن سے پہلے مومن خاں مومنؔ کے ہاں ''تم مرے پاس ہوتے ہو گویا'' جیسی شاعری تھی۔ وہ ایک وضع دار انسان تھے۔ دوستوں کے دکھ درد میں شریک ہوتے اور اس کی وجہ سے گھریلو زندگی پر کم توجہ دیتے۔ اُن کی اس بات پر اُن کے والد اُن سے نالاں رہتے۔

اختر کی نعتیہ شاعری میں حب رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی دل آویزی بھرپور انداز میں موجود ہے۔ ''شہروُد'' اگرچہ اُن کا باقاعدہ نعتیہ مجموعہ نہیں ہے۔ تاہم اس میں نعتیں موجود ہیں۔

قدم بڑھائے چلو رہروانِ منزلِ شوق
ہے ابرِ رحمتِ حق گلفشاں مدینے میں

۴۳ برس کی جوانی بھری عمر میں ۱۹۴۹ء میں اختر شیرانی نے اس جہاں کو خیرباد کہا اور خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اُن کی ابدی آرام گاہ میانی صاحب، لاہور میں ہے۔ حکومتِ پاکستان نے اُن

کو "شاعرِ پاکستان" کا خطاب دے کر ڈاک کا یادگاری ٹکٹ ۲۰۰۵ء میں جاری کیا۔

واضح رہے: ڈاکٹر یونس حسنی کی کتاب "اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب" ۱۹۶۵ء میں پی ایچ۔ڈی کے لیے اُن کا مقالہ انجمن ترقیِ اُردو، پاکستان نے ۱۹۷۶ء میں چھاپا تھا۔ اختر شیرانی نے ایک قطعے میں ٹونک کے اُن شعراء کا ذکر کیا ہے:

جہاں سلمٰی کی وادی ہے جہاں ریحانہ رہتی ہے
جہاں عذرا کے آویزے تبسم بار ہیں اختر
وہاں پہ جوہر و درد و قمر اور سالک و بسمل
خیابانِ ادب کے عظمتِ کہسار ہیں اختر

جوہر سعیدی، درد سعیدی، بسمل سعیدی کے شاگرد، قمر ہاشمی اختر شیرانی کے اور سالک الہاشمی حسرت موہانی کے شاگرد تھے۔

بہ شکریہ "خاکِ دل" شعری مجموعہ سالک الہاشمی (علیگ) ایڈوکیٹ مرتبہ انور جاوید ہاشمی، پاکستان کے نعت گو شعراء، ڈاکٹر یونس حسنی کی کتاب "اختر شیرانی اور جدید اُردو ادب" ۱۹۶۵ء میں پی ایچ۔ڈی کے لیے اُن کا مقالہ انجمن ترقیِ اُردو پاکستان نے ۱۹۷۶ء میں چھاپا تھا۔

نعت

لٹائے سجدے نہ کیوں آسماں مدینے میں
رسولؐ پاک کا ہے آستاں مدینے میں

قدم بڑھائے چلو رہروانِ منزلِ شوق
ہے ابرِ رحمت گلفشاں مدینے میں

درِ رسولؐ کے ذرّوں کی گر تلاش نہیں
تو کس کو ڈھونڈتی ہے کہکشاں مدینے میں

بہشت چیز ہی کیا ہے کہ ایک سجدے میں
ہمیں تو مل گئے دونوں جہاں مدینے میں

قدم اُٹھائے ادب سے ذرا نسیمِ سحر
ہیں محوِ خواب شہِ دو جہاں مدینے میں

مدینے جاتے ہیں پیری میں لوگ سب اخترؔ
مزا ہے کاٹ دو عمرِ جواں مدینے میں

غزل

کچھ تو تنہائی کی راتوں میں سہارا ہوتا
تم نہ ہوتے نہ سہی ذکر تمہارا ہوتا

ترکِ دنیا کا یہ دعویٰ ہے فضول اے زاہد
بارِ ہستی تو ذرا سر سے اتارا ہوتا

وہ اگر آ نہ سکے موت ہی آئی ہوتی
ہجر میں کوئی تو غم خوار ہمارا ہوتا

زندگی کتنی مسرت سے گزرتی یارب
عیش کی طرح اگر غم بھی گوارا ہوتا

عظمتِ گریہ کو کوتاہ نظر کیا سمجھیں
اشک اگر اشک نہ ہوتا تو ستارا ہوتا

کس کو فرصت تھی زمانے کے ستم سہنے کی
گر نہ اس شوخ کی آنکھوں کا اشارا ہوتا

کوئی ہمدرد زمانے میں نہ پایا اختر
دل کو حسرت ہی رہی کوئی ہمارا ہوتا

اختر لکھنوی

(۱۹۳۴ء۔۱۹۹۵ء)

حسرت موہانی، جوش، فراق گورکھپوری، جگر مرادآبادی، جیسے نامور شاعروں اور ادیبوں اور حسین شہید سہروردی، شیرِ بنگال مولوی فضلِ حق سے قربت رکھنے والے ۱۴ ستمبر ۱۹۳۴ء محلہ زبجی لکھنؤ میں پیدا ہونے والے حافظ قرآن محمد حسین کے صاحبزادے محمودالحسن کو ادبی دنیا میں اختر لکھنوی کے نام سے شہرت ملی۔ تیرہ چودہ برس کی عمر میں نقوش، لیل و نہار، سویرا اور نیرنگِ خیال جیسے مؤقر ادبی رسائل میں ان کا کلام شائع ہونے لگا تھا۔ انجمن ترقی اردو مشرقی پاکستان کے ڈھاکہ آفس میں سیکریٹری رہے۔ ریڈیو پاکستان ڈھاکہ ۱۹۷۱ء کراچی میں براڈکاسٹر اور پروڈیوسر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔ روزنامہ "انقلاب" ڈھاکہ، "امن" اور ماہنامہ "فن کار" ڈھاکہ کے نائب مدیر رہے۔

پہلا مجموعۂ غزل "دیدۂ تر" ۱۹۸۷ء میں، نعتیہ مجموعہ "حضور ﷺ" ۱۹۸۸ء میں، دوسرا نعتیہ مجموعہ "سرکار ﷺ" ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۹۵ء کو اختر لکھنوی کا انتقال کراچی اورنگی ٹاؤن میں ہوا۔ مقامی قبرستان میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ ان کی وفات کے بعد احباب نے ۱۹۹۶ء "شاخِ نہالِ غم" نامی شعری مجموعہ شائع کیا۔

نوٹ:...... "دبستانوں کا دبستان" جلد دوم ص ۳۱ پر ان کا سالِ ولادت ۱۹۳۵ء درج ہے جبکہ "وفیات" ص ۱۴ پر ستمبر ۱۹۳۴ء ہے اور "پاکستان کے نعت گو شعراء" (سید محمد قاسم) حصہ اوّل ص ۵۶ پر ۱۹۳۵ء درج کیا گیا ہے۔

۔ ''اردو نعت پاکستان میں'' ڈاکٹر شہزاد احمد کی پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ اختر لکھنوی مرحوم کے حوالے سے تحریر فرماتے ہیں کہ ''تذکرہ شعرائے مشرقی پاکستان ان کی مطبوعہ کتاب ہے''۔ میں اس کتاب کے حوالے سے ان کی تحریر کی تردید کرتا ہوں۔ پروفیسر ہارون الرشید کی مشرقی پاکستان کے شعراء و ادبا پر گہری نظر ہے۔ ''محفل جو اجڑ گئی'' اور ''دو ہجرتوں کے اہلِ قلم'' ان دونوں کتابوں میں مذکورہ کتاب کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ نے بھی وفیاتِ اہلِ قلم میں اس کا ذکر کیا ہے جو درست نہیں۔ ڈاکٹر شہزاد احمد نے ماہ نامہ حمد و نعت کراچی، جلد چھ، اپریل مئی ۱۹۹۶ء، شمارہ دس اور گیارہ میں بھی ''تذکرہ شعرائے مشرقی پاکستان'' کا ذکر کیا ہے۔ یہ حقیقت سے دور اور محض سنی سنائی بات ہے۔ راقم تو اورنگی ٹاؤن میں ان کا پڑوسی تھا۔ اگر اس کتاب کا کوئی وجود ہوتا تو میرے علم میں بھی ضرور ہوتا اور پاکستان کے نعت گو شعراء جلد اوّل میں ضرور اس کا ذکر کیا جاتا۔ کیونکہ یہ کتاب اختر لکھنوی مرحوم کی زندگی میں ان کے سامنے شائع ہوئی تھی۔

◆◆◆

نعت

ان کے در پر گئے گردِ راہِ سفر جسم پر رکھ کے ہم
اور پھر یہ ہوا پہروں روتے رہے در پہ سر رکھ کے ہم

راستوں کی ہوا رہنما بن گئی سارباں بن گئی
جب چراغ اُن کی چاہت کا لے کر چلے ہاتھ پر رکھ کے ہم

جس کی تقدیر میں فرق کوئی نہیں شام کوئی نہیں
نور کے شہر سے لائے ہیں چشم میں وہ سحر رکھ کے ہم

اپنے رب سے دعا مانگتے وقت اب شرم آتی نہیں
اُن کی دہلیز سے آئے اپنی دعا میں اثر رکھ کے ہم

اپنی ہر رات رکھتے ہیں روشن بہت اور معطر بہت
اک چراغِ وفا اُن کی یادوں بھرے طاق پر رکھ کے ہم

غزل

گہن میں ڈوبے ہوئے مہتاب کتنے ہیں
ہم ایسے شہر میں خانہ خراب کتنے ہیں

وفا کے نام پر جاں دینے والے ہم جیسے
تری صفوں میں برائے حساب کتنے ہیں

ہمارے ساتھ چلو گے تو جان جاؤ گے!
ہمارے پاؤں تلے انقلاب کتنے ہیں

کسی نے بھی نہیں پوچھا کبھی کسی عنوان
ہماری جاگتی آنکھوں میں خواب کتنے ہیں

تمام عمر رہا انتظار کا موسم
نہ جانے در بدری کے عذاب کتنے ہیں

اختر ہوشیار پوری

(۱۹۱۸ء۔ ۲۰۰۷ء)

عبدالسلام ۲۰ر اپریل ۱۹۱۸ء کو ہوشیار پور، پنجاب (مشرقی بھارت) میں ڈاکٹر شیخ عبدالعزیز کے گھر پیدا ہوئے۔ عبدالسلام کو ادبی دنیا میں اختر ہوشیار پوری کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ شعروادب سے اُن کا تعلق کالج کی تعلیم کے زمانے میں ہی ہو گیا تھا جب وہ انٹر کے طالب علم تھے۔

آزادیٔ وطن ۱۹۴۷ء کے بعد سے مستقل قیام راولپنڈی میں رہا۔ مروّجہ تعلیم بی اے، ایل ایل بی ہے۔

اختر ہوشیار پوری کی منتخب غزلیں "علامت" کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔ یہ مجموعہ ادب شناس حلقوں میں خاصا مقبول ہوا، جب کہ نعتیہ کلام "برگِ سبز" کے عنوان سے (۱۹۷۸ء) میں منظرِ عام پر آیا تھا جسے نعتیہ ادب سے محبت کرنے والوں سے پذیرائی ملی۔

بعدازاں ۱۹۹۷ء میں "مجتبیٰ" اُس کے بعد ۱۹۹۹ء میں "رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)" اور آخری نعتیہ مجموعہ "خیرالبشر (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)" ۲۰۰۰ء میں منظرِ عام پر آیا۔ بعدِ مرگ اُن کے نعتیہ مجموعے "خیرالبشر" (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)" پر ۲۰۰۱ء میں قومی سیرت ایوارڈ بھی دیا گیا۔ اختر ہوشیار پوری کی نعتیہ شاعری ایک کاملِ فن اور حُبِّ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے سرشار شاعر کا تخلیقی اظہار ہے۔

ڈاکٹر عاصی کرنالی "اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر" صفحہ ۲۰۷ پر رقم طراز ہیں:

> "اختر ہوشیار پوری نے نعت کے لیے جو حدود و خطوط متعین کیے ہیں ان کی نعتیں انہی کے مطابق ہیں۔ ان میں دلگدازی بھی ہے اور دلآویزی بھی۔ دلکشی بھی ہے اور دلکشائی بھی۔ "برگِ سبز" ایک حمد اور غزلیہ ہیئت کی بہت سی نعتوں پر مشتمل ہے۔"

◆◆◆

نعت

اک مصطفیٰؐ کا نام ہے نامِ خدا کے بعد
پھر دو جہاں میں کچھ بھی نہیں مصطفیٰؐ کے بعد

دنیا تمام نور کے سانچے میں ڈھل گئی
صلِ علیٰ کا شور ہے صلِ علیٰ کے بعد

حرفِ درود مطلعِ قرآں نوائے شوق
کیا کچھ ملا ہے زیست کو تیریؐ ثنا کے بعد

عالم تمام حلقۂ ختم الرسلؐ ہوا
فطرت سمٹ گئی ہے شہِ انبیاءؐ کے بعد

تیرا کرم کہ سر مرا جھکنے نہیں دیا
جرم و سزا سے پہلے نہ جرم و سزا کے بعد

جیسے نسیم کوئے مدینہ ہے اور میں
یوں مطمئن ہوں مدحتِ خیر الوریٰؐ کے بعد

مجھ پر مرا وجود سبک بھی، گراں بھی ہے
عالم ہی اخترؔ اور ہے اُن کی عطا کے بعد

غزل

خواہشیں اتنی بڑھیں انسان آدھا رہ گیا
خواب جو دیکھا نہیں وہ بھی ادھورا رہ گیا

میں تو اس کے ساتھ ہی گھر سے نکل کر آ گیا
اور پیچھے ایک دستک ایک سایہ رہ گیا

آج تک موجِ ہوا تو لوٹ کر آئی نہیں
کیا کسی اجڑے نگر میں دیپ جلتا رہ گیا

انگلیوں کے نقش گلدانوں پہ آتے ہیں نظر
آؤ دیکھیں اپنے اندر اور کیا کیا رہ گیا

دھوپ کی گرمی سے اینٹیں پک گئیں پھل پک گئے
اک ہمارا جسم تھا اختر جو کچا رہ گیا

ڈاکٹر اختر ہاشمی

(۱۹۵۴ء)

سید منقاد حیدر ایک ایسے خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں جس میں تہذیبی اقدار کے ساتھ طلب علم کا جذبہ ہمیشہ رہا ہے ان کا گھرانہ فیصل آباد سے لکھنؤ اور بعد ہجرت کراچی تا لاہور علمی و ادبی خدمات انجام دیتا رہا ہے۔ سید وحید الحسن ہاشمی کا نام اس میں سرِ فہرست ہے۔ اب تک ان کی پچاس سے زائد علمی و ادبی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ اختر ہاشمی کے چچا ہیں۔

سید منقاد حیدر ۱۹۵۴ء کو شہر لاہور میں پیدا ہوئے، یہاں کا ادبی و علمی ماحول ویسے ہی حیرت انگریز طور پر لکھنے پڑھنے والوں پر اثر انداز ہو جاتا ہے، علمی گھرانے اپنے بچوں کو اس انداز میں تعلیم و تربیت کے منازل طے کراتے ہیں کہ بچے سنِ شعور میں قدم رکھنے کے ساتھ ساتھ علم و ادب کی دنیا میں اپنی جولانیِ طبع کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔

سید منقاد حیدر ادبی دنیا میں اختر ہاشمی کے نام سے جانے جاتے ہیں، ان کے شعری وجدان کو فروغ دینے میں شاہد نقوی اور اختر جونپوری کا بڑا حصہ ہے، تاہم ان کی خاندانی علم و آگہی نے ان کے ادبی سفر کے لیے راستہ ہموار کر دیا، جناب کے نعتیہ مجموعہ "حروفِ مدحت" نے ۲۰۰۱ء میں طبع ہو کر دینی ادب کے قاری کے ایک بڑے حصے کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اسٹیٹ بینک کے ملازم اور پاکستان بینکنگ کونسل نے ان کو ان کے تحقیقی مقالے پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی ہے۔ اب ڈاکٹر اختر ہاشمی کہلاتے ہیں۔

◆◆◆

نعت

تا حدِ نظر آپؐ کا جلوہ نظر آئے
جب بند ہوں آنکھیں تو مدینہ نظر آئے

سرکارؐ اگر اذنِ حضوری میں ہے کچھ دیر
خوابوں میں سہی گنبدِ خضرا نظر آئے

اتنا تو اثر الفتِ سرکارؐ دکھا دے
میں شب کو جو نکلوں تو سویرا نظر آئے

اچھا ہے کہ خورشید رہے آپ سے کچھ دور
آ جائے اگر پاس تو ذرّہ نظر آئے

ہجرِ شہِ بطحاؐ میں ہے آنکھوں کی یہ حالت
اک اشک بھی گر جائے تو دریا نظر آئے

لوگو! مجھے تنقیدِ زمانہ کی نہیں فکر
ایسا ملے کوئی سب کو جو اچھا نظر آئے

اختر ہو اگر آلِ محمدؐ سے محبت
ہر سمت اجالا ہی اجالا نظر آئے

غزل

فکر اب نہیں کوئی* اشک غم بہانے کی
راس آ گئیں ہم کو گردشیں زمانے کی

بارگاہ الفت میں چار سمت خوشبو ہے
کچھ تمہاری باتوں کی کچھ مرے فسانے کی

پھول توڑ کر دیکھو وہ بھی آہ بھرتا ہے
بس صدا نہیں آتی دل کے ٹوٹ جانے کی

بس اسی تذبذب میں عمر کٹ گئی اپنی
خوف برگ و باراں کا، فکر آشیانے کی

یہ مزے اسیری کے اہل شہر کیا جانیں
گھر میں دیکھ لیتا ہوں شکل قید خانے کی

مشل ہے کہاں یارو! اختر سخنور کا
اب نہ آرزو کرنا اس کو آزمانے کی

اخلاق عاطف

اخلاق عاطف کا سنِ پیدائش ۱۹۵۸ء ہے۔ کمرشل آرٹ سے تعلق رکھنے والوں میں اخلاق عاطف کو نمایاں حیثیت حاصل رہی ہے۔ تاہم اُن کی ایک پہچان نعت نگار شاعر کی بھی ہے۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اگر انسان اپنی صلاحیتوں کو برمحل اور مناسب طریقے سے بروئے کار لانے پر آمادہ ہو جائے تو قدرت بھی فیاضی کا مظاہرہ کرنے سے دریغ نہیں کرتی۔ آرٹسٹ زندگی کی حقیقتوں کا عکاس ہوتا ہے۔ اُس کا مشاہدہ، اُس کا تجربہ اور قوتِ غور و فکر مل کر اُس میں روحانی قوتوں کو بیدار کر سکتے ہیں اور اگر اُس کی فکر رسا ہے تو شعری اظہار کے ساتھ وجدان کی نئی نئی راہیں اُسے کہیں سے کہیں پہنچا دیا کرتی ہیں۔

اخلاق عاطف نے نعت کے حوالے سے بھی خاصا کام کیا۔ اُن کی نعتیہ تالیفات میں سرگودھا کے شعراء کا انتخاب ''گلِ عقیدت'' اور دوسرا انتخاب ''جانِ رحمت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)''، ضلع سرگودھا کی نعتیہ تاریخ و انتخاب ہے۔ انفرادی سطح پر اپنی نعتوں کو یکجا کر کے اُنہوں نے ''قریہ قریہ خوشبو'' بکھیری ہے۔ جس کی دل کشی کی ملک بھر کے نعت گوئی سے شغف رکھنے والوں اور قارئین کے ایک بڑے حلقے نے پذیرائی کی ہے۔ اہلِ ذوق و صاحبانِ دل کو اپنی جانب مائل کرنے والے تمام دھنک رنگوں کو عاطف نے اپنے مجموعے میں سمو دیا ہے۔

بچپن ہی میں یتیمی کی چادر اوڑھنے والے اخلاق عاطف نے دورانِ تعلیم دل جمعی اور لگن کے ساتھ سیرۃ النبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مطالعہ کیا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اخلاق و اوصاف حسنہ کے مطالعے نے اُنہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ سیرت کے پیغام کو نعتیہ اظہار کا وسیلہ بنایا جائے۔ اخلاق عاطف کی نعتوں کو پڑھنے کے بعد اُن کے سچے اور کھرے انسان ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا۔ فی زمانہ لوگ سچ کہنے سے گریز کرتے ہیں۔ اللہ سچے لوگوں کے ساتھ ہے اور اُنہیں اپنا دوست کہتا ہے۔

◆◆◆

نعت

تیرگی میں نور پارہ آپؐ کا نقشِ قدم
بحرِ عصیاں میں کنارہ آپؐ کا نقشِ قدم

سرخ روئی، سرفرازی، خوش نصیبی، مغفرت
ہے سبھی کا استعارہ آپؐ کا نقشِ قدم

عرصہ ہائے زندگی میں ہر قدم، ہر موڑ پر
عزم و ہمت کا اشارہ آپؐ کا نقشِ قدم

منفرد سب سے جہاں میں آپؐ کا حُسنِ کلام
مختلف، دنیا سے پیارا آپؐ کا نقشِ قدم

سب تھکی آنکھوں کا درماں، ہر دُکھی دل کی اماں
آپؐ کے در کا نظارہ آپؐ کا نقشِ قدم

ہم نے بھی گیارہ برس کاٹے ہیں دشتِ جبر میں
تھا ہمارا بھی سہارا آپؐ کا نقشِ قدم

غزل

کسی سوچ کے آنگن میں کسی کے دل سے آگے
بڑی آسودگی ہے گرمیٔ محفل سے آگے

ہماری جستجو کا دائرہ ہی مختصر تھا
مناظر اور بھی تھے اس مہ کامل سے آگے

سپر انداز ہوجاتے مگر دل نے کہا تھا
کئی آسانیاں ہوتی ہیں اک مشکل سے آگے

ہمیں اذنِ سفر مل جائے تو سب کو بتائیں
ہے دنیا کون سی خاکستری منزل سے آگے

ہنسو زندہ دلی کی رت میں اے پھولو، کہ پھر تو
ہیں خاموشی کے بادل، موسم بے دل سے آگے

کسی احساس میں ماضی ہے کچھ عبرت نہیں ہے
نہ ایسی اک نظر، دیکھے جو مستقبل سے آگے

کئی آنکھیں ہیں عاطفؔ، ان جھکی آنکھوں کے پیچھے
کئی دل بھی دھڑکتے ہیں، کسی کے دل سے آگے

ادیب گلشن آبادی

(۱۹۲۲ـ۱۹۹۰)

غلام جیلانی ۱۹۲۲ء میں ریاست جاورہ غیر منقسم ہندوستان کے شہر گلشن آباد میں پیدا ہوئے تھے اور دنیاوی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ ادبی ذوق اور شعر گوئی کو بھی جلا بخشتے رہے۔ اُنہوں نے ایک طرف ادیب فاضل کے امتحانات پاس کیے تو دوسری جانب طب و جراحت سے بھی شغف رکھا تا کہ خدمتِ انسانیت میں بھی اپنی فطرت کے مطابق خود کو مصروف رکھ سکیں۔ ایک پڑھا لکھا آدمی جب روحانیت کی طرف مائل ہو جائے تو سونے پر سہاگہ کہیں زیادہ آتا ہے۔ عامۃ الناس کے لیے اُس کا ہر فعل منفعت کا باعث بنتا ہے۔ حضرت غلام جیلانی جن کو علم و ادب کی دنیا میں ادیب گلشن آبادی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے، ایک ایسی ہی شخصیت تھے۔ جنہوں نے ادیبوں، شاعروں، تشنگانِ علمِ دینی و دنیاوی سبھوں کو حسبِ ضرورت کچھ نہ کچھ دینے کی سعی کی۔ نقش بندیہ سلسلے سے وابستگی نے اُن کو ایک وسیع القلب صوفی بھی بنا رکھا تھا، کورنگی لانڈھی کے حلقوں میں جہاں جوہر سعیدی، قمر ہاشمی، عاشق کیرانوی، انجم بدایونی، اور اسماعیل انیس جیسے بزرگ شعراء کو صدارت کے لیے کہا جاتا تھا، وہیں نعتیہ محافل اور طرحی مشاعروں میں حضرت ادیب گلشن آبادی کی شرکت کو بھی لوگ اعزاز تصور کیا کرتے تھے۔ نو آموز شعراء کی تربیت میں اُن کا بڑا دخل رہا۔

جون، جولائی ۱۹۹۰ء میں حج بیت اللہ کے سلسلے میں آپ مناسکِ حج، سعی و طواف میں مصروف تھے کہ منیٰ کے مقام پر آپ کا خالقِ حقیقی کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی محبت انہیں کشاں کشاں لے گئی اور اُسی سرزمینِ پاک پر اُن کا آخری ٹھکانہ بنا۔ پروفیسر خالد اقبال جیلانی کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ آپ کی رحلت کے بعد ''حریم اسریٰ'' میں تمام حمدیہ اور نعتیہ کلام انتخاب کر کے شائع کیا۔

◆◆◆

نعت

ذوقِ قلب و جگر مدینہ ہے
آرزوئے نظر مدینہ ہے

رحمتِ بحر و بر محمدؐ ہیں
جنتِ بحر و بر مدینہ ہے

ہے امینِ متاعِ دُرِ یتیم
نازشِ ہر گہر مدینہ ہے

اُس کی نورانیت کا کیا کہنا
نور والوں کا گھر مدینہ ہے

رہ گئی جم کے سبز گنبد پہ
میری حدِ نظر مدینہ ہے

ہم چلے جس طرف ، وہیں پہنچے
منتہائے سفر مدینہ ہے

میرا کعبہ ادب ہے روئے رسولؐ
میری خلدِ نظر مدینہ ہے ؎

غزل

مُسکراہٹ تری خیالوں میں
دیپ جلنے لگے شوالوں میں

کون سی رات کھا گئی اُن کو
گھر سے نکلے تھے جن اجالوں میں

ہر صحیفہ کا متن تھے جو لوگ
حاشیوں میں نہ اب حوالوں میں

کرچیاں شیشۂ عنایت کی
چبھ رہی ہیں ابھی خیالوں میں

عشق کو کچھ جواب تھے درکار
عقل الجھا گئی سوالوں میں

اسرار احمد سہاروی

خان اسرار احمد خان شیروانی جولائی ۱۹۲۱ء میں پرتاب گڑھ راجپوتانہ میں پیدا ہوئے۔ تاہم سرکاری کاغذات میں قصبہ سہارو ضلع ایٹا (یوپی) تحریر ہے۔

پروفیسر اسرار احمد خان کی شخصیت اہلِ علم کے نزدیک محتاج تعارف نہیں۔ موصوف نے کئی مضامین میں ایم اے کیا ہے۔ ۱۹۵۳ء سے ۱۹۸۱ء تک اسلامیہ کالج، گوجرانوالہ میں فارسی ادب کے اُستاد کی حیثیت سے خدمت انجام دیتے رہے۔ ساٹھ (۶۰) سال کی عمر میں ملازمت سے سبک دوشی اختیار کرلی۔

اسرار احمد خان کا شمار اُن اساتذہ میں ہوتا ہے جو بھرپور انداز میں علمی و ادبی اور تحقیقی عمل میں مصروف رہتے ہیں۔ نثر نگاری ہو یا شعروشاعری، ہر میدان میں آپ کا مطمحِ نظر اسلامی تشخص کا احیاء رہا ہے۔

آپ کی نعتیہ شاعری میں حسنِ ادب کا اعلیٰ نمونہ نظر آتا ہے۔ آپ کے نعتیہ مجموعہ ''اعجاز بیان'' میں حمد اور نعت میں شعوری طور پر حدِ فاصل نمایاں نظر آتی ہے اور فکری کج روی نہیں پائی جاتی۔ یہ نعتیں محبت و عقیدت کے اَن مول شہ پارے ہیں۔ آپ کا تعلق سیاسی میدان میں جماعتِ اسلامی سے ہے۔

•••

نعت

دیدۂ و دل کا گلستاں آپؐ ہیں
کائناتِ عشق کی جاں آپؐ ہیں

رونقِ بزمِ جہاں ہے آپؐ سے
ظلمتِ شب میں چراغاں آپؐ ہیں

حق نے خود تعریف کی ہے آپؐ کی
باعثِ تکریمِ انساں آپؐ ہیں

قاریٔ قرآں بھی ہیں، لیکن حضورؐ
اک مکمل شرحِ قرآں آپؐ ہیں

آپؐ نے تادیب کی انسان کی
ذات میں اپنی دبستاں آپؐ ہیں

طوقِ بدبختی کے کاٹے آپؐ نے
باعثِ توقیرِ نسواں آپؐ ہیں

غزل

دکھا کے حسن کا دامانِ تار تار مجھے
عدو نے کردیا برگشتۂ بہار مجھے

نہ راس آئے مجھے فرشِ مخمل و دیبا
ہجومِ عشق میں پیارے ہیں کہسار مجھے

لہو سے نقش گری کی مرے شہیدوں نے
دیا ہے حسنِ ازل نے یہ شاہکار مجھے

نظر نہ آئے گا دشمن کو میرا زخمِ جگر
عدو کے سامنے جھکنا ہے اوج دار مجھے

پیامِ عشق ہے اسرارِ خانہ ویرانی
خزاں سے ہوگیا اندازۂ بہار مجھے

اسلم فریدی

سرزمینِ بہار (انڈیا) کئی مذہبی، نسلی اور گروہی فکر و فلسفہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا مسکن ہے۔ اس میں بے شمار علمائے ادیان، مشائخ و فضلاء و ادباء نے گل ہائے رنگا رنگ کھلائے ہیں۔ اس کی مہک اور تازگی کو صرف اہلِ نظر ہی دیکھ سکتے ہیں۔ اسی صوبے کی زرخیزی سے سید محمد اسلم فریدی کا خمیر اُٹھا۔

سید محمد اسلم شعر و ادب کی دنیا میں ''اسلم فریدی'' کے نام سے معروف ہیں۔ ۲۸ر نومبر ۱۹۴۶ء کو سید محمد مسلم، مقیم سمتی پور بھارت کے گھر میں پیدا ہوئے۔ اُن کا نسبی تعلق بابا مسعود الدین فرید گنج شکر (رحمۃ اللہ علیہ) سے ہے۔ اسی نسبت سے فریدی تخلص اختیار کیا۔ تقسیم برصغیر ہند کے بعد اُن کا گھرانہ مشرقی پاکستان کے دارالحکومت ڈھاکا ہجرت کر گیا۔ جہاں یونی ورسٹی سے اسلم فریدی نے بی کام کا امتحان پاس کیا اور پرائیویٹ نوکریاں کرتے رہے۔ پہلے پروفیسر فروغ احمد سے مشورۂ سخن کیا اور بعد ازاں علامہ ماہر فریدی کی شاگردی میں سلسلۂ شعر و سخن سے وابستہ رہے۔ اسلم فریدی سقوطِ ڈھاکا کے سانحے کے باعث دوبارہ ہجرت پر مجبور ہوئے اور کراچی اُن کی جائے پناہ ٹھہری۔ ریڈیو پاکستان، کراچی سے اُن کے گیت، نعتیں اور غزلیں مقامی فن کاروں کی آواز میں نشر کی جانے لگیں۔ اخبارات اور ادبی رسائل میں بھی تواتر سے اُن کی تمام اصنافِ شعری جگہ پانے لگیں۔

اسلم فریدی کی تصانیف میں سب سے پہلے غزلوں کا مجموعہ ''افکارِ فریدی'' ۱۹۷۴ء میں شائع ہوا۔ پھر غزلوں کا دوسرا مجموعہ جاوید وارثی مرحوم نے ''پچھلے پہر کا چاند'' کے عنوان سے ۱۹۹۶ء میں شائع کیا۔ اُن کی نعتوں کا ایک انتخاب ''نازشِ دو عالم'' (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) ۲۰۰۱ء میں منظرِ عام پر آیا جسے ۲۰۰۲ء میں صدارتی سیرت ایوارڈ سے نوازا گیا۔

◆◆◆

نعت

طیبہ کی یاد جب کبھی زادِ سفر ہوئی
لمحوں میں جذب شوق کی طے رہ گزر ہوئی

آنکھیں کھلیں تو ٹوٹ گئے سلسلے مرے
جو گفتگو ہوئی وہ بہت مختصر ہوئی

حاصل ہے جس کو منزلتِ اُمتِ رسولؐ
وہ بے اماں ہوئی نہ کبھی دربدر ہوئی

مانگی گئی دیارِ محمدؐ میں جو دعا
وہ رائیگاں گئی نہ کبھی بے اثر ہوئی

پڑھتا رہا درود و سلام آپ پر حضورؐ
یوں بھی فریدیؔ ظلمتِ شب کی سحر ہوئی

غزل

کیا پتا تم کو لب کھلنے سے کیا ہو جائے گا
دل پہ جو گذری ہے اب تک وہ گلہ ہو جائے گا

پھر وہی شب کی خموشی پھر وہ یادوں کا ہجوم
ایسا لگتا ہے کہ دل پھر اک دیا ہو جائے گا

تیرے پیکر کی صباحت جب بنی عنوانِ فکر!
کیا پتا تھا یہ خیالِ اک آئینہ ہو جائے گا

ہم قفس ہی میں مناتے ہیں اگر جشنِ بہار
پھول کے کھلنے کا موسم بے مزہ ہو جائے گا

ان کی آنکھوں میں ہیں پوشیدہ بہت سے معجزے
ایک جنبش میں نہ جانے کیا سے کیا ہو جائے گا

کروٹیں کچھ اس طرح بدلیں زمینِ پاک نے
کیا خبر تھی پل میں اک محشر بپا ہو جائے گا

انجمن در انجمن گونجے گی تیری شاعری
اے فریدیؔ تو محبت کی صدا ہو جائے گا

اصغر سودائی

۱۷ دسمبر ۱۹۲۶ء کو محمد اصغر نے سیال کوٹ میں جنم لیا۔ ۱۹۴۶ء میں مرے کالج سے بی اے کرنے کے بعد لاہور چلے آئے جہاں اسلامیہ کالج، لاہور سے ۱۹۵۰ء میں ایم اے (اقتصادیات) کیا۔ اپنے شہر سیال کوٹ واپس آئے اور اسلامیہ کالج میں درس و تدریس کی خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۶۷ء میں اُنھوں نے علامہ اقبال کالج، سیال کوٹ کا سنگِ بنیاد رکھا۔ ڈیرہ غازی خاں میں ڈائریکٹر تعلیمات کے عہدے پر بھی فائز رہے۔

محمد اصغر ادبی دنیا میں ''اصغر سودائی'' کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ موصوف نے تحریکِ پاکستان میں بھی نمایاں حصہ لیا تھا۔ ''پاکستان کا مطلب کیا، لا الٰہ الا اللہ'' اُنھوں نے تحریکِ آزادی کے جذبے سے سرشار ہو کر لکھا تھا جسے ملک گیر شہرت ملی۔ شاعری کے ساتھ اصغر سودائی کی ایک حیثیت بہ طور افسانہ نگار بھی مانی گئی ہے۔

اصغر سودائی نعت نگاری سے گہرا شغف رکھتے ہیں، عقیدت سے سرشار ہو کر نعت کہتے ہیں، ''شہِ دوسرا'' (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اُن کا نعتیہ مجموعہ ہے جس میں اُن کا منفرد اندازِ بیان صاف جھلکتا ہے۔

نعت

ہو جائے دہر میں مری پہچان ایک نعت
اے شاہِ دوسراؐ ترا احسان ایک نعت

پھر اُس کے بعد ہونٹ سلیں یا کھلے رہیں
میرا خدا سے ہے یہی پیمان ایک نعت

محشر میں مجھ سے فردِ عمل کا ہو جب سوال
ہو تیرےؐ زیرِ سایۂ دامان ایک نعت

تُو میرے سامنے رہے میں تیرے سامنے
اس قُربِ خاص میں چڑھے پروان ایک نعت

لوگوں کے پاس بام و دریچے، علم سپاہ
تیرےؐ فقیرِ راہ کا سامان ایک نعت

سرمایۂ ابد ہو یہ مجموعۂ خیال
مشہورِ دہر ہو مرا دیوان ایک نعت

اصغرؔ اِسی ادا، اِسی دل بستگی کے ساتھ
میں تیرے حرف و نطق پہ قربان ایک نعت

غزل

نشہ بے شک تجھے چڑھتے ہوئے پندار کا ہے
مجھ کو رونا اسی گرتی ہوئی دیوار کا ہے

میرے آنسو کے نکلنے کی صدا غور سے سن
یہ بھی اک لفظ مری آنکھ میں گفتار کا ہے

جان دینا ہے تو کر حُسن پرستی کو شعار
مسندِ دار پہ قبضہ لب و رخسار کا ہے

تو کہاں تحفۂ اخلاص و وفا لے آیا
سارا جھگڑا ہی جہاں درہم و دینار کا ہے

مرگ تخیّل کا اصغر کوئی امکاں تو نہ تھا
کیوں سیہ پوش قبیلہ مرے اشعار کا ہے

اظہارؔ قریشی

اظہارؔ قریشی کا پورا نام ''اظہار الدین قریشی ابن معراج الدین'' ہے، ۲۰ر نومبر ۱۹۴۰ء کو ریواڑی (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ جامعہ سندھ سے ایم اے کیا۔ سرکاری ملازمت سوشل ویلفیئر ڈیپارٹ منٹ میں رہی۔ مستقل رہائش نواب شاہ سندھ میں ہے۔ نثر نگاری اور شاعری سے شغف رکھتے ہیں۔ نواب شاہ کے سرگرم ادباء میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔

اظہارؔ قریشی کی شائع شدہ تالیفات میں ''گل ہائے عقیدت: شعرائے نواب شاہ کی طرحی نعتوں اور سلاموں کا مجموعہ ہے۔ اس کے علاوہ ''تذکرہ''، نواب شاہ کے اُردو، سندھی شعراء کی سوانح اور انتخاب کلام ''ساغر و مینا'' اور ''درد و غم'' کے عنوان سے ساغرؔ شیرانی کی غزلوں، نظموں اور قطعات کے دو مجموعے بھی شامل ہیں۔

''اظہار عقیدت'' موصوف کا نعتیہ مجموعہ ہے جو ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا تھا۔ سہل ممتنع میں کہے گئے نعتیہ اشعار کی یہ بہترین کوشش ہے۔

نعت

کرم اور اتنا کرم اللہ اللہ
درِ مصطفیٰؐ اور ہم اللہ اللہ

وہ کرسی و لوح و قلم اللہ اللہ
کہاں مصطفیٰؐ کے قدم اللہ اللہ

ہوا جب سے اُن کا کرم اللہ اللہ
زمیں ہو گئی محترم اللہ اللہ

جبینِ محبت وہیں جھک گئی ہے
جہاں دیکھے نقشِ قدم اللہ اللہ

اُتر آئی آنکھوں کی راہوں سے دل میں
تجلیِ بابِ حرم اللہ اللہ

تمہی رحمتِ دو جہاں ہو یقیناً
تمہی سے ہے سب کا بھرم اللہ اللہ

میں اظہارِ ذکرِ نبیؐ کر رہا ہوں
ہے روشن چراغ حرم اللہ اللہ

غزل

دیکھیں جدھر وہ تم بھی ادھر دیکھتے چلو
ہر اک قدم پہ اُن کی نظر دیکھتے چلو

اہلِ جنوں کے اہلِ خرد بھی ہیں ساتھ ساتھ
منزل کرے گا کون یہ سر دیکھتے چلو

ملتے نہیں ہیں نقشِ قدم تو نہیں سہی
لیکن غبارِ راہ گزر دیکھتے چلو

منزل پہ ہے یقین نہ رہبر پہ اعتماد
کیا ہوگا اب مآلِ بشر دیکھتے چلو

اُن کی طرف سے دعوتِ دیدار عام ہے
اظہار تم بھی ایک نظر دیکھتے چلو

اعجاز رحمانی

پاکستان اور اردو زبان کے عالمی شہرت یافتہ شاعر سید اعجاز علی اعجاز رحمانی سید ایوب علی کے گھر ۱۲رفروری ۱۹۳۶ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔

۱۲رفروری ۱۹۳۶ء یہ تاریخ انہوں نے اپنی قیام گاہ پر بزم قمر جلالوی کے مشاعرے میں خود بتائی ہے۔ اُردو فاضل تک آپ کی تعلیم ہے۔ ''اعجاز مصطفیٰ'' اور ''پہلی کرن آخری روشنی'' آپ کے نعتیہ مجموعے ہیں۔ سلامتی کا سفر (مسدس) کلیات حمد و نعت، کاغذ کے سفینے، غبار انا، جذبوں کی زباں، لہو کا آبشار، اور لباس غزل (کلیات غزل) ہیں جبکہ نعتوں کے مجموعوں پر مبنی ان کی کلیات بھی شائع ہو چکی ہے۔ اسی طرح منظوم سیرۃ النبیؐ، اور سیرۃ صحابہؓ بھی چھپی ہے جبکہ بچوں کی نظموں کا مجموعہ ''کلیاں، چاند، ستارے'' بھی رنگِ ادب پبلی کیشنز کراچی سے شائع کی گئی ہے۔

کراچی کی معروف ادبی تنظیم بزم باغ ادب نے اعجاز رحمانی کی تاج پوشی سحر انصاری، انور جاوید ہاشمی و دیگر کے ہاتھوں کروائی تھی۔ آرٹس کونسل کراچی نے آپ کو اعتراف کمال ایوارڈ پیش کیا۔ ان کی شاعری کی سی ڈیز کی تقریب اور کلیات شاعری کی تقاریب منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ آپ کا موجودہ مسکن کراچی ہے۔ پاکستان کے معروف شاعروں میں ہیں۔ اُن کی نعتوں میں اسلامی تحریک کے مقاصد نمایاں نظر آتے ہیں۔ اعجاز رحمانی غزل کے بھی بہت اچھے شاعر ہیں۔ مگر اُن کی پہچان نعتیہ شاعری ہے۔ خوش فکر، خوش گو اور خوش نوا شاعر ہیں۔ اُن کے متعدد مجموعہ ہائے

کلام شائع ہو کر داد و تحسین وصول کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر عاصی کرنالی "اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر" صفحہ ۴۰۰ پر رقم طراز ہیں:

"اعجاز رحمانی کے اکثر اشعار میں امت کے ان اخلاقی امراض کا ذکر ہے اور ان سیاسی و معاشرتی محرومیوں کا بیان ہے جو مرکز توحید و رسالت سے ہماری وابستگی کمزور پڑنے کی صورت میں ہمیں لاحق ہیں۔ اگر ان کی تمام نعتیہ تخلیقات کا بغور مطالعہ کیا جائے تو وہ ایک منظم سیرت نگار کے طور پر ابھرتے ہیں۔"

نعت

پوچھو نہ فرشتوں سے نہ انسان سے پوچھو
عظمت شہِ ابرارؐ کی قرآن سے پوچھو

ہو دوست کہ دشمن، کوئی تخصیص نہیں ہے
کیا خلقِ نبیؐ ہے، کسی انسان سے پوچھو

کتنا شہِ ابرارؐ کی سیرت پہ عمل ہے
یہ بات ذرا اپنے ہی ایمان سے پوچھو

اے حلقہ بگوشانِ شہِ یثرب و بطحیٰ
کیا لطفِ غلامی ہے، یہ سلطان سے پوچھو

مدحت کا ہے انداز کہ معراج تخیل
عرفانِ پیمبرؐ دلِ حسانؓ سے پوچھو

غزل

بجھ نہ جائے کہیں دل درد کی پُروائی سے
لو لگائی ہے چراغِ شبِ تنہائی سے

جب سے اُترا ہے تری یاد کا سورج گھر میں
دھوپ رخصت نہیں ہوتی مری انگنائی سے

ہر قدم وقت کی رفتار پہ رکھتا ہوں نظر
خوب واقف ہوں میں حالات کی انگڑائی سے

ہم نے اک عمر گزاری ہے بہ ِ شہرِ ستم
آشنا ہم ہیں مذاقِ ستم آرائی سے

کس کے غم نے یہ عطا سوز کیا ہے تجھ کو
پوچھتا کوئی نہیں بات یہ شہنائی سے

پاؤں پڑ جاتی ہے احساس کی زنجیر اعجازؔ
جاؤں تو جاؤں کہاں شہرِ شناسائی سے

افتخار اجمل شاہین

"صوبہ بہار معدنی اور تاریخی اعتبار سے کئی ہزار برسوں پر مشتمل ایک علمی، تہذیبی و ثقافتی ورثہ رکھنے والا صوبہ ہے، یہاں پر کئی ادیان کے پیروکار رہتے ہیں، بدھ مت کے بانی مہاتما گوتم بدھ کی یہ جنم بھومی بھی کہلاتی ہے، اسی صوبہ بہار کے ایک مشہور ضلع مونگیر شیخو پورہ میں ۱۹۴۲ء میں افتخار اجمل پیدا ہوئے۔

افتخار اجمل شاہین نے پٹنہ یونی ورسٹی سے فارسی زبان وادب میں ایم اے کیا۔ برصغیر کی تقسیم کے ناگزیر عمل کی وجہ سے مشرقی پاکستان پہنچے اور مشہور مادر علمی ڈھاکا یونی ورسٹی سے ایم اے اردو ادب کی سند حاصل کی، شعبہ درس و تدریس سے وابستہ ہوئے اور گورنمنٹ کامرس کالج ڈھاکہ میں اردو کے لیکچرار کی حیثیت سے کافی نام کمایا۔

افتخار اجمل شاہین سقوط مشرقی پاکستان کے بعد دوسری ہجرت کر کے پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی آئے، یہاں از سر نو زندگی کا آغاز کیا، سراج الدولہ گورنمنٹ کالج میں اردو کے لیکچرار رہے پھر ڈی۔ جے کالج میں ان کا تبادلہ ہوا جہاں سے مدت ملازمت پوری کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے۔

افتخار اجمل شاہین نے اپنی زندگی کے پچاسویں برس میں شعر و ادب کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ذہنی پختگی اور ادب و زبان کے مطالعے نے اولاً افسانہ نویسی کی طرف مائل کیا رفتہ رفتہ شاعری اور

تنقیدی مضامین کی طرف اپنے رہوار قلم کو موڑا، یوں انہیں ادب کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کے مواقع ملے، "شاعری کا سفر" غزلوں اور "رنگ و بو کا سفر" موضوعاتی شاعری کے مجموعے ہیں۔

غزلیں اور نظمیں کہتے کہتے افتخار اجمل شاہین یکایک نعت نگاری کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "عقیدت کا سفر" ان کا نعتیہ مجموعہ ہے، جس میں ان کے نعتیہ اسلوب کو دیکھا جا سکتا ہے، بہت ممکن ہے کہ ڈاکٹر جمیل عظیم آبادی اور افسر ماہ پوری مرحوم کی رفاقت اور صدیق فتح پوری کے ہاں منعقد ہونے والے نعتیہ مشاعروں نے انہیں بھی نعت نگاری کی طرف مائل کیا ہو۔ مجلس احباب ملت ماہانہ نعتیہ مشاعرے برسوں سے تواتر کے ساتھ جاری تھے جو ایک تاریخی پس منظر کے حامل ہیں۔"

پروفیسر افتخار اجمل شاہین کا کراچی میں انتقال ہوا اور یہیں سپردِ خاک ہیں۔

نعت

شاہین یہ ہوتا چلا آیا ہے ازل سے
رتبہ کوئی ملتا ہے تو بس حسنِ عمل سے

محبوب خدا کی ہے محبت جسے حاصل
ڈرتا نہیں اللہ کا بندہ وہ اجل سے

محروم کرم ہے تو یہ تقصیر ہے تیری
اعمال ہی خالی ہیں ترے نیک عمل سے

کرتے ہی نہیں پیرویٔ احمدؐ مرسل
کرتے ہیں مگر شان سے میلاد کے جلسے

غزل

لکھیں گے روز نئی داستان کاغذ پر
اتار دیں گے یوں ذہنی تھکان کاغذ پر

پھر اس کے بعد ہی پختہ مکان بنتا ہے
بناتی پہلے ہے دنیا مکان کاغذ پر

ہیں نقش کاغذی غالبؔ کے پائیدار بہت
گئے ہیں چھوڑ کر ایسے نشان کاغذ پر

ہمارے حرف کریں گے مکالمہ تم سے
ہم اپنے لفظ کو دیں گے زبان کاغذ پر

زمینِ فکر پہ ان کی بلندیاں دیکھو
اُتار لائے ہیں وہ آسمان کاغذ پر

نجانے کیا لکھا اس نے جواب میں خط کے
لگا ہے کل سے اے شاہیںؔ دھیان کاغذ پر

افتخار عارف

افتخار عارف کا خاندانی نام بھی افتخار عارف ہی ہے۔ افتخار عارف 21/ مارچ 1943ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ مدرسہ نظامیہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان لکھنؤ کالج اور پوسٹ گریجویٹ لکھنؤ یونیورسٹی کیا۔ 1965ء میں افتخار عارف ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ پاکستان آ کر وہ پہلے ریڈیو اور پھر پاکستان ٹیلی ویژن سے وابستہ ہوئے اور بہ حیثیت پروڈیوسر اور اسکرپٹ ایڈیٹر خدمات انجام دیں۔ بعدازاں پاکستان ٹیلی ویژن پر کئی پروگرام بھی پیش کیے۔ جن میں کئی پروگراموں کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔

ریڈیو، ٹیلی ویژن کے بعد وہ ڈائریکٹر جنرل اکادمی ادبیات، پاکستان اور چیئرمین مقتدرہ قومی زبان اور پھر چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان بھی مقرر ہوئے۔

افتخار عارف کی مندرجہ ذیل کتابیں زیورِ طباعت سے نہ صرف آراستہ ہوئیں بلکہ ناقدینِ فن و ہنر، قارئینِ شعر و سخن اور مشاہیرانِ اُردو ادب سے داد و تحسین بھی وصول کی۔ مہر دو نیم، بارھواں کھلاڑی، حرفِ باریاب، جہانِ معلوم، شہرِ علم کے دروازے پر اور کتابِ دل و دنیا۔

"کتابِ دل و دنیا" میں ایک باب "بابِ عقیدت" کے نام سے شاملِ اشاعت کیا گیا ہے۔ جس میں حمد و نعت اور دیگر مذہبی شاعری شامل ہیں۔ یہ باب کسی نعتیہ مجموعے سے کم نہیں ہے۔ کچھ عرصہ قبل جناب افتخار عارف کئی ممالک پر مشتمل کمیٹی کے سربراہ کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے اور ایران میں رہائش پذیر تھے، مگر آج کل سبک دوش ہو کر پاکستان آ گئے ہیں۔

◆◆◆

نعت

مدحتِ شافعِ محشر پہ مقرر رکھا
میرے مالک نے مرے بخت کو یاور رکھا

میں نے خاکِ درِ حسان کو سرمہ جانا
اور ایک ایک سبق نعت کا ازبر رکھا

میں نے قرآن کی تفسیر میں سیرت کو پڑھا
نور کو دائرۂ نور کے اندر رکھا

نورِ مطلق نے اسے خلق کیا خلق سے قبل
منصبِ کارِ رسالت میں مؤخر رکھا

معنیِ اجرِ رسالت کو سمجھنے کے لیے
زیرِ نگرانیِ سلمان و ابوذر رکھا

خاتمیت کا شرف آپ کو بخشا اور پھر
آپ کی دسترسِ خاص میں کوثر رکھا

جس کسی نے بھی کبھی شان میں گستاخی کی
ابد آباد تک اُس شخص کو اَبتر رکھا

تختی لکھی تو اُسی نام سے آغاز کیا
جس کو معبود نے ہر نام سے اوپر رکھا

عمر بھر ٹھوکریں کھاتا نہ پھروں شہر بہ شہر
ایک ہی شہر میں اور ایک ہی در پر رکھا

غزل

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے
میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

یہ روشنی کے تعاقب میں بھاگتا ہوا دن
جو تھک گیا ہے تو اب اس کو مختصر کر دے

ستارۂ سحری ڈوبنے کو آیا ہے
ذرا کوئی مرے سورج کو باخبر کر دے

قبیلہ وار کمانیں کڑکنے والی ہیں
مرے لہو کی گواہی مجھے نڈر کر دے

میں اپنے خواب سے کٹ کر جیوں تو میرا خدا
اجاڑ دے مری مٹی کو در بدر کر دے

مری زمین مرا آخری حوالہ ہے
سو میں رہوں نہ رہوں اس کو بارور کر دے

تاج الشعراء افسر صابری دہلوی

(۱۸۹۰ء.....۱۹۷۰ء)

افسر صابری کا نام محمد اسحاق خان تھا۔ بطور قلمی نام افسر صابری لکھتے تھے نسلاً یوسف زئی افغان تھے۔ بقول محسن اعظم ملیح آبادی، والد کا نام محمد ابراہیم خان تھا۔ ان کا پیشہ تدریس تھا۔ اجداد میں سے محمد تاج خان شاہ عالم بادشاہ کے دورِ حکومت میں سوات سے دہلی آئے اور ایک فوجی رسالے کے افسر مقرر ہوئے۔ ان کی فوجی خدمات کے صلے میں دہلی سے قریب بہادر گڑھ میں دو گاؤں انعام میں ملے تھے۔ ان کی اولاد میں سے افسر صابری کے دادا محمد لعل خان نے دہلی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ افسر صابری کا سنہ ولادت اٹھارہ سو نوے (۱۸۹۰ء) اور سالِ وفات انیس سو ستر (۱۹۷۰ء) ہے ان کا مزار خواجہ اکبر وارثی میرٹھی کی قبر کے احاطے کے سامنے تھا۔ اس قبرستان کا نام میوہ شاہ ہے۔ وہ درس نظامیہ میں فارغ التحصیل تھے۔ قاری و حافظ قرآن بھی تھے۔ فارسی، عربی کی زبان پر عبور تھا۔ فقہ و حدیث، تفسیر، علم کلام میں مہارت تھی۔ دہلی میں فقہ و حدیث اور تفسیر پڑھاتے تھے۔ پاکستان میں آ کر کراچی قرآنی تدریس کا مدرسہ قائم کیا تھا جس میں علم تجوید و قرات اور قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ بڑے اعلیٰ مقرر بھی تھے۔ پاک و ہند کے معتبر علماء میں شمار ہوتا تھا۔ پاک و ہند میں فن شاعری کے خاصے شاگرد تھے اور ہیں۔ پاکستان کے مشہور تلامذہ میں شاہ انصار الٰہ آبادی، نجم الٰہ آبادی، خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی، انور شعور ہیں۔ داغ دہلوی کے جانشین سید وحید الدین بیخود دہلوی کے حقیقی اور مسلم جانشین وہی تھے۔ خواجہ اکبر وارثی میرٹھی کے خلیفہ طریقت اور مفتی ہند مولانا کرامت اللہ خان کے بھی سلسلہ صابری میں خلیفہ تھے۔

افسر صابری متبحر عالم دین اور بلند پایہ قادر الکلام شاعر تھے۔ اپنا اسلوب جدا رکھتے تھے طرز

بیان حکیمانہ وفلسفیانہ تھا۔ ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف ان کے تمام معاصرین کرتے تھے۔ ان کے غزلیہ کلام کے کئی مجموعے تھے جوان کے بڑے فرزند مظہر دہلوی کا بیٹا محفوظ نہ رکھ سکا۔ نعتیہ کلام چھوٹے چھوٹے نعتیہ مجموعوں کی شکل میں چھپ گیا تھا۔ غزلیہ مجموعوں میں افسر غالب۔ افسر غزل تھے۔ نعتیہ کلام کے مختصر مجموعوں کے نام یہ ہیں۔ افسرِ انبیا۔ افسرِ عالم، افسرِ جلیل، افسرِ حجاز، افسر عظیم ،نظم کا مختصر مجموعہ پیغام عمل المعروف یادگار قائد اعظم ہے۔ ان کی نعتیہ نظموں اور نعتوں اور نثری مواد کی شکل میں ایک کتاب جو سیرت وشمائل پر مشتمل ہے۔ اس کا نام ''تابشِ افسر'' ہے جس کا تاریخی نام ظہور انور ہے یہ نام تاریخی ہے سنہ ہجری کے اعتبار سے تیرہ سو اڑسٹھ ۱۳۶۸ھ اور عیسوی لحاظ سے سنہ انیس سو اڑتالیس ۱۹۴۸ء ہے۔ یہ کتاب بڑے سائز کے دو سو اڑسٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ جولائی انیس سو اڑتالیس میں چھپ گئی تھی لیکن بازار میں اپریل سنہ انیس سو انچاس میں آئی۔ پاکستان میں نثر اور نعتیہ کلام کی یہ سب سے پہلی کتاب ہے جسے غیر محتاط اور تحقیق سے بے بہرہ تذکرہ نگاروں نے بیان نہیں کیا ہے۔ ان کی ایک مختصر کتاب جو نظم ونثر پر مشتمل ہے۔ اس کا نام میلادِ افسر ہے۔ تنقیدی اعتبار سے بیسویں صدی کے وہ مستند ترین شاعر تھے۔ زبان وبیان پر ان کی گرفت نہایت مضبوط تھی۔ فنی اعتبار سے ان کا کلام سند کا درجہ رکھتا ہے نکات شاعری اور عروض کے بھی جید عالم تھے۔ ان کی غزلیات میں سادگی وشگفتگی کے ساتھ بلا کی روانی تھی۔ خاصا کلام ایسا بھی ہے جو نہایت فکر انگیز اور معنی آفرینی کا آئینہ دار ہے۔ ان کی غزلوں کا سرمایہ محفوظ نہ رہنے کے سبب کوئی مکمل غزل دستیاب نہیں ہو سکی۔ ان کے تلامذہ کو جو اشعار یاد ہیں ان میں سے بطور امثلہ دیے گئے ہیں ان کے معاملات وکوائف کی تحقیق ان کے شاگرد رشید خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی سے کی گئی ہے جو اردو شاعری کی چار سو سالہ تاریخ میں رباعی کے ممتاز ترین اور سب سے زیادہ رباعیات کہنے والے شاعر ہیں جو ایک معتبر محقق اور ممتاز نقاد بھی ہیں۔

(میں خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی کا ممنون ہوں جن کے تعاون سے یہ خاکہ بذریعہ یوسف راہی چاٹگامی راقم تک آیا اور بغیر کسی ترمیم واضافہ کے اس کتاب میں شامل کیا جارہا ہے۔)

◆◆◆

نعت

اے ہاشمی و مطلبی احمدِ مُرسل
مکّی مدنی و عربی احمد مُرسل

کیا شان ہے عالی نسبی احمد مُرسل
والا حسبی بو العجبی احمد مُرسل

تم علم لدنی کے ہوئے عالم اعظم
کیا بات ہے اُمّی لقبی احمد مُرسل

میثاقِ نبیین سے یہ بات ہے ثابت
ہیں آپؐ نبیوں کے نبی احمد مُرسل

اتنی ہے تمنا در دولت پہ بلالو
کس کو ہے یہاں زر طلبی احمد مُرسل

ہے ختم نبوت بھی رسالت بھی تمہی پر
آخر ہو نبی عربی احمد مُرسل

ہے عرضِ رسا افسر ناچیز تمہارا
پیدا ہو کمال ادبی احمد مُرسل

غزلوں کے اشعار

مجھ کو آواز دے رہے ہو تم
میں انا کے ابھی غبار میں ہوں

☆

پہلے دل اپنا شیشہ گر کرنا
پھر محبت کا تم سفر کرنا

☆

ہمارے سامنے بننا سنورنا
ہمیں سمجھے ہوئے ہو آئینہ کیا

☆

ساز چھیڑو نہ تم محبت کا
ورنہ پھر ہوش میں نہ آؤ گے

☆

آپ نے بھی کبھی یہ سوچا ہے
زندگی صرف ایک صحرا ہے

☆

اپنا عرفان ہوگیا مجھ کو
آج میں اپنی روشنی میں ہوں

☆

چاک دامن کبھی سیا ہی نہیں
آدمیت سے تو جیا ہی نہیں

☆

خود کو بھی کرلیا تلاش افسر
زندگی میری اک سمندر ہے

افسر ماہ پوری

(۱۹۱۸ء......۱۹۹۵ء)

معروف ادیب، نقاد، شاعر اور استاد پروفیسر نظیر صدیقی (متوفی اسلام آباد) کے آبائی ہم وطن یکم دسمبر ۱۹۱۸ء کو ماہ پور چھپرا (بہار) میں ظہیر عالم صدیقی پیدا ہوئے جنھیں شعر و ادب کی دنیا میں افسر ماہ پوری کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ کلکتہ یونی ورسٹی سے میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۳۶ء میں سرکاری ملازمت اختیار کی۔ مشرقی پاکستان کے مرکزی سکریٹریٹ میں آپ کی تقرری خاصا عرصہ رہی آپ کو اردو کے ساتھ بنگلہ اور انگریزی زبان میں بھی لکھنے پڑھنے پر عبور حاصل رہا۔ انقلابی شاعر "قاضی نذرالاسلام" کی ۲۵ بنگلہ نظموں کا ترجمہ "جامِ کوثر" کے عنوان سے کیا۔ شاعری اور افسانہ نگاری کے حوالے سے لاہور کے جرائد "ادبِ لطیف، عالمگیر" اور ماہنامہ "نئی قدریں" (حیدرآباد سندھ) میں آپ کے افسانے شائع ہوئے۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی، کامل رزاقی، اور افسر ماہ پوری نے مشرقی پاکستان میں اردو زبان و ادب کے لیے ادبی انجمنوں کی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔

افسر ماہ پوری نے مولانا کامل رزاقی مرحوم کی کتاب "بدرِ کامل" پر خوبصورت انداز میں مقدمہ تحریر کر کے محبت اور انسان دوستی کی مثال قائم کی ہے۔ اس تذکرے کے آغاز میں پروفیسر نظیر صدیقی کا حوالہ اس لیے دیا گیا کہ مشفق خواجہ مرحوم نے ان کے نام لکھے ہوئے مکاتیب میں جنھیں خواجہ عبدالرحمٰن فاروقی (برادر خورد مشفق خواجہ) نے مرتب کر کے چھپوایا ایک خط میں لکھا کہ "شام کو ٹہلتے ہوئے غالب لائبریری چلا جاتا ہوں، جہاں پاشا رحمان اور افسر ماہ پوری ملتے ہیں"۔

کراچی آنے کے بعد افسر ماہ پوری نے مشرقی پاکستان سے ہجرت کر کے آنے والے شعراء

کے مجموعوں پر تقاریظ، مقدمات، اور پیش لفظ لکھے۔ ڈاکٹر جمیل عظیم آبادی کی ''مجلسِ احبابِ ملت'' اور سطوت میرٹھی کی ''بزمِ ندرت'' کے مشاعروں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے۔ غزلوں کا مجموعہ ''غبارِ ماہ'' اور نظموں کا مجموعہ ''نگارِ ماہ'' اور نعتوں کا مجموعہ ''حرا سے طور تک'' اردو ادب کے قارئین کو آپ کی یاد دلاتے رہیں گے۔

۱۵ر فروری ۱۹۹۵ء کو افسر ماہ پوری کا انتقال ہوا۔ آخری آرام گاہ کراچی میں بنی۔

افسر ماہ پوری مرحوم کی تمام تر علمی و ادبی خدمات ہمارے سامنے ہیں۔ جس کا کوئی گوشہ پردۂ اخفاء میں نہیں۔ پاکستان کے صاحبانِ علم و ادب نے ان کی خدمات کو سراہا اور انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ ''مجلسِ احبابِ ملت'' ناتھ کراچی جو کم و بیش ۱۹۸۰ء سے فروغ نعت و ادب میں فعال رہی جس کے تحت شائع ہونے والے نعتیہ مجلّے ''انوارِ حرم'' کے کم و بیش انیس شمارے سید صبیح رحمانی کے نعت ریسرچ سینٹر میں محفوظ ہیں۔ اس حوالے سے بھی افسر ماہ پوری کی خدمات قرطاسِ تاریخ پر تازہ ہیں۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر شہزاد احمد کی نگاہ تحقیق افسر ماہ پوری کی شخصیت پر نہیں پڑی اور وہ کسی حوالے سے بھی ''اردو نعت پاکستان میں'' شامل نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر شہزاد کے ہاں یہی احوال ''مجلسِ احباب ملت'' اور اس کے تحت شائع ہونے والے نعتیہ مجلّے ''انوارِ حرم'' کا ہے۔ ڈاکٹر شہزاد احمد کے ہاں عموماً بڑی چیزیں بہت چھوٹی اور چھوٹی چیزیں بہت بڑی نظر آتی ہیں۔

نعت

ثنا ہم اِس قدر لکھیں، درود ہم اِس قدر لکھیں
قلم جب تھک کے رُک جائے تو ہم باچشمِ تر لکھیں

شبِ اسرا مہ و انجم کی ہر سُو نور افشانی
زمیں سے آسماں تک ہم اُجالوں کا سفر لکھیں

نبیؐ کی ذاتِ اطہر، شاہ کارِ آدمیت ہے
ادب سے کیوں نہ اُن کو حاصلِ آئینہ گر لکھیں

نبیؐ کے ہر عمل کو رہنمائے زندگی سمجھیں
جہاں ٹھہریں رہِ طیبہ میں اُس کو اپنا گھر لکھیں

پڑھیں، پڑھتے رہیں نامِ نبیؐ جب تک ہے دم اخترؔ
قلم جب تک چلے، ہم مدحتِ خیرالبشرؐ لکھیں

غزل

کیا بتائیں حالِ دل ان کی شناسائی کے بعد
حبس بڑھتا ہی چلا جاتا ہے پُروائی کے بعد

ایک مدت پر، خیال ان کا کہاں سے آ گیا
کتنی اچھی انجمن لگتی ہے تنہائی کے بعد

جب نظر آیا نہ ساحل ان کی چشمِ ناز میں
کیا دکھائی دے گا وہ دریا کی گہرائی کے بعد

دربدر کی ٹھوکریں کھائیں محبت میں تو کیا
ہو گئے ہم محترم، کچھ اور رسوائی کے بعد

ہم کہاں ہوں گے، نہ جانے اس تماشا گاہ میں
کس تماشائی سے پہلے، کس تماشائی کے بعد

اُن کے بارے میں فقط اتنا ہمیں معلوم ہے
اب وہ رہتے ہیں ہمارے دل کی انگنائی کے بعد

خوب ہے افسر ہمیں اپنی حقیقت کی خبر
کیا ہمارا نالۂ دل ، ان کی شہنائی کے بعد

افضل منہاس

(۱۹۲۲ـ۱۹۹۷)

وزیر احمد ضلع چکوال کے ایک گاؤں قریہ میں منہاس قومیت لے کر ۲۳/ جون ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے ۔ان کی تمام تعلیم و تربیت قیام پاکستان سے پہلے مکمل ہو چکی تھی، قیام پاکستان کے وقت آپ کی عمر ۲۵ سال تھی ۔یہ عمر انسان میں دنیا برتنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔

وزیر احمد ادبی دنیا میں افضل منہاس کے نام سے جانے جاتے ہیں، شعری دنیا میں غالباً ۱۹۴۲ء میں آئے ۔راولپنڈی سے روزنامہ "تعمیر" کا آغاز ہوا تو کچھ دنوں کے بعد اسی روزنامے کے شعبۂ اشتہارات سے آپ کی وابستگی ہو گئی جو برسوں رہی۔

افضل منہاس کی غزلیہ شاعری میں ان تمام چیزوں کی جھلک ملتی ہے جس سے زندگی میں زندہ رہنے کا تاثر ملتا ہے ۔غزلوں کا پہلا مجموعہ "روشنی کے زخم" ان کی زندگی میں چھپا اور ادبی حلقوں میں اسے پڑھا گیا ۔اس کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے ،ان کی ایک کتاب "آبگینے میں سورج" واقعۂ کربلا پر طویل ترین نظم کا پہلا حصہ منظر عام پر آیا۔

افضل منہاس کا نعتیہ مجموعہ "گل مراد" کے خوبصورت نام سے شائع ہوا جو اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے ان کے وسیع تعلق کو ظاہر کرتا ہے اور دل کی تمام خواہشوں کے ذریعۂ اظہار کو سامنے لاتا ہے۔

محبت و عقیدت کے شاعر نے ۱۵/ جنوری ۱۹۹۷ء کو راولپنڈی میں خالق حقیقی سے ناتا جوڑا اللہ تعالیٰ ان کے لئے درِ عافیت کو وا کرے۔

◆◆◆

نعت

مرے قلم کو زباں دے گئی ہے نعتِ رسولؐ
زباں کو حسنِ بیاں دے گئی ہے نعتِ رسولؐ

میں ایک تنکا تھا رہتا تھا سب کے قدموں میں
مجھے بھی تاب وتواں دے گئی ہے نعتِ رسولؐ

ہر ایک لفظ سے دھڑکن کا نور پھیل گیا
کہ پتھروں کو بھی جاں دے گئی ہے نعتِ رسولؐ

بھٹک رہا تھا کہ منزل کا کچھ پتا ہی نہ تھا
اب اس کا مجھ کو نشاں دے گئی ہے نعتِ رسولؐ

عجب نہیں کہ عطا ہو مجھے نگاہِ بلند
کہ آج سرِ عیاں دے گئی ہے نعتِ رسولؐ

طلب تھی جس کی خزانہ وہ مل گیا افضلؔ
کہوں نہ کیسے کہ ہاں دے گئی ہے نعتِ رسولؐ

غزل

کرب کے شہر سے نکلے تو یہ منظر دیکھا
ہم کو لوگوں نے بلایا ہمیں چھو کر دیکھا

سوچ کا پیڑ جواں ہو کے بنا ایسا رفیق
ذہن کے قد نے اسے اپنے برابر دیکھا

جب بھی چاہا ہے کہ ملبوسِ وفا کو چھو لیں
مثلِ خوشبو کوئی اڑتا ہوا پیکر دیکھا

رقص کرتے ہوئے لمحوں کی زباں گنگ ہوئی
اپنے سینے میں جو اترا ہوا خنجر دیکھا

زندگی اتنی پریشاں ہے یہ سوچا بھی نہ تھا
اس کے اطراف میں شعلوں کا سمندر دیکھا

رات بھر خوف سے چیخے تھے سحر کی خاطر
صبح دم خود کو بکھرتے ہوئے در پر دیکھا

وہ جو اڑتی ہے سدا دشتِ وفا میں افضلؔ
اسی مٹی میں نہاں درد کا گوہر دیکھا

اقبال صفی پوری

(۱۹۱۶ء۔۱۹۹۹)

۲۲ مئی ۱۹۹۹ء کو اقبال صفی پوری کا انتقال کراچی میں ہوا تھا۔ ان کا اصلی نام اقبال احمد خلیل تھا۔ ضلع اناؤ اتر پردیش کے قصبے صفی پور میں ۱۹۱۶ء میں پیدا ہونے والے شاعر کا شعری سفر صوفیانہ وادبیانہ ماحول کی دین ہے۔ ان کے والد شاہ خلیل احمد ولد شاہ جمیل خلیلی خدا رسیدہ بزرگ صوفی منش انسان تھے۔

اقبال صفی پوری کے نانا عزیز صفی پوری فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے جنہیں ان کے ہم عصروں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

۱۹۴۷ء میں اکتیس برس کی عمر میں پاکستان آئے۔ بلدیہ کراچی میں افسر رابطہ وتعلقات عامہ رہے۔ کراچی میں نعتیہ محفلوں اور مذہبی تقریبات کا ذوق وشوق سے اہتمام کیا۔ بہزاد لکھنوی، ماہر القادری، اسعد شاہجہاں پوری، اور نیر مدنی کے بعد اقبال صفی پوری کو کراچی کے نعت نگار شاعر کا درجہ ملا۔ آپ جگر مراد آبادی کے تلامذہ میں شامل رہے۔

آپ کا ایک شعری مجموعہ ''رحمت لقب'' نعت کے جملہ لوازمات سے مزین ہے، اور ایک طالب صادق کی سحر انگیز فکر کا آئینہ دار بھی۔ جبکہ ''رنگ ونور'' اور ''شاخ گل'' نامی دو غزلوں اور نظموں کے مجموعے بھی چھپ چکے ہیں۔ کراچی کے مرحوم شعراء میں ان کو اہم مقام دیا گیا ہے۔ اقبال صفی پوری پاپوش نگر کے قبرستان میں دفن کیے گئے۔

◆◆◆

نعت

حسرت ہے کہ انوارِ سلطانِ اُمم دیکھیں
آنکھیں بھی تو ہوں ایسی جن آنکھوں سے ہم دیکھیں

اِک بار جو وہ روضہ بادیدۂ نم دیکھیں
دنیا کی بہاروں کو مڑ کر بھی نہ ہم دیکھیں

اس دل کے فدا جس میں جلوے ہوں مدینے کے
قربان اُن آنکھوں کے جو سوئے حرم دیکھیں

ہر نقش ہی روضے کا جنّت کا نظارہ ہے
کس نقش کو ہم چومیں کس نقش کو ہم دیکھیں

ہم چھوڑ کے در اُن کا برباد ہوئے کیا کیا
اس در سے لپٹ جائیں پھر اُن کے کرم دیکھیں

یہ عالمِ رخصت بھی کیا عالمِ حسرت ہے
مڑ مڑ کے ہم اس در کو اِک ایک قدم دیکھیں

اقبالؔ کہاں گم ہیں یہ اہلِ قلم آئیں
مدحتِ شہِ دیں لکھیں اعجازِ قلم دیکھیں

نعت

کعبے سے اٹھیں جھوم کے رحمت کی گھٹائیں
مقبول ہوئیں تشنہ نصیبوں کی دعائیں

اک مہر جہاں تاب اُبھرتا ہے حرم سے
اب جھوٹے خدا اپنے چراغوں کو بجھائیں

اُس در کے غلاموں کی ہے اُفتاد فقیری
راس آتی ہیں اُن کو نہ عبائیں، نہ قبائیں

ہم حلقہ بگوشانِ درِ مصطفویؐ ہیں
ہم اور کسی در پہ جبیں کیسے جھکائیں

میں عازمِ طیبہ ہوں مجھے کوئی نہ روکے
کہہ دو کہ حوادث مرے رستے میں نہ آئیں

بس خاکِ کفِ پائے محمدؐ کی طلب ہے
اقبالؔ کا مقصود دوائیں نہ دعائیں

غزل

مانا کہ زندگی سے ہمیں کچھ ملا بھی ہے
اس زندگی کو ہم نے بہت کچھ دیا بھی ہے

محسوس ہو رہا ہے کہ تنہا نہیں ہوں میں
شاید کہیں قریب کوئی دوسرا بھی ہے

قاتل نے کس صفائی سے دھوئی ہے آستیں
اس کو خبر نہیں کہ لہو بولتا بھی ہے

غرقاب کردیا تھا ہمیں ناخدا نے آج
وہ تو کہو کہ ایک ہمارا خدا بھی ہے

ہو تو رہی ہے کوشش آرائشِ چمن
لیکن چمن غریب میں اب کچھ رہا بھی ہے

اے قافلے کے لوگو! ذرا جاگتے رہو
سنتے ہیں قافلے میں کوئی رہنما بھی ہے

اقبالؔ شکر بھیجو کہ تم دیدہ ور نہیں
دیدہ وروں کو آج کوئی پوچھتا بھی ہے

امجد اسلام امجد

امجد اسلام امجد ۴ راگست ۱۹۴۴ء کو لاہور میں پیدا ہوئے اور وہیں ایم اے تک تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے درس وتدریس کا مقدس پیشہ اختیار کیا اور پھر پاکستان نیشنل سینٹر لاہور سے وابستہ ہو گئے۔

امجد اسلام امجد کو شاعری کے علاوہ تنقید اور ڈرامے سے بھی لگاؤ رہا۔ ان کے مجموعہ ہائے کلام ''برزخ''۔ ''عکس'' اور ''ساتواں در'' کے نام سے شائع ہو کر علمی وادبی حلقوں میں قبولیت حاصل کر چکے ہیں اور امجد اسلام امجد کا نام ادبی حلقوں میں مستند حوالہ ہے۔ جہاں جہاں اردو زبان بولی لکھی پڑھی اور سمجھی جاتی ہے وہاں امجد اسلام امجد کو جانا اور پہچانا جاتا ہے۔

امجد اسلام امجد کی شاعری اپنے دامن جدید اسلوب اور رنگارنگ مضامین سے مزین ہے۔ امجد نے کچھ نظموں کے تراجم بھی کیے ہیں جو ''کالے لوگوں کی روشن نظمیں'' کے عنوان سے شائع ہوئے۔

امجد اسلام کا تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''نئے پرانے'' اور ٹی وی ڈراموں کا انتخاب ''خواب جاگتے ہیں'' کے نام سے شائع ہوئے۔ امجد اسلام امجد نے ایسا پرتاثیر ڈرامہ ''وارث'' بھی تحریر کیا جس نے پورے پاکستان کے ماحول کو اپنے سحر میں لیے ہوا تھا۔ جس دن یہ ڈرامہ پی ٹی وی سے ٹیلی کاسٹ ہوتا تھا گلیوں اور بازاروں میں سناٹے کا عالم ہوتا تھا۔

امجد اسلام امجد کا نعتیہ مجموعہ ''اسباب'' میں انہوں نے جو رسول اکرم کو ہدیہ عقیدت پیش کیا ہے اس میں بھی اپنے شاعری کے منفرد انداز کو برتا ہے اور ایسے نعتیہ مجموعے کم ہی نظر آتے ہیں۔ قارئین کرام ان کی اس نعت سے اندازہ لگا سکتے ہیں۔

امجد اسلام امجد کے دو کلیات شائع ہو کر اہل ادب کے ہاتھوں میں آئے۔ غزلوں کی کلیات ''ہم اُس کے ہیں'' اور نظموں کی کلیات ''میرے بھی ہیں کچھ خواب'' کے نام سے شائع ہوئیں۔

◆◆◆

نعت

روضے کی جالیوں کا نظارا عجیب ہے
کن رفعتوں پہ آج ہمارا نصیب ہے

اب اس سے بڑھ کے اور کیا مانگیں خدا سے ہم
محبوبؐ ہے جو اس کا ہمارا حبیبؐ ہے

لگتا ہے صحنِ مسجدِ نبویؐ میں بیٹھ کر
آنکھوں کا چین، دل کا سہارا قریب ہے

مکّے میں، انؐ کے شہر میں 'طائف میں دیکھئے
یہ سلسلہ تو سارے کا سارا عجیب ہے

کرتی ہیں اُن کی رحمتیں زائر کی دیکھ بھال
ہر ہر قدم پہ کوئی اشارا حبیب ہے

محفوظ ہر مرض سے رہیں اور تندرست
دیکھو تو آ کے کون ہمارا طبیب ہے

چاہو تو اس کو چھو بھی لو امجدؔ بڑھا کے ہاتھ
اتنا یہاں ہر ایک ستارا قریب ہے

غزل

حقیقت کے نگر میں جاگتے لمحوں میں پھیلے گا
مرا خواب تمنا ایک دن رستوں میں پھیلے گا

کبھی آواز کا صحرا! کبھی راتوں کا سناٹا
پرندوں کی صدا بن کر مری صبحوں میں پھیلے گا

محبت رنگ ہے ایسا کہ روکے سے نہیں رکتا
کبھی پھولوں سے نکھرے گا کبھی تاروں میں پھیلے گا

دما دم نت نئی سی کہکشائیں بنتی جاتی ہیں
وہ اک لمحہ نہ جانے کس قدر قرنوں میں پھیلے گا

یہی لمحہ وفا کا جو ہمارے بیچ ٹھہرا ہے
اسے محفوظ کرلیں تو کئی صدیوں میں پھیلے گا

میں ہٹ جاؤں گا منظر سے مگر امجد مرا جوہر
دھنک میں سانس لے گا ان نئے رنگوں میں پھیلے گا

امداد نظامی

(۱۹۳۵ـ۲۰۰۸)

شاعر و ادیب، دانشور، سخن شناس، براڈ کاسٹر اور صحافی امداد نظامی قیامِ پاکستان سے ٹھیک بارہ سال پہلے یعنی ۱۴/ اگست ۱۹۳۵ء کو محمد شفیع فریدی (سرائیکی شاعر، متوفی ۱۹۸۰ء کراچی) کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ مٹھن کوٹ ضلع راجن پور پنجاب میں سرائیکی کے مشہور صوفی شاعر خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ جن کا اصلی نام خورشید عالم ہے کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور نسلاً فاروقی ہیں، آپ کے دادا میاں برکت دو ہے کے شاعر تھے، ابتدائی تعلیم والد سے حاصل کی۔ عملی زندگی طالب علمی کے زمانے سے ہی شروع ہو گئی تھی، اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بحری کسٹم میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہوئے، پھر صحافت کا شعبہ اختیار کیا، 1953ء میں براڈ کاسٹر بنے، انہی ایام میں جز وقتی اخبار نویسی کو اختیار کیا، زندگی کے ۳۴ سال کوئٹہ بلوچستان میں گزارے۔ آپ کے ایک بھائی انوار فریدی بھی شاعر و ادیب ہیں، نیز ایک بہن حسینہ فریدی بھی اردو پنجابی کی شاعرہ اور افسانہ نگار تھیں۔

حکومتِ پاکستان سے تمغۂ امتیاز اور نشانِ سپاس حاصل کرنے والے امداد نظامی کا سفرِ نعت پچاس سال یعنی آدھی صدی پر محیط ہے، بقول ان کے ''انہوں نے پہلی نعت ۱۹۵۶ء میں کہی''۔ انہوں نے مسدس میں ایک نعتیہ مجموعہ بنام ''عین النعیم'' اردو ادب کو پیش کیا، ۲۰۰۰ء میں رضا پبلی کیشنز لاہور سے شائع ہونے والی ''عین النعیم'' امام احمد رضا خان فاضلِ بریلوی رحمۃ اللہ علیہ سے موسوم ہے۔

''عین النعیم'' اس وجہ سے اپنے طرز کی منفرد کتاب ہے کہ اس میں شاعر نے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے ایک سو انیس اسمائے مبارکہ کو منظوم اور انفرادی مفاہیم میں پیش کیا ہے شاعر کی تمام عمر کی شعری ریاضت، اپنی علمی، مشاہداتی، اور تجزیاتی رعنائیوں اور فکری و فنی خوبیوں کے ساتھ ''عین النعیم'' میں موجود ہے۔

۱۴/ اپریل ۲۰۰۸ء کو لاہور میں انہوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا اور سرزمینِ لاہور میں آسودۂ خاک ہوئے۔

◆◆◆

نعت

اس کو میں انساں کہوں یا پرتوِ یزداں کہوں
حاملِ قرآن ہے لیکن سربسر قرآں کہوں

وہ کہ جس کا پیکرِ انوار ہے عین النعیم
ہر نظر کو اس کے اک فیضان کا عنواں کہوں

جس کے فیضانِ ہدایت سے کھلی راہِ نجات
اُس سراپا رشد کو سرچشمۂ عرفاں کہوں

زندگی نے جس سے پائی زندگی کی آب و تاب
کیوں نہ اُس کو صدقِ دل سے محسنِ انساں کہوں

جس کے ساحل کے خزف ہیں مجھ کو سامانِ حیات
اُس کے فیضانِ کرم کو بحرِ بے پایاں کہوں

غزل

شیرازۂ غم زیست کا برہم ہے تو کیوں ہے
اک عمر سے دل کا یہی عالم ہے تو کیوں ہے

ہاں لُٹ تو گیا نشۂ احساسِ طرب تک
رندوں میں مگر پہلا سا دم خم ہے تو کیوں ہے

اے اہلِ خرد ہم تو نہ تھے صاحبِ اظہار
ہر لفظ تمہارا بھی جو مبہم ہے تو کیوں ہے

سنتے ہیں کہ تقسیمِ طرب کا ہے یہ موسم
پھر شہر میں یہ گریہ و ماتم ہے تو کیوں ہے

ہے تازگیِ زیست کی خوشبو تو ہوا میں
ہر دم مگر افسردہ وہ بیدم ہے تو کیوں ہے

اُمید فاضلی

(۱۹۲۳ـ۲۰۰۵)

محمد ارشاد ۷ رنومبر ۱۹۲۳ء کو ڈبائی ضلع بلند شہر (بھارت) میں پیدا ہوئے تھے۔ گھریلو ماحول ادبی تھا جس کی وجہ سے کم سنی ہی میں شعر گوئی کی طرف مائل ہو گئے۔ ۹ رسال کی عمر میں پہلی غزل کہی۔

اُستاد ذُکا ڈبائیوی اُن کے چچا تھے۔ اُن سے اصلاح لینے لگے۔ بعدازاں اُس عہد کے نامور اُستاد شاعر نوح ناروی کی شاگردی اختیار کرلی، اور اُن سے شاعرانہ رموز سیکھے۔ شعر گوئی کی مشق تمام عمر جاری رکھی۔ تمام اصناف شعری غزل، نظم، نغمات، مراثی اور مناقب وسلام جیسے کلام پر توجہ مرکوز رکھی، اُمید ڈبائیوی کو جب احساس ہوا کہ ''ڈب ڈبائیو'' قسم کی آوازوں سے نام بگڑ جاتا ہے تو اُنھوں نے اپنا خاندانی نام ''اُمید فاضلی'' استعمال کرنا شروع کردیا۔ اُمید فاضلی نے علی گڑھ یونی ورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ وہاں علمی و ادبی ماحول سے اُن کی شعر گوئی کے ذوق کو جلا ملی، کچھ عرصے ماہ نامہ ''الفاظ'' کے مدیر اعلیٰ کے فرائض بھی ادا کیے۔ اُن کا پہلا مجموعہ ''دریا آخر دریا ہے'' ۱۹۷۹ء میں شائع ہوا، جسے اُن کے تیکھے لہجے کی بنا پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ عروس البلاد کراچی کے بڑے بڑے مشاعروں کے انعقاد اور اُن کی کام یابی کے لیے اُمید فاضلی کا نام مستند تھا، اگرچہ اُمید فاضلی نے آخری برسوں میں محفلوں سے کنارہ کشی اختیار کرلی تھی۔ تاہم شعر و ادب کی رفتار سے وہ باخبر رہتے تھے۔ سرنیوا مرثیے اور مناقب، اور قومی نغمات کا مجموعہ پاکستان زندہ باد کے علاوہ نعتیہ مجموعہ ''مرے آقا'' (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو بھی ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ملی اور اس مجموعے پر اُنھیں قومی ایوارڈ بھی ملا۔

محمد ارشاد اُمید فاضلی کی نعتوں میں سرشاری اور شگفتگی کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ زبان و بیان پر اُنھیں مکمل عبور تھا۔ موصوف کا دوسرا نعتیہ مجموعہ ''تب و تابِ جاوداں'' بھی منظرِ عام پر آچکا ہے۔ ۲۸ ستمبر ۲۰۰۵ء کو ۸۲ برس کی عمر میں اُن کا کراچی میں انتقال ہوا۔ سخی حسن قبرستان اُن کی آخری آرام گاہ ہے۔

◆◆◆

نعت

خرد سے کہہ دو کہ حبِ رسولؐ سے پہلے
سمجھ میں آ نہ سکے گا کہ کبریا کیا ہے

تمام رنگِ عبارت اسی خیال سے ہیں
یہ اک خیال نہ ہو تو وجود صحرا ہے

اثر کو حرفِ دعا کا ہے انتظار یہاں
جو مانگیے تو درِ مصطفیؐ سے ملتا ہے

جو دیکھ پاتے انہیںؐ ہم تو حال کیا ہوتا
نہ دیکھنے پہ یہ عالم کہ جیسے دیکھا ہے

کلامِ پاک کی آیات میں پسِ الفاظ
ہمیں حضورؐ کا چہرہ دکھائی دیتا ہے

نظر کو حسن، خرد کو شعور، دل کو سکوں
بقدرِ ظرف اسی آستاں سے ملتا ہے

غزل

سنگ جب آئینہ دکھاتا ہے
تیشہ کیا کیا، نظر چُراتا ہے

سلسلہ پیاس کا بڑھاتا ہے
پیاس دریا کہاں بجھاتا ہے

ریگزاروں میں جیسے تپتی دھوپ
یوں بھی اس کا خیال آتا ہے

سُن رہا ہوں خرام عمر کی چاپ
نقش آواز بنتا جاتا ہے

وہ بھی کیا شخص ہے کہ پاس آکر
فاصلے دور تک بچھاتا ہے

گھر تو ایسا کہاں تھا لیکن اب
در بدر ہیں تو یاد آتا ہے

انجم رومانی

(۱۹۲۰_۲۰۰۱)

ریاست مالیر کوٹلہ (مشرقی پنجاب) میں انجم رومانی ۲۸/ ستمبر ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے تھے۔
پنجاب یونی ورسٹی سے ریاضیات میں ایم اے کیا۔ قیام پاکستان کے بعد مستقل قیام لاہور ہی میں رکھا، رام دیال سنگھ کالج میں شعبہ ریاضی کے مضامین پڑھاتے رہے، ترقی پسند تحریک کے زمانے میں انجم رومانی نے میراجی کے روایتی مکتبہ فکر سے خود کو منسلک کیا اور حلقہ ارباب ذوق کے چنیدہ اہل قلم میں شامل ہو گئے۔ یوسف ظفر، میراجی، قیوم نظر، اعجاز حسین بٹالوی اور شہرت بخاری وغیرہ کے ساتھ مل کر حلقہ ارباب ذوق کی فکری و ادبی ترقی کے لیے عملی طور پر سرگرم رہے۔

غزل اور نظم کے ساتھ ہی نعتیہ اظہار میں بھی ان کی مشاقی کو سراہا جاتا ہے ایک قادر الکلام شاعر کے طور پر پاکستان کے تمام مایہ ناز نقادانِ ادب نے ان کی شخصیت و فن پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

''کوئے ملامت'' (۱۹۸۳ء) میں شائع ہوئی ''پس انداز'' ''دنیا کے کنارے'' اور ''کلیات انجم رومانی'' (مرتبہ یاسمین انجم) میں اُن کی عمر بھر کی تخلیقی کاوشیں موجود ہیں۔

فضل دین جو ادبی دنیا میں انجم رومانی کہلاتے رہے۔ ۱۳/ اپریل ۲۰۰۱ء کو ادبی دنیا کو نعتیہ مجموعہ ''ثناء اور طرح کی'' دے کر دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔

◆◆◆

نعت

بے یار و مددگار و بے برگ و نوا تنہا
دنیا پہ ہوا حاوی اِک شخص کہ تھا تنہا

سنگی نہ کوئی ساتھی دنیا صفِ اعداء تھی
سر کف پہ لئے نکلا اک مردِ خدا تنہا

تنہا اُسے دیکھا ہے اے غارِ حرا تو نے
پایا ہے اُسے تو نے اے کوہِ صفا تنہا

کفار کے گھیرے میں اغیار کے ڈیرے میں
جمعیتِ خاطر تھا اِک نامِ خدا تنہا

واں قتل کی سازش تھی یاں سب پہ نوازش تھی
واں تیغ و سناں کیا کیا یاں صدق و صفا تنہا

پیغام لئے پہنچا اسلام لئے پہنچا
دنیا کے بیاباں میں اِک آبلہ پا تنہا

پہچان نہیں ممکن اللہ کی اب تجھ بن
ہے قبلہ نما یعنی تو صلی علیٰ تنہا

غزل

ہر چند انہیں عہد فراموش نہ ہوگا
لیکن ہمیں اس وقت کوئی ہوش نہ ہوگا

دیکھو گے تو آئے گی تمہیں اپنی وفا یاد
خاموش جسے پاؤ گے خاموش نہ ہوگا

گزرے ہیں وہ لمحے کہ سدا یاد رہیں گے
دیکھا ہے وہ عالم کہ فراموش نہ ہوگا

ہم اپنی شکستوں سے ہیں جس طرح بغل گیر
یوں قبر سے بھی کوئی ہم آغوش نہ ہوگا

پی جاتے ہیں زہر غم ہستی ہو کہ مے ہو
ہم سا بھی زمانے میں بلا نوش نہ ہوگا

ہونے کو تو دنیا میں کئی پردہ نشیں ہیں
لیکن تری صورت کوئی روپوش نہ ہوگا

انجمؔ نیازی

شہر میاں والی کو سلطان علی نے آباد کیا تھا جو محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان سے آئے تھے۔ سلطان علی کی عرفیت ''میاں'' تھی ان ہی میاں کے نام پر یہ شہر میانوالی کہلایا، یہ شہر قبائلی طرز معاشرت کا آئینہ دار ہے، جس کا یہاں کے آباد محلوں کے ناموں سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے عالم خیل، بنوں خیل، پلو خیل، زادہ خیل، جنگی خیل وغیرہ۔

میانوالی کے مشاہیر میں مولانا عبدالستار خان نیازی، کوثر نیازی، اہم مورخ ڈاکٹر اجمل نیازی، سید نجم جعفری اور عالمی شہرت یافتہ کرکٹر عمران خان کے علاوہ ۱۹۷۱ء میں سقوط ڈھاکا میں ہتھیار ڈالنے والے لیفٹیننٹ جنرل امیر عبداللہ خان نیازی جیسے لوگ بھی پیدا ہوئے، یہ بھی کیا عجب اتفاق ہے کہ سب سے پہلے پاکستان کا نعرہ لگانے والا بھی اسی قبیلہ کا ایک فرد تھا اور سانحہ مشرقی پاکستان کی داستان بھی اس شہر سے منسوب ہے۔

شہر میانوالی کو ۱۹۰۱ء میں ضلع کا درجہ حاصل ہوا، اسی ضلع کے علاقے روکھڑی میں ۱۰/نومبر ۱۹۴۱ء کو پیدا ہونے والے شیر خان کو ادبی دنیا میں انجم نیازی کے نام سے جانا پہچانا گیا، ملازمت کے سلسلے میں مدتوں سرگودھا میں قیام رہا، ان کی تعلیم ایم اے تک رہی حلقہ ارباب ذوق سرگودھا شاخ کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے وہاں کے ادبی حلقوں میں چھ چار ہا، بے شمار تقاریب منعقد کروائیں اور ملازمت سے سبک دوش ہونے کے بعد راولپنڈی منتقل ہو گئے۔

ترقی پسند تحریک سے الگ ''حلقہ ارباب ذوق'' میں دائیں اور بائیں بازو کے اہل قلم کا سلسلہ نہیں تھا بلکہ میانہ روی سے قوم و ملک سے مخلصانہ رویہ اختیار کرنے والوں نے روایتی ادب کے ساتھ مذہبی رجحانات کی شاعری بھی کی، انجم نیازی کو نعت گوئی سے بھی شغف حاصل ہے۔ ''حرا کی خوشبو'' ان کا نعتیہ مجموعہ ہے۔ ''سفر کا سلسلہ'' غزلیں اور ''سوچ سمندر'' انشائیے کا مجموعہ شائع ہو چکے ہیں۔

◆◆◆

نعت

فرش سے تا عرش ہیں سارے زمانے آپؐ کے
ساری دنیاؤں کے ہیں مخفی خزانے آپؐ کے

ذرہ ذرہ آپ کی سچی رسالت کا گواہ
ذرے ذرے کی زباں پر ہیں ترانے آپؐ کے

کروٹیں لیتے ہیں میرے ذہن میں بدر و حنین
یاد آتے ہیں بہت ساتھی پرانے آپؐ کے

مرکزِ نور و نظر ہیں آپ کے غار و مزار
سب ٹھکانوں سے حسیں تر ہیں ٹھکانے آپؐ کے

حیرتیں گم ہو گئیں ہیں دانشیں ہیں لاجواب
رہ گئے اوصاف گن گن کر سیانے آپؐ کے

راستہ تکتی رہیں اُن کی نگاہیں آپ کا
ہاتھ چومیں ہیں رسولوں کی دعا نے آپؐ کے

آپ کی یادوں میں گم رہتا ہے انجم رات دن
خواب آتے ہیں اسے اکثر سہانے آپؐ کے

غزل

مری آواز سن کر زندگی بیدار ہو جیسے
تری آواز کا سایہ افق کے پار ہو جیسے

طلوعِ صبح کا منظر مرے اندر ہے خوابیدہ
مرے اندر زمانوں کی حسیں تکرار ہو جیسے

میں ہر دیوار کے دونوں طرف یوں دیکھ لیتا ہوں
میرا ہی دوسرا حصہ پسِ دیوار ہو جیسے

شجر کی ٹہنی ٹہنی میں ہیں کتنے راز پوشیدہ
ہر اک جنگل کا ہر اک پیڑ پُراسرار ہو جیسے

ابھی ہم گھومتے پھرتے ہیں بے سمتی کے جنگل میں
ہمارا زندگی بھر کا سفر بے کار ہو جیسے

میں گہرے پانیوں میں ڈوبتا انجم جزیرہ ہوں
مری دنیا پرندوں کی حسیں چہکار ہو جیسے

ایاز صدیقی

ایاز صدیقی 8 اگست 1936ء میں روہتک مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے 9 سال کی عمر میں پاکستان آئے، بقیہ تعلیم و تربیت اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ہوئی، ان کا تعلق پاکستان بننے کے بعد پروان چڑھنے والی ادبی نسل سے ہے جس کا خمیر ایک نظریاتی ملک سے محبت کا جذبہ اتم ان میں موجود ہے۔

ایاز صدیقی کا ذریعہ معاش بینکاری سے وابستہ ہے، ہم آج کل جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے اور اخبارات کی دنیا میں بینکاری کے بارے میں ہوش رُبا داستانیں پڑھ رہے ہیں نا قابل بیان ہے، تاہم اللہ تعالیٰ کی ان پر مہربانیاں ہیں کہ ایک نیک نام افسر کے طور پر بینک سے ان کی مدتِ ملازمت اختتام پذیر ہوئی، اب اپنی بھرپور توانائی علمی کاموں میں صرف کر رہے ہیں، ملک کے بزرگ شعراء میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ جناب ملتان میں رہائش پذیر ہیں۔

ایاز صدیقی نے اپنی شناخت خود بنائی یہ الگ بات ہے کہ انہوں نے اُس ادبی اخلاقیات کو نمایاں کیا جو حزیں صدیقی کی ادبی تربیت سے انہیں نصیب ہوئی۔ ''محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)'' موصوف کا نعتیہ مجموعہ کلام ہے۔ جس میں حضرت غالب کی زمینوں میں نعت کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی لوگ کوشش کر چکے ہیں۔ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق ہے، اور اس کی کرم نوازی ہے جس طرح چاہے جس سے چاہے اپنے حبیب (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی مدح سرائی کرا دے۔ نعتیہ مجموعہ ''محمد'' (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) محبت و عقیدت کے ساتھ ساتھ حسن ادب کا ترجمان ہے اس میں فکر و فن دونوں چیزیں موجود ہیں۔

ایاز صدیقی کا غزلوں کا مجموعہ ''نقدِ ہنر'' پڑھنے کی چیز ہے۔ اس میں ایک شاعر کی عمدہ تخلیق موجود ہے۔ جو ان کے اعلیٰ ادبی اقدار کی ترجمان ہے۔ اگر انسان اپنے نظریات میں سچا ہے تو اس کی سچائی ہر سطح پر محسوس کی جاتی ہے، نعتیہ شاعری ہو یا غزلیہ شاعری وہ اسلامی روایات سے جڑی ہوئی ہے، بے شمار اشعار ''نقدِ ہنر'' میں اس بات کے گواہ ہیں انہیں صرف اسلامی نقطہ نظر سے مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔

◆◆◆

بہزاد لکھنوی

(۱۹۰۰۔۱۹۷۴)

سردار احمد خان جو بہزاد لکھنوی کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں، تقسیمِ ہند سے پہلے غزل گو شاعر کی حیثیت سے ادبی حلقوں میں خاصے مقبول تھے۔ اُن کی غزلوں کو چار چاند لگانے اور شہرتِ دوام بخشنے میں مشہور مغنیہ اختری بائی فیض آبادی کی سریلی آواز کو بڑا دخل ہے۔ بہزاد لکھنوی خوش قسمت تھے کہ اُن کا ہر دور میں ذرائعِ ابلاغ سے قریبی تعلق رہا۔ جو، اُن کی تخلیقات کو عوام الناس تک پہنچانے میں پیش پیش رہے۔ ریڈیو پاکستان نے اُن کی نعتوں کو مقبول بنانے اور عوامی سطح پر اُجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

سردار احمد خان کے آباؤ اجداد کا تعلق آفریدی نسل سے ہے۔ اُن کے بزرگ رام پور میں رہائش پذیر تھے۔ سردار احمد خان ۱۹۰۰ء میں سرزمینِ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور حصولِ تعلیم کے بعد ایسٹ انڈیا ریلوے میں ملازمت اختیار کر لی۔ مگر اختلاجِ قلب کی وجہ سے زیادہ دنوں تک ملازمت جاری نہ رہ سکی۔ ۱۹۳۲ء میں آل انڈیا ریڈیو سے منسلک ہو گئے۔ ۱۹۴۲ء میں لاہور کی ایک فلم کمپنی میں ملازمت ملی۔ مگر جلد ہی لکھنؤ واپس آ گئے۔

قیامِ پاکستان کے وقت آپ کی عمر ۴۷ سال تھی۔ یہاں آنے کے بعد ریڈیو پاکستان سے وابستہ ہوئے اور اخیر عمر تک یہ سلسلہ قائم رہا۔ دربارِ عالیہ نیازیہ میں صوفی شاہ محمد تقی نیازی بریلوی سے بیعت تھے۔ آپ کی نعتیہ شاعری کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ ''نغمۂ نور، کیفِ سرور، چراغِ ظہور، کفر و ایمان، نعتِ حضور (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم)، معراجِ طہور، اور کرم بالائے کرم'' وغیرہ۔

بہزاد لکھنوی کی نعتیں محبتِ رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم) کی آئینہ دار ہیں۔ ایک طالبِ صادق نے اپنے خونِ دل سے ایسے نقوش بنائے ہیں جو اَن مٹ ہیں۔ نعتوں میں ایک صوفی باصفا کا پرتو واضح طور پر نظر آتا ہے۔ موصوف کا انتقال ۱۹۷۴ء میں ہوا۔ آخری آرام گاہ کراچی میں ہے۔

◆◆◆

نعت

ہم مدینے سے اللہ کیوں آ گئے قلبِ حیراں کی تسکیں وہیں رہ گئی
دل وہیں رہ گیا، جاں وہیں رہ گئی، خم اسی در پہ اپنی جبیں رہ گئی

یاد آتے ہیں ہم کو وہ شام و سحر، وہ سکونِ دل و جان و روح و نظر
یہ اُنہیں کا کرم ہے، اُنہیں کی عطا، ایک کیفیتِ دل نشیں رہ گئی

اللہ اللہ وہاں کا درود و سلام، اللہ اللہ وہاں کا سجود و قیام
اللہ اللہ وہاں کا وہ کیفِ دوام، وہ صلوٰۃِ سکوں آفریں رہ گئی

جس جگہ سجدہ ریزی کی لذت ملی، جس جگہ ہر قدم اُنؐ کی رحمت ملی
جس جگہ نور رہتا ہے شام و سحر وہ فلک رہ گیا، وہ زمیں رہ گئی

پڑھ کے نصرٌ من اللہ و فتحٌ قریبٌ ہم رواں جب ہوئے سوئے کوئے حبیبؐ
برکتیں رحمتیں ساتھ چلنے لگیں، بے بسی زندگی کی یہیں رہ گئی

زندگانی وہیں کاش ہوتی بسر، کاش بہزادؔ آتے نہ ہم لوٹ کر
اور پوری ہوئی ہر تمنا مگر یہ تمنائے قلبِ حزیں رہ گئی

غزل

قبضہ میں تھی بہار ابھی کل کی بات ہے
دامن تھا تار تار ابھی کل کی بات ہے

اب ڈھونڈتا ہوں راہِ سلوک و طلب کو میں
سجدہ تھا پیشِ یار ابھی کل کی بات ہے

یہ میں بدل گیا ہوں کہ ساقی بدل گیا
ہر شے کو تھا خمار ابھی کل کی بات ہے

اب اعتبارِ دل سے بھی بے اعتبار ہوں
دل پر تھا اعتبار ابھی کل کی بات ہے

اب شیخ کہہ رہا ہے کہ کعبہ ہے اور جا
کعبہ تھا کوئے یار ابھی کل کی بات ہے

میں بھی تھا بے قرار و پریشاں و منتشر
وہ بھی تھے بے قرار ابھی کل کی بات ہے

یہ بے حسی عشق ہے بہزاؔد یا کچھ اور
تم تھے حضورِ یار ابھی کل کی بات ہے

تابشؔ دہلوی

(۱۹۱۱ء۔۲۰۰۴ء)

مسعود الحسن تابشؔ ۹ رنومبر ۱۹۱۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کی تعلیم بی اے ہے۔ تابشؔ دہلوی کا ننھیالی خاندان محتاجِ تعارف نہیں۔ شمس العلماء منشی ذکاء اللہ کے گھرانے سے ہر صاحبِ علم واقف ہے۔ ''تاریخِ ہند'' جو کئی جلدوں پر مشتمل ہے اُنہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے اور اسی خانوادے میں جناب عنایت اللہ کا نام آتا ہے جو''تاریخِ اندلس'' کے مترجم ہیں۔ اُن کا ددھیالی خاندان مولوی نظام الدین کا گھرانہ ہے جو فارسی ادبیات میں اہم مقام رکھتا ہے۔ ایسے ماحول میں مسعود الحسن تابشؔ دہلوی کی پرورش ہوئی۔ تابشؔ بنیادی طور پر غزل گو شاعر ہیں۔

''نیم روز'' اور ''چراغِ صحرا'' غزلوں کے مجموعے ہیں اور ''غبارِ انجم'' نظموں کا مجموعہ ہے۔ شعر و شاعری کی دنیا میں تابشؔ دہلوی کی شاعری نصف صدی سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ کراچی کے بزرگ شعراء میں اُن کا شمار ہوتا ہے۔ کراچی سے شائع ہونے والے متعدد غزلیہ اور نعتیہ مجموعوں پر تبصرہ نگار کے طور پر آپ کی تحریریں موجود ہیں۔

ملازمت آل انڈیا ریڈیو سے شروع ہوئی اور ریڈیو پاکستان پر ختم ہوئی۔ کراچی میں مقیم رہے۔ تابشؔ دہلوی نے نعتیہ شاعری کو نیا اندازِ فکر دیا ہے۔ ''تقدیس'' اُن کا نعتیہ مجموعہ ہے:

ڈاکٹر عاصی کرنالی ''اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر'' صفحہ ۳۲۳ پر رقم طراز ہیں:

ابوالخیر کشفی کے بقول تابش صاحب کے یہاں مجموعی شاعری میں ''تفکر و تحیر کی کارفرمائی ہے لیکن نعتیہ شاعری میں تفکر اور تحیر کی بجائے والہانہ پن ہے۔'' ان کے نعتیہ مجموعہ ''تقدیس'' کے

بارے میں ڈاکٹر کشفی فرماتے ہیں:

''اس کی شاعری میں روایت کے حسین کلاسیکل انداز کا رچاؤ اور جدید آہنگ کی قوت ہے۔''

تابش صاحب مسافرانِ حیات کے لیے حضورؐ کے نقوش پا کی متابعت چاہتے ہیں تا کہ یہ کاروانِ انسانیت صراطِ مستقیم پر چل کر منزلِ ہدایت پر پہنچ جائے۔

مسلم شمیم تابش دہلوی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''تابش دہلوی کی شاعرانہ زندگی کا آغاز ۱۹۲۳ سے ہوا مگر ان کا پہلا مضمون ''یادِ ایامِ صحبتِ فانی'' ماہنامہ برہان دہلی کے اگست ۱۹۴۲ء کے شمارے میں چھپا۔ گویا نثری ادب کی تخلیق کا سفر بھی نصف صدی سے زیادہ پر محیط ہے ان کے اولین نثری مجموعے ''دید باز دید'' میں کل ۲۶ نگارشات شامل ہیں۔ دید باز دید کے علاوہ ان کی دو مختصر تحریریں ان کے شعری مجموعوں میں شامل حرف آغاز اور حرف اول ہمارے مطالعے میں آئیں۔ ان کی نثر نگاری کے حوالے سے جناب مشفق خواجہ کے یہ فقرے بہت موزوں لگتے ہیں'' تابش صاحب بڑی پہلو دار شخصیت کے مالک ہیں وہ عہد حاضر کے نہ صرف بہت بڑے غزل گو ہیں بلکہ اردو زبان کے مزاج شناس کی حیثیت سے ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ انہیں زبان و بیان پر جو قدرت حاصل ہے اس کی اگر کوئی مثال دی جا سکتی ہے تو وہ انہیں کی ذات سے دی جا سکتی ہے۔ نثر نگاری خصوصاً یاد نگاری میں انہیں منفرد مقام حاصل ہے۔''

(روزنامہ جنگ ۷ ستمبر ۲۰۱۷ صفحہ نمبر ۱۶)

◆◆◆

نعت

گدائے مصطفیٰ کیا ہو گیا ہوں
میں آپ اپنی تمنا ہو گیا ہوں

حرا کے خلوتیِ چشمِ کرم ہو
بھری دنیا میں تنہا ہو گیا ہوں

نگاہِ لطف اے ناموسِ عالمؐ
بہت بدنام و رسوا ہو گیا ہوں

کرم اے مصدرِ جود و سخاوتؐ
سوالی در بہ در کا ہو گیا ہوں

کوئی چھینٹا ادھر بھی ابرِ رحمت
میں صحرا تشنگی کا ہو گیا ہوں

نہ دے آوازِ دنیا مجھ کو تابشؔ
میں احمدِ مجتبیٰؐ کا ہو گیا ہوں

غزل

بے قراری سی بے قراری ہے
دن بھی بھاری ہے رات بھاری ہے

زندگی کی بساط پر اکثر
جیتی بازی بھی ہم نے ہاری ہے

توڑو دل میرا شوق سے توڑو
چیز میری نہیں تمہاری ہے

بار ہستی اٹھا سکا نہ کوئی
یہ غمِ دل جہاں سے بھاری ہے

آنکھ سے چھپ کے دل میں بیٹھے ہو
ہائے کیسی یہ پردہ داری ہے

تقی دہلوی چغتائی، ڈاکٹر

(۱۹۰۴ء۔۱۹۸۹ء)

۴ر مئی ۱۹۰۴ء دہلی میں پیدا ہونے والے مرزا محمود بیگ کے پسر محمد تقی مرزا کو ڈاکٹر تقی دہلوی (ہومیو پیتھ) کہا جاتا ہے۔ ''اظہار عقیدت'' ۱۹۵۶ء اور ''کلیات تقی'' ۱۹۸۴ء ان کی یادگاریں ہیں۔

۱۹ر ستمبر ۱۹۸۹ء کورنگی ''کے'' ایریا میں انتقال ہوا۔ کورنگی قبرستان میں تدفین ہوئی۔ خطاط مصور، شاعر، بے خود دہلوی کے تلمیذ ڈاکٹر تقی دہلوی نے برسہا برس گھر پر ماہانہ نشستیں کروائیں جن میں سید قمر ہاشمی، شکیل احمد ضیا، جوہر سعیدی، بیتاب نظیری، ڈاکٹر یوسف جاوید، جمال احسانی، انور جاوید ہاشمی، ساجد امجد، شاہد الوری، پیرزادہ عاشق کیرانوی وغیرہ شریک ہوتے تھے۔

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی تحریر فرماتے ہیں ''جناب تقی نے اس خاکدان تیرہ و روشن میں زندگی کے ۷۴ سال گزارے ہیں۔ ان کا سال ولادت ۱۹۰۴ء ہے اور اس اتفاقیہ واقعہ نے انہیں مجھ سے قریب تر کر دیا ہے۔ کیونکہ یہی میرے والد گرامی حضرت ثاقب کانپوری مدظلہ، کا سال ولادت ہے وہ نسلاً چغتائی ہیں اور چغتائی مجھے ویسے بھی بیحد عزیز ہیں خواہ وہ تقی مرزا چغتائی ہوں یا رسا چغتائی یا وجد چغتائی یا ''منار خواب گرشہ سوار چغتائی'' چغتائیوں اور ان کی یادگاروں میں اپنی عظمت رفتہ کا سراغ پاتا ہوں۔''

''یوں ان کی شاعری کا آغاز جوانی ہی میں ہوگیا تھا لیکن حقیقی معنوں میں انہوں نے اپنی ذات کے اظہار کے لیے شاعری کو ۱۹۶۰ء سے اپنایا ہے۔ مدتوں مصوری کے عملی ذوق نے انہیں ایک نئی نظر عطا کی ہے اور اب وہ شاعری میں بھی مصوری کی تکنیک سے کام لیتے ہیں۔''

راقم الحروف تقی چغتائی کی غزل پڑھ کر اس نتیجے پر پہنچا کہ انہوں نے پاکستان کے طرز معاشرت پر عائرانہ نظر ڈالی ہے۔ اور آج ملک میں احتساب کا منظر نامہ اس کی تصدیق کررہا ہے۔ ہر شاعر اپنے عہد کے سماجی اور سیاسی رویوں کا ناقد ہوتا ہے۔ اور اپنا جذبۂ دروں اشعار میں بیان کردیتا ہے اور اسے عوامی عدالت میں بھیج دیتا ہے۔

نعت

وہی ہم سے گنہگاروں کی امیدوں کا حاصل ہیں
وہی بحرِ طلاطم خیز کے دامانِ ساحل ہیں

انہیں سے کائنات رنگ و بو نے وسعتیں پائیں
انہیں کی ضو سے روشن یہ چراغِ منزل ہیں

انہیں سے غنچہ و گلہائے رنگیں نے ملاحت لی
انہیں کی نعت میں مصروف گلشن کے عنادل ہیں

پہنچتی ہیں فرازِ عشق تک تابانیاں جن کی
مدینہ کی حسیں راہوں کو وہ انوار حاصل ہیں

زمیں روشن فلک روشن تا لامکاں روشن
شب اسریٰ بہت روشن محبت کی منازل ہیں

ابھی ہو جائے گا طے مسئلہ امت کی بخشش کا
ابھی در پیش خلوت میں محبت کے مسائل ہیں

تقی یادِ نبیؐ ذکرِ نبیؐ ضبطِ غمِ پیہم
یہی ارکانِ الفت ہیں یہی آدابِ محفل ہیں

غزل

ہے ناتمام کارِ ندیماں کا احتساب
باقی ہے اب بھی خواجہ و سلطاں کا احتساب

زلف سیاہ اور رخِ جاناں کا احتساب
کافر ہے کر رہی ہے مسلماں کا احتساب

میں کس حساب میں ہوں مرا احتساب کیا
کیا لوگے کر کے بے سر و ساماں کا احتساب

ممکن کہاں تھے صبح و مسا بادۂ و سبو
کرتے بھی کیسے گردشِ دوراں کا احتساب

خاروں کو بھی نہ بخشے گا پھولوں کا ذکر کیا
گل چیں کے ہاتھ دو نہ گلستاں کا احتساب

گرداب کا شمار نہ موجوں کی کوئی حد
ہوتا بھی کیسے جوششِ طوفاں کا احتساب

پڑتے ہی اک شعاع کے اڑ جائے گی تری
شبنم کرے گی مہرِ درخشاں کا احتساب

تنویر پھولؔ

تنویر پھولؔ کا پورا نام تنویر الدین احمد صدیقی ہے۔ آپ ۳ ستمبر ۱۹۴۷ء کو مظفر پور بھارت میں پیدا ہوئے۔ ہجرت کے عمل نے کراچی پاکستان پہنچا دیا۔ یہاں تاریخِ اسلام میں ایم اے کیا۔ ۱۹۹۷ء میں بینک دولت آف پاکستان، کراچی سے ایک ممتاز عہدے کے ساتھ سبک دوش ہوئے۔

تنویر پھولؔ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں اگرچہ شاعری کی تمام اصناف میں آپ کا فکر انگیز کلام موجود ہے لیکن آپ کو "بچوں کے ادب" اور "تاریخ گوئی" کے حوالے سے برصغیر پاک و ہند میں ایک امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ سرکاری سطح پر بھی آپ بچوں کے ممتاز ادیب و شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں اور اس ضمن میں آپ کی کاوشوں کو متعدد مرتبہ اعزازات و انعامات سے نوازا گیا ہے۔

تنویر پھولؔ ایک درویش صفت، نہایت دین دار اور منکسر المزاج شخص ہیں۔ اسی لیے اُن کی شاعری اور شخصیت میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ مختلف اصنافِ سخن میں آپ کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ بھارت کے ممتاز اسکالر ڈاکٹر نجم الہدیٰ کہتے ہیں کہ اُن کی نعتیہ شاعری عقائد و معرفت، رشد و ہدایت، محبت و عقیدت، خیال کی بلندی، فکر کی اصابت، جذبہ و احساس کی لطافت اور بھرپور دینی معلومات کا شاہکار مخزن ہے۔ تنویر پھول کی کتابوں کی فہرست درج ذیل ہے:

نعتیہ مجموعے: انوارِ حرا، قندیلِ حرا، نعتِ حرا (تفہیم ترجمہ قرآن)' ارحم الراحمین (حمدیہ) زبورِ سخن (حمدیہ) دھواں دھواں چہرے (غزلیات) خوشبو بھینی بھینی (بچوں کا ادب)' رشکِ باغِ ارم (بچوں کا ادب)، چڑیا تتلی پھول (بچوں کا ادب) نغماتِ پاکستان (قومی نظمیں)' گلشنِ سخن (بچوں کا ادب)' منتظرِ اشاعت: سخن زارِ حروف (غزلیہ) کوئی ان سا نہیں (نعتیہ)، خالقِ کائنات (حمدیہ)

نعت

جو سنا مژدۂ آمد مصطفیٰ باغ کے سارے گُل مسکرانے لگے
نکہتِ گُل جو لائی نسیمِ سحر طائرانِ چمن چہچہانے لگے

اب وہ دورِ خزاں یاں سے رخصت ہوا دیکھو دیکھو ہے کیا روح پرور فضا
چھا گئی ہیں بہاریں ہر اک سمت اب، لو عنادل بھی نغمہ سنانے لگے

آج تشریف لائے وہ نورالہدیٰ دُور ظلمت ضلالت کی جن سے ہوئی
خوف سے سارے بت گر پڑے منہ کے بل اور شیاطین بھی منہ چھپانے لگے

رب کا پیغام دنیا میں آنے لگا مفتخر ہو گئی خاکِ ارضِ عرب
عبد و معبود کا رابطہ ہو گیا دیکھو جبریل بھی آنے جانے لگے

قلب افگار تھے اپنے اے ہم نشیں، سبز گنبد کے سائے میں تسکیں ملی
روضۂ پاک پر جونہی حاضر ہوئے اُن کو سب زخمِ دل ہم دِکھانے لگے

والیِ بے کساں، رحمتِ دو جہاںؐ دشمنوں کے بھی حق میں دعا گو رہے
جتنے بے کس تھے اور جتنے مظلوم تھے، اُن کی قربت سے تسکین پانے لگے

سنگ باری جو طائف میں اُن پر ہوئی جوش میں شانِ قہار کی آ گئی
رحمتِ دو جہاںؐ کو بھی دیکھو ذرا پھول رحمت کے ہر سُو لٹانے لگے

غزل

نہ ہو اخلاص تو باتوں کا اثر جائے گا
پندِ بے سوز سے دل جلد ہی مر جائے گا

اپنے خالق کا تو منکر ہے اے ناداں انساں!
سوچ لے اس کو یہاں سے تُو کدھر جائے گا

زیست کی عالم خاکی کی حقیقت کیا ہے
ایک جھونکا ہے جو آئے گا گزر جائے گا

مے کشو! تم نے سنا ہوگا جگر کا یہ قول
عشق میں دخترِ زر کے یہ جگر جائے گا

اپنے بچے کو دکھاؤ نہ مناظر خونی
خواب پُر ہول جو دیکھے گا تو ڈر جائے گا

بادلو! چاند سے کہہ دو کہ وہ پردہ کر لے
صحنِ گلشن کی طرف رشکِ قمر جائے گا

چپ عنادل جو رہے زاغ و زغن کے آگے
پھول! اس باغ کا شیرازہ بکھر جائے گا

ڈاکٹر توصیف تبسّم

محمد احمد توصیف تبسم ۱۳/ اگست ۱۹۲۸ء کو قصبہ سہسوان، ضلع بدایوں، یوپی، بھارت میں پیدا ہوئے۔ ۲۱/ ستمبر ۱۹۴۷ء کو ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ ہجرت کے وقت آپ کی تعلیم میٹرک تھی۔ ابتدا ۱۹۷۲ء تک راولپنڈی میں رہے۔ گورنمنٹ کالج راول پنڈی میں ملازمت کی۔ ایم ای ایس میں چودہ سال ملازمت کی۔ ۱۹۸۷ء میں جامشورو یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کا اعزاز حاصل کیا۔ آپ کا تھیسس مجلسِ ترقی ادب لاہور نے شائع کیا۔

آپ کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا موضوع ''میر محمد اسماعیل منیر شکوہ آبادی احوال و آثار'' تھا۔ منیر شکوہ آبادی صاحب شیخ امام بخش ناسخ اور علی اوسط رشک کے شاگرد مایہ ناز تھے۔ معروضی جنصہ مشاعرے کے موسس تھے۔ انڈمان میں پانچ سال تک جنگِ آزادی میں عملی طور پر شریک رہے۔ شکست کے بعد روپوش ہو گئے پھر جب گرفتار ہوئے تو مقدمہ چلا اور کالے پانی کی سزا ہوئی۔

ڈاکٹر توصیف تبسم نے اسکول کے زمانے سے ہی شعر کہنے شروع کر دیے تھے۔ استاد کسی کو نہیں بنایا۔

ان کی مطبوعہ کتب میں ''کوئی اور ستارہ'' شعری مجموعے کو ۱۹۹۵ء میں علامہ اقبال ایوارڈ دیا گیا۔ ''سلسبیل'' ان کا نعتیہ مجموعہ ہے۔ حمد و نعت و سلام پر مشتمل اس مجموعے کو ۲۰۱۱ء میں عکاس

پبلی کیشنز اسلام آباد نے شائع کیا۔ ''آؤ کھیلیں آؤ گائیں'' بچوں کے لیے نظموں کا مجموعہ ہے جسے نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد نے ایوارڈ سے نوازا۔ ''کہاوت کہانی'' بھی بچوں کے ادب سے متعلق ہے۔

''۱۹۵۷ء کا مجاہد شاعر'' منیر نیازی کے بارے میں کتاب ہے جسے ۲۰۰۷ء میں نیشنل بک فاؤنڈیشن نے شائع کیا۔ ''بند گلی میں شام'' ان کی وہ کتاب ہے جو ان کی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کو جنگ یو بی ایل لٹریری ایوارڈ سے نوازا گیا۔ تنقید و تبصرہ کے لکھاریوں میں بھی وہ اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ اسلام آباد کے سینئر ترین شاعر ہیں۔ بہت دلچسپ اور بہت نفیس آدمی ہیں۔ ۱۴/ جنوری ۲۰۱۴ء میں میری ان سے ملاقات جناب آصف اکبر صاحب کے دولت کدے پر ہوئی۔ اسی دن ایک مختصر سی شعری نشست میں انہیں زبانی اپنا کلام سنانے کا موقع ملا۔ ان کی رہائش ۶۸۷/ اسٹریٹ ۶۔ بی ۱۳۹ اسلام آباد میں ہے۔

نعت

اے قلم! دائرۂ وصف و لب و رُخ سے نکل
مدحِ ممدوحِ خداوند میں لکھ کوئی غزل

پیش منظر بھی وہی اور پسِ منظر بھی وہی
جو نبوت میں مؤخر ہے، وہی ہے اوّل

بزمِ امکاں میں ہے نایاب سے بڑھ کر نایاب
مُعجزہ حق کا، مکمل سے زیادہ اکمل

خاکِ خوابیدہ میں بیدار نمو کی صورت
تا ابد مزرعِ ہستی پہ برستا بادل

اک وہی رحمتِ عالم ہے، کرم سے اُس کے
پھول باغوں میں مہکتے ہیں، ہرے ہیں جنگل

شوق حیران ہے، دل و جاں میں سمائی کیسے
گم ہیں جس ذاتِ گرامی میں ابد اور ازل

صرف اک لفظ ''محمدؐ'' کے ہیں کتنے معنی
شافع و حامد و محمود، نبی مُرسل

سر پہ ہے کس کے یہ سورج کا عمامہ، توصیفؔ!
کون ہے پہنے ہوئے پیراہنِ صبحِ ازل

غزل

دیکھیے تو سبزہ و گل سے عیاں ہے زندگی
خاک بے توقیر ہے آبِ رواں ہے زندگی

یاں تو اک عالم ہے جو پیدا بھی ہے ناپید بھی
رفتگاں! کچھ تم ہی بتلاؤ کہاں ہے زندگی

دامنِ امکاں میں نادیدہ مناظر ہیں بہت
وسعتِ افلاک ہے اور پُر فشاں ہے زندگی

خاک کے پردے سے نکلی ہیں ہزاروں صورتیں
شہرِ خوابیدہ میں آوازِ اذاں ہے زندگی

ہے کبھی آنسو جو دل سے آنکھ تک آیا نہیں
اور کبھی اظہار ہے حرفِ تپاں ہے زندگی

کوئی اب کہتا نہیں توصیفؔ رہتے ہو کہاں
اب سمجھ پائے کہ لطفِ دوستاں ہے زندگی

ثناء گورکھپوری

(۱۹۳۲ـ۲۰۰۶)

محمد ثناء اللہ ۷/فروری ۱۹۳۲ء کو اتر پردیش کے شہر گورکھپور میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام فتح اللہ اور دادا کا نام شیخ ہدایت اللہ تھا۔گورکھپور یونیورسٹی سے اردو ادب میں ایم اے کیا۔ڈاکٹر سلام سندیلوی، ڈاکٹر محمود الٰہی زخمی، اور مہدی افادی کے فرزند پروفیسر نافذ حسین ان کے اساتذہ رہے۔

۱۹۸۶ء میں "دھند میں آفتاب" پہلا شعری مجموعہ شائع ہوا۔جس کا فلیپ مجنوں گورکھ پوری نے رقم کیا تھا۔۱۹۹۳ء میں "دشتِ تہہِ آب" اور ۲۰۰۳ء میں تیسرا مجموعہ "آواز" شائع ہوا۔آپ نے ایک طویل نظم "قصیدہ مسجد الحرام" ۱۹۸۸ء میں شائع کی جس سے ان کی مشق سخن کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔کالجوں میں اردو کے استاد رہے۔۱۹۶۹ء تا ۱۹۷۱ ڈھاکہ سید پور چٹاگانگ کی مختلف درسگاہوں کے بعد ۱۹۷۹ء تا ۲۰۰۲ء مئی میں ریٹائرمنٹ تک سندھ اور کراچی میں اسسٹنٹ پروفیسر رہے۔۱۳/ستمبر ۲۰۰۶ء کو بعارضۂ قلب ثناء گورکھپوری نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کی۔

◆◆◆

حمدیہ رباعیات

انوارِ معانی کو پیمبرؐ کھولے
اسرارِ معانی کو سخنور کھولے
تپتی دوپہر میں پھڑپھڑاتی چڑیا
اُڑتی ہے سمندر پہ تشنا پر کھولے

☆

ہر لفظ کے سینے میں اتر جاتی ہے
پھر حدِ معانی سے گزر جاتی ہے
لیکن ترے آگے مری شعری نخوت
جاتی ہے تو پھر شرم سے مر جاتی ہے

☆

تنویر کو وہ رنگ بنا دیتے ہیں
رنگ رنگ سے آہنگ بنا دیتے ہیں
جن سات سروں میں گاتی ہے یہ روح
دل لے کے مرا چنگ بنا دیتے ہیں

غزل

ساجن سمجھ گئے مری آنکھوں کی بولیاں
دیتے ہیں مجھ کو دان وہ بھر بھر کے جھولیاں

وہ ساتھ لے گئی مری آنکھوں کے دو ہرن
ہوتی نہیں ہیں خوب ہر اک سے ٹھٹھولیاں

اترے ہیں دیوتاؤں کے رتھ آسمان سے
کیسے کہار آئے اٹھانے کو ڈولیاں

اس دن پیا کو رنگ میں اپنے رنگوں گی میں
عیدیں بھی ساتھ ہوں تو مزا دیں گی ہولیاں

داتا کو دیکھ دیکھ کے اترا رہی ہوں میں
قدموں میں ان کے میں نے الٹ دی ہیں جھولیاں

بن باس ہو، بہشت ہو، میں ہوں پیا کے ساتھ
پتوں کے ہوں لباس کہ پھولوں کی چولیاں

اب میرے من کا مور تھنا ناچتا نہیں
مجھ سے بچھڑ گئیں مری سکھیوں کی ٹولیاں

پروفیسر جاذب قریشی

کراچی کے حالیہ ادبی منظرنامے میں محترم جاذب قریشی کا نام مہر نصف النہار کی طرح روشن ہے۔ ایک شاعر، ادیب، ناقد، ماہر تعلیم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ دس سال تک روزنامہ جنگ میں بحیثیت سب ایڈیٹر صحافت سے منسلک رہے۔ جاذب قریشی کا خاندانی نام محمد صابر اور قلمی نام جاذب قریشی ہے والد کا نام محمد افضل شیخ ہے۔ جاذب 3 اگست 1940ء میں لکھنؤ یوپی بھارت میں پیدا ہوئے۔ چھ یا سات سال کی عمر تھی کہ والد کا بعارضہ کینسر انتقال ہو گیا۔ بچپن لکھنؤ میں گزرا۔ 1950ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے اور لاہور میں مقیم ہوئے۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے ثانوی تعلیم حاصل کی۔ 1962ء میں سندھ آئے اور کراچی کو مسکن بنایا۔ 1968ء میں جامعہ کراچی سے ایم اے کیا سرکاری کالجز میں تدریس کے شعبے سے وابستہ رہے۔ 1953ء سے جب وہ لاہور میں مقیم تھے شاعری کا آغاز کیا اسی اثنا میں افسانے بھی لکھے۔ کراچی آنے کے بعد نقش ڈائجسٹ اور "نگارش" سے وابستہ رہے۔ "نمکدان" میں طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھتے رہے۔ ۲۵ دسمبر 1964ء میں دہلی مرکنٹائل پرائمری اسکول میں تدریسی ملازمت حاصل کی۔

1964 کو رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوئے۔

جاذب قریشی کی مطبوعہ کتب میں "تخلیقی آواز" (میں چھ کتب تخلیقی آواز، آنکھ اور چراغ، دوسرے کنارے تک، میری تحریریں، میں نے یہ جانا، شاعری اور تہذیب) کے مضامین کا انتخاب

ہے۔ نیز شعری کتب میں "شناسائی، نیند کا ریشم، شیشے کا درخت، پہچان، آشوبِ جہاں، اجلی آوازیں (ہائیکو) شکستہ عکس (نثری نظمیں ایک کہانی) جھرنے (نغمے، گیت، ترانے) جاذب کی غزلیں (انتخاب) جاذب کی نظمیں (انتخاب) اور "نعت کے جدید رنگ" (نعتیہ مجموعہ) شامل ہیں۔ جاذب قریشی کی زیرِ ترتیب کتابوں میں "سچائی کا اظہار" (وہ مضامین جو تقریبات میں پڑھے گئے) اور "جاذب کی شاعری اور شخصیت" (انگریزی اور اردو میں لکھے گئے مضامین کا مجموعہ) ہیں۔

"نعت کے جدید رنگ" میں حمد، نعتیں، مناقب اور دعا کے ساتھ نو ایسے نثری مضامین بھی شامل اشاعت کیے گئے ہیں جو انہوں نے حال کے بہت اہم نعت کہنے والے شعراء کی نعت گوئی پر لکھے۔ اس کتاب میں "قرطاس وقلم کی پرورش" کے عنوان سے نعتیہ شاعری کا ایک مختصر جائزہ بھی موجود ہے۔ بھوپال انٹرنیشنل فورم کراچی کے تحت شائع ہونے والی اس اہم کتاب پر سن اشاعت ندارد، جاذب قریشی نے اپنی مختصر سوانح عمری "مجھے یاد ہے" کے عنوان سے لکھی جو "جاذب کی غزلیں" میں شامل اشاعت ہے۔ 2008ء میں جاذب قریشی پر جامعہ کراچی کی ایک طالبہ نے ایم اے کا مقالہ بھی تحریر کیا۔ جاذب قریشی کے فکروفن پر کئی رسائل وجرائد نے خصوصی نمبر شائع کیے۔

نعت

زخموں کی قبا ہو کہ گلابوں کی ردا ہو
وہ رنگ ملے صلی علیٰ جس پہ لکھا ہو

مٹی کو اُجالوں کے ہنر تو نے سکھائے
تو ہم سے بچھڑ جائے تو ہر سمت خلا ہو

یہ انفس و آفاق یہ شہرت یہ زمانے
اس شخص کو کیا چاہیئے تو جس کو ملا ہو

آندھی کے سفر میں جو کوئی تجھ کو پکارے
سورج سے زیادہ ترا نقشِ کفِ پا ہو

اس کو ترے رستوں میں گھنی چھاؤں ملے گی
جو شخص کسی دھوپ کے صحرا میں جلا ہو

تو گہرا سمندر ہے میں اک موج شکستہ
مجھ سے تری پہچان کا حق کیسے ادا ہو

ہر عہد سے آگے تری آواز کا پرچم
وہ زندہ رہے گا جو ترے ساتھ چلا ہو

غزل

ایک صحرا کو پار کرتا ہوں
میں ترا انتظار کرتا ہوں

سائباں ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں
دھوپ کا اعتبار کرتا ہوں

تیرے چہرے کے خال و خد لکھ کر
آئینوں کو غبار کرتا ہوں

نیند کی دسترس میں ہوں لیکن
تیرے خوابوں سے پیار کرتا ہوں

زخم میرے بدن کو لگتا ہے
میں جو دشمن پہ وار کرتا ہوں

تیری خوشبو کو ڈھونڈنے والی
تتلیوں کا شمار کرتا ہوں

میں تو پتھر کے شہر میں جاذب
عشق پہ انحصار کرتا ہوں

جعفر بلوچ

پروفیسر غلام جعفر بلوچ ۲۷ جنوری ۱۹۴۷ء کو بمقام لیہ، ضلع مظفر گڑھ پیدا ہوئے۔ انہوں نے گورنمنٹ کالج، لیہ سے انٹر پاس کیا اور باقاعدہ شعر گوئی کا آغاز کیا۔ جناب تبسم سے مشورۂ سخن کرتے رہے۔ راجہ محمد عبداللہ نیاز صاحب کی قومی نظمیں اور نعتیں اخبارات و رسائل میں برابر چھپ رہی تھیں اور وہ بہ نفسِ نفیس لیہ میں موجود تھے۔ ایسے صاحب فن سے جعفر کا اثر پذیر ہونا قدرتی امر تھا۔ چناں چہ حضرت نیاز سے بھی استفادہ کرتے رہے۔

ایف سی سی کرنے کے بعد تلاشِ معاش میں سرگرداں رہے۔ قسمت نے یاوری کی بالآخر محکمۂ انسدادِ ملیریا میں ملازمت حاصل کر لی۔ تعلیمی سرگرمیاں جاری رہیں۔ اسی دوران بی اے پاس کر لیا۔ دورانِ ملازمت جناب کشفی ملتانی سے ملاقات ہوئی ہفت روزہ ''بشارت'' کے ادارتی کام میں اُن کا ہاتھ بٹاتے رہے۔ ساتھ ہی تربیت کے مرحلے بھی طے کرتے رہے۔

۱۹۶۸ء میں سینٹرل ٹریننگ کالج، لاہور سے بی ایڈ کیا۔ بعد ازاں ایم اے اُردو کی سند حاصل کر کے اپنے ہی ضلع میں دو سال تک انگلش ٹیچر کے طور پر خدمات انجام دیتے رہے۔

۱۹۷۵ء میں لیکچرار شپ ملی۔ سائنس کالج، لاہور میں اُردو کے پروفیسر ہیں۔ اُن کی نعتوں میں سیرت پاک کی جلوہ گری نمایاں ہے۔ اُن کا مجموعۂ نعت ''بیعت'' اہلِ نظر کے لیے خاصہ کی چیز ہے:

ڈاکٹر عاصی کرنالی ''اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر'' صفحہ ۳۱۴ پر جعفر بلوچ کے بارے میں لکھتے ہیں: ''عقل و خرد کی تاریکیاں، اوہام و تشکیک کے اندھیرے، معصیت اور بدی کی ظلمتیں اور انسان کی ضلالتوں اور گمراہیوں کی تیرگیاں ان سب کا رد، ان سب کی فنا و معدومیت کے لیے صرف ایک روشنی درکار ہے جو حضور علیہ السلام کے آفتاب سیرت و شریعت سے طلوع ہوتی ہے۔''

◆◆◆

نعت

تا عرش ہے اعلانِ رفعنا لک ذکرک
اللہ غنی شانِ رفعنا لک ذکرک

آقا ہیں مرے فخرِ رُسل، مرجعِ لولاک
مازاغ شرف، جانِ رفعنا لک ذکرک

بجز خالقِ مُطلق کے معلوم کہ کیا ہے
حدِّ اُفق و آنِ رفعنا لک ذکرک

ہر ایک زمانے میں سرِ مطلعِ ادراک
طالع ہوئی بُرہانِ رفعنا لک ذکرک

حضرت کے ثنا گر جو سرافراز ہیں جعفرؔ
یہ بھی تو ہے فیضانِ رفعنا لک ذکرک

غزل

پہلے تھا شوخ اب دل شائستۂ الم ہے
وہ بھی ترا کرم تھا یہ بھی ترا کرم ہے

شاید کبھی کسی کو ہو التباس لیکن
آخر خدا ہے' آخر صنم صنم ہے

انجام کار تو نے پوچھا ہے حال میرا
شفقت پہ بیکراں ہے' احسان یہ اتم ہے

اربابِ گلستاں کی سرگرمیاں عجب ہیں
اک سارقِ زر و گل، اک دزدِ رنگ و نم ہے

حق وہ تھا جس کے آگے باطل لرز رہا تھا
یا حق اسے کہیں جو باطل میں آج ضم ہے

لاہوتیت ہے اس میں اک کیفیت ہے اس میں
جعفر مری غزل بھی پروردۂ حرم ہے

جمیل احمد نظر

(۱۹۲۵......۱۹۹۳)

جمیل احمد نظر بریلی میں ۱۲ دسمبر ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے وہیں ان کی تعلیم وتربیت کے ابتدائی ایام گزرے جس وقت پاکستان بنا ان کی عمر ۲۲ برس تھی۔ جمیل نظر اردو کے ممتاز نقاد کے طور پر علمی ادبی حلقوں میں مشہور رہے ہیں، اہل علم نے ان کے تنقیدی شعور کو سراہا ہے، ان کے شعری مجموعے "غزل چہرہ" کو پذیرائی ملی، اور نثری تصنیف "مقدمہ سحر وساحری" کو بھی ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے۔

جمیل نظر کی نعت رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے والہانہ لگاؤ کا اندازہ ان کے نعتیہ مجموعے "ایقان" سے ہوتا ہے۔ عام ڈگر سے ہٹ کر ان کا تنقیدی شعور ان کی نعتیہ شاعری میں اجاگر نظر آتا ہے۔ شیوا بریلوی کا ذکر نعت نگار شعراء کی صف میں نمایاں ہے ان سے ہی جمیل نظر نے شعری رموز سیکھے اور بعد ازاں اس کو خوب صورت انداز میں برتا بھی۔

جمیل نظر ۱۹۹۳ء میں صدیق آباد نیو کراچی کے قبرستان میں آسودہ خاک ہو گئے۔

نعت

سردار انبیاءؑ کو ہمارا سلام ہے
محبوبِ کبریا کو ہمارا سلام ہے

عہدِ طفولیت سے مقامِ وصال تک
آقاؐ کی ہر ادا کو ہمارا سلام ہے

کل امتیں ہیں جس کی شفاعت کی منتظر
نبیوں کے پیشوا کو ہمارا سلام ہے

کونین جس کے واسطے تخلیق کی گئی
قدرت کے مدعا کو ہمارا سلام ہے

اسرار جس کی ذات میں ہیں کُل جہان کے
اس محرمِ خدا کو ہمارا سلام ہے

رہتے ہیں جو ہمیشہ دیارِ رسولؐ میں
طیبہ کے ہر گدا کو ہمارا سلام ہے

ہم جیسے عاصیوں کی شفاعت کو اے ظفر
رحمت کی انتہا کو ہمارا سلام ہے

غزل

اپنے بارے میں جب بھی سوچا ہے
اس کا چہرہ نظر میں ابھرا ہے

تجربوں نے یہی بتایا ہے
آدمی شہرتوں کا بھوکا ہے

دیکھیے تو ہے کارواں ورنہ
ہر مسافر سفر میں تنہا ہے

اس کے بارے میں سوچنے والو
دیکھ لو اب یہ حال اپنا ہے

فکر کی تلخیوں میں گم ہو کر
آدمی بے سبب بھی ہنستا ہے

آرزو مند کوئی ہو تو کہوں
میرے دل میں بھی اک تمنا ہے

میرے چہرے پہ جو لکھا ہے نظر
غور سے کس نے اس کو سمجھا ہے

جمیل عظیم آبادی، ڈاکٹر

(۱۹۲۳ء......۲۰۱۱ء)

محمد جمیل احسن کا قلمی نام جمیل عظیم آبادی تھا۔ ہومیو پیتھک طرزِ علاج کے معالج تھے۔ والد کا نام محمد یوسف، دادا کا نام مولانا محمد اسماعیل اور پردادا کا نام مولوی امانت حسین تھا۔ جمیل عظیم آبادی کی پیدائش ۷رجنوری ۱۹۲۳ء میں عظیم آباد (پٹنہ بہار) میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ سے حاصل کر کے اسکول میں داخل ہوئے۔ پٹنہ یونیورسٹی سے ۱۹۴۳ء میں میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۴۶ء میں پٹنہ ہومیو کالج سے ایچ ایم بی کی ڈگری لی۔ ۱۹۴۴ء میں محکمہ پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف (انڈیا) میں ملازم ہوئے۔ ۱۹۴۰ء سے شاعری کا آغاز کرنے والے ڈاکٹر جمیل عظیم آبادی اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مشرقی پاکستان ڈھاکہ منتقل ہوئے۔ یہاں بھی ملازمت کا سلسلہ بدستور جاری رہا۔ ۱۹۵۳ء میں ان کا تبادلہ چاٹگام ہوا تو وہ وہاں جا بسے۔ ۱۹۵۷ء میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''جذباتِ جمیل'' کے نام سے طبع ہوا جو سقوطِ ڈھاکہ کی نذر ہو گیا۔ ۱۹۶۸ء میں وہ محکمۂ تار و ٹیلی فون میں اکاؤنٹس افیسر کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ۱۹۷۲ء کو سانحۂ مشرقی پاکستان کے بعد پاکستان آئے اور کراچی میں مقیم ہو گئے۔ پاکستان میں بھی محکمۂ تار و ٹیلی فون سے وابستہ رہے۔ تا آنکہ ۱۹۸۳ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو گئے۔ ۱۹۸۰ء میں ادبی تنظیم ''مجلسِ احبابِ ملت'' کا قیام عمل میں آیا تو اس سے وابستہ ہوئے۔ اس کے تحت ان کے دولت کدے پر ہر ماہ طرحی نعتیہ مشاعرہ برسہا برس تک منعقد ہوتا رہا۔ شعراء کے لیے وہ جس قدر اہتمام کرتے تھے وہ ان ہی کا حصّہ ہے۔

پاکستان میں ان کا پہلا شعری مجموعہ ''دل کی کتاب'' ۱۹۸۴ء میں طبع ہوا۔ گیتوں اور دوہوں

کا مجموعہ ''گیان درپن'' ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا۔ حمد و نعت کا مجموعہ ''وحدت و مدحت'' ۱۹۸۷ء میں طبع ہوا۔ نظموں کا مجموعہ ''آب و سراب'' ۱۹۹۳ء میں جلوہ گر ہوا۔ غزلوں کا دوسرا مجموعہ ''گلہائے صد نگار'' ۱۹۹۴ء میں طباعت سے گزرا۔ ثلاثی، ماہیے، ہائیکو کا مجموعہ ''گل سہ برگ'' ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا۔ حمد کا مجموعہ ''الرحمٰن'' ۲۰۰۰ء میں منظر عام پر آیا۔ نعتوں کا مجموعہ ''المدثر'' ۲۰۰۱ء میں جلوہ افروز ہوا

۲ راگست ۲۰۰۲ء میں انہوں نے پہلی کہانی ''کفارہ'' کے نام سے لکھی۔ ۲۰۰۳ء میں ''روایت کے قیدی'' کے نام سے ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا۔ ایک ہزار ایک سو گیارہ دوہوں کا مجموعہ ''دوہا سنسار'' ۲۰۰۴ء میں طبع ہوا۔ کہانیوں کا دوسرا مجموعہ ''روشنی'' ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا۔ ''میری نظر میں'' ان کی وہ کتاب ہے جو ان کے لکھے ہوئے مضامین اور تبصروں پر مشتمل ہے اور ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی۔ ''نامراد اور دوسری کہانیاں'' ان کی کہانیوں کا تیسرا مجموعہ ۲۰۰۹ء میں شائع ہوا

ڈاکٹر ذوالقرنین احمد المعروف ڈاکٹر شاداب احسانی کی نگرانی میں جامعہ کراچی کی ایک طالبہ علیزہ صدیقی نے ۲۰۰۹ء میں ایم اے اردو فائنل کے لیے ''جمیل عظیم آبادی شخصیت اور فن'' کے عنوان سے مقالہ تحریر کر کے سند حاصل کی۔ ۲۰۱۰ء میں اس مقالے کو کتابی صورت میں میڈیا گرافکس نے بہ اہتمام شائع کیا۔ اس کے صفحات ۲۶۴ ہیں۔

جمیل عظیم آبادی ساری زندگی قلمی اور عملی ہر دو صورتوں میں اردو ادب کی خدمت میں مصروف رہے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں جبکہ ضعیفی کی وجہ سے مشاعروں کا انعقاد و انتظام ممکن نہ رہا تو اپنے ڈرائنگ روم میں ہر بدھ کو نشستیں کرانے لگے۔ خود بھی ناسازیٔ طبع کے باوجود شریک رہتے ادبی دوستوں کو احترام دیتے اور کھانے پینے کا پرتکلف اہتمام کرتے۔ وہ اپنی تمام تر یادوں اور حسین رویوں کے ساتھ ہر اس شخص کے دل میں زندہ رہیں گے جس نے ایک بار بھی ان سے ملاقات کا شرف حاصل کر لیا۔ شعر و ادب کا یہ مخلص خدمت گار ۹ رمئی ۲۰۱۱ء میں خاک نشین کراچی میں شامل ہو گیا۔

ڈاکٹر شہزاد احمد اسی شہر کراچی میں مقیم ہیں۔ اور اسی شہر کی مادر علمی سے انہوں نے پی ایچ ڈی

کا اعزاز حاصل کیا۔ ۱۹۸۰ء سے مجلسِ احبابِ ملت نے نعت کے فروغ میں جو کام کیے ہیں معمولی نہیں۔ تقریباً تیس سال ہر ماہ طرحی نعتیہ مشاعرے کرائے، ان مشاعروں میں شامل شعراء کی نعتیں ''انوارِ حرم'' کے نام سے غالباً انیس شماروں میں شائع کرائیں۔ یہ تمام شمارے نعت ریسرچ سینٹر، کراچی (سید صبیح الدین صبیح رحمانی) میں بھی محفوظ ہیں جس سے شہزاد احمد کا خاص تعلق بھی ہے۔ حیرت ہے کہ ڈاکٹر شہزاد احمد نے فروغِ نعت کے حوالے سے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے میں نہ اس مجلس کو کوئی نمائندگی دی نہ اس کے تحت شائع ہونے والے نعتیہ مجلوں ''انوارِ حرم'' کو قابلِ اعتنا سمجھا۔

شہزاد احمد نے سوال اٹھایا کہ ''پاکستان کے نعت گو شعرا'' جلد اوّل میں جمیل عظیم آبادی کی کوئی اور سنہ پیدائش ہے اور'' خاک میں پنہاں صورتیں میں'' کوئی اور۔ ڈاکٹر شہزاد کو چاہیے کہ خود تحقیق کر کے معلوم کرلیں کہ جلد اوّل کی طباعت کے وقت وہ زندہ تھے۔ اور خاک میں پنہاں صورتیں' جب آئی تو وہ مرحوم ہو چکے تھے۔ تازہ معلومات جو سامنے ہیں اس کے اعتبار سے میں نے ان کا سن پیدائش تحریر کر دیا فیصلہ کرنا ان کا کام ہے۔ کوئی سوال اٹھانے سے پہلے وہ ذرا غور کرلیا کریں۔

نعت

انوارِ نبیؐ کے جلوؤں سے ہر گوشۂ دل معمور ہوا
وحدت کا اُجالا پھیل گیا، الحاد کا سایہ دُور ہوا

طیبہ کا تصور کیا کہیے، روضے کی تجلی کیا کہیے
ہر ظلمتِ شب مہتاب ہوئی، ہر رنگِ سحر پُر نور ہوا

ہر دکھ کا مداوا چاہ تریؐ، ہر زخم کا مرہم یاد تریؐ
اے رحمتِ عالمؐ صدقے ترے، ہر دردِ جگر کافور ہوا

دیدار کی حسرت حد سے بڑھی تو اذنِ حضوری مل ہی گیا
کعبے کی زیارت راس آئی، طیبہ کا سفر مقدور ہوا

تعلیمِ نبیؐ کی دولت سے، تقلیدِ نبیؐ کی عظمت سے
ہر وہم و گماں کافور ہوا، ہر ذرۂ عالم طور ہوا

بے تاب جمیلِ زار پہ بھی ہو جائے کرم اے شاہِ اُممؐ
دنیا کے مصائب میں گھر کر دل اُس کا بہت رنجور ہوا

غزل

توڑ کے ناطہ ہم سجنوں سے پگ پگ وہ پچھتائے ہیں
جب جب ان سے آنکھ ملی ہے تب تب وہ شرمائے ہیں

روپ نگر کو چھوڑ کے جب سے آس نگر کو آئے ہیں
صحرا صحرا دھوپ کڑی ہے پیڑ نہ کوئی سائے ہیں

جنگل جنگل آگ لگی ہے دریا دریا پانی ہے
نگری نگری تھاہ نہیں ہے لوگ بہت گھبرائے ہیں

سچائی ہے امرت دھارا سچائی انمول سہارا
سچ کے رستے چل کے سب نے ٹھور ٹھکانے پائے ہیں

دولت تو ہے آنی جانی روپ نگر کی رام کہانی
دھن کے لوگ بھی دھرتی پہ کب سکھ سے رہنے پائے ہیں

شیشہ جب بھی ٹوٹے گا جھنکار فضا میں گونجے گی
جب ہی کومل دیش دلارے پتھر سے ٹکرائے ہیں

جھوٹ کا ڈنکا بجتا تھا جس وقت جمیلؔ اس نگری میں
ہر رستے ہر موڑ پہ ہم نے سچ کے علم لہرائے ہیں

جمیل ملک

(۱۹۲۸ء۔۲۰۰۱ء)

عبدالجمیل ملک نے ۱۲/ اگست ۱۹۲۸ء کو ملک کریم بخش کے گھر راولپنڈی میں اپنی حیات کی پہلی سانس لی۔ جمیل کا قلم میدان تحریر میں کوئی نصف صدی سے زیادہ متحرک رہا ہے جس کی وجہ سے ہمہ اقسام ادب پر اپنی تخلیقی تحقیقی و تنقیدی صلاحیتوں کو خوب خوب اجاگر کرنے کے مواقع ملے۔ جمیل ملک نے اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کے ادب کے فروغ کے لیے اپنے قلم کو وقف کیا تھا اور ان کی تمام اصناف پر عبور بھی حاصل کر لیا تھا۔

''سرو چراغاں'' (۱۹۵۸ء)، ''پردہ سخن'' (۱۹۷۵ء)، ''شاخ سبز'' (۱۹۸۶ء)، ''شائستۂ بہار'' (۱۹۹۸ء)، ''زخم ہنر'' (۱۹۹۹ء)، اور ''پس اظہار'' (۲۰۰۰ء)، ان کے غزلوں کے مجموعے ہیں جبکہ نظم میں ان کی جولانیاں اور فکر رسا کو ''طلوع فردا'' (۱۹۶۲ء)، ''پس آئینہ'' (۱۹۸۴ء)، ''خورشید جاں'' (۱۹۹۶ء)، ''وصال رنگ رنگ'' (۱۹۹۹ء)، اور گیتوں کا مجموعہ ''جھروکے'' میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ نثری تصانیف میں ''ندیم کی شاعری، فکر و فن اور شخصیت'' (۱۹۷۲ء) کے علاوہ ''ادبی منظر نامے'' (۱۹۹۶ء) ان کی یادگار ہیں۔

جمیل ملک کو نعت رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے دلی لگاؤ تھا جس کا اظہار ان کے حمد و نعت کے مجموعے ''اوصاف'' میں نظر آتا ہے۔ ۱۳/ نومبر ۲۰۰۱ء راولپنڈی کی خاک میں زمانہ دراز تک اپنی تحریریں آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑ کر عبدالجمیل ملک پنہاں ہو گئے۔

نعت

درِ کیف الوریٰ ہے اور میں ہوں
مقامِ مدعا ہے اور میں ہوں

کرم ہے رحمۃ للعالمیں کا
مدینے کی فضا ہے اور میں ہوں

کہاں میں اور کہاں دربار والا
کرم کی انتہا ہے اور میں ہوں

نظر اٹھتی نہیں پاسِ ادب سے
کوئی جلوہ نما ہے اور میں ہوں

میسر ہے عجب کیفِ حضوری
دلِ درد آشنا ہے اور میں ہوں

کرم کی بارشیں ہیں اور وہ ہیں
محبت کا صلہ ہے اور میں ہوں

جمیلؔ اللہ اکبر میری قسمت
دیارِ مصطفیٰ ہے اور میں ہوں

غزل

راہِ طلب میں آج یہ کیا معجزہ ہوا
خوابِ عدم میں جو بھی گیا جاگتا ہوا

میداں میں ہار جیت کا یوں فیصلہ ہوا
دنیا تھی ان کے ساتھ ہمارا خدا ہوا

لایا ہے رنگ خونِ شہیداں بہ فیضِ شوق
نظروں کے سامنے ہے گلستاں کھلا ہوا

پتھر بنے ہوئے تھے زباں دے گیا ہمیں
احساس کی رگوں میں لہو بولتا ہوا

راہیں سمٹ کے نگاہوں میں آ گئیں
جو بھی قدم اٹھا وہی منزل نما ہوا

جاں نذر کی تو دونوں جہاں مل گئے ہمیں
طے مرگ و زندگی کا ہر اک مرحلہ ہوا

یوں دل میں آج نور کی بارش ہوئی جمیل
جیسے کوئی چراغ جلادے بجھا ہوا

حامد علی سید

روشنیوں کا شہر کراچی جو پاکستان کا معاشی حب ہے اور یہاں کا ادبی پس منظر ملک کے ادبی پس منظر سے یکسر مختلف ہے۔ اسی شہر میں حامد علی سید ۳ر اکتوبر ۱۹۵۳ء کو لیاقت آباد میں پیدا ہوئے اور یہاں کے ادبی ماحول میں بڑے ہوئے۔ یہ شعر و ادب سے تعلق رکھنے والے ہمہ صفت انسان ہیں۔ علم دوستی ان کا نقطۂ نظر ہے۔

حامد علی سید کی شاعری میں جو چیز نمایاں ہے وہ انسانی اقدار/ انسان دوستی ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "اُبھرتا ڈوبتا سورج" (۱۹۹۶ء) دوسرا مجموعہ کلام "شکستہ آئینہ خانے" (۲۰۱۰ء) میں شائع ہوا جبکہ تیسرا شعری مجموعہ "ریگزار میں دریا" تکمیل کے مراحل میں ہے ان کا حمدیہ/ نعتیہ مجموعہ "حروفِ مقدس" حلقۂ آہنگ نو کے زیرِ اہتمام جلد شائع ہونے والا ہے۔

حامد علی سید مختلف ادوار میں مختلف ادبی تنظیموں سے وابستہ رہے ہیں جن میں انجمن بہار ادب، حلقہ آہنگ نو، بزم شمیم ادب، ڈائیلاگ وغیرہ شامل ہیں۔ وہ مختلف ادبی جرائد سے بھی منسلک رہے ہیں جن میں سہ ماہی 'خیال' ماہنامہ نیرنگِ جہاں میں بطور مدیر خدمات انجام دیں۔

حامد علی سید آج بھی متحرک ہیں اور ادبی حلقوں میں معروف ہیں۔ کراچی شہر میں اور مضافاتی علاقوں میں بھی بطور شاعر اور نظامت کار شریک ہوتے ہیں۔ وہ آج کل انجمن ترقی پسند مصنفین، کراچی کے شعبہ اطلاعات کے سیکریٹری ہیں۔ ان کی نعت کا ایک نمائندہ شعر:

زندگی دھوپ کی پوشاک اُتار آئی ہے
نعت لکھی تو مرے گھر میں بہار آئی ہے

◆◆◆

نعت

جس کا بھی شہِ دینؐ پہ ایقان رہے گا
تا حشر وہی صاحبِ ایمان رہے گا

نکلے گا سفر میں جو دُرودوں کے سہارے
رستے میں نہ اُس کے کوئی بحران رہے گا

طیبہ کے مناظر جو بسائے گا نظر میں
پھولوں سا تر و تازہ وہ انسان رہے گا

منزل پہ پہنچنا ہے تو طیبہ کی طرف دیکھ
یہ راستہ تیرے لیے آسان رہے گا

اک نعت ضروری سرِ فہرست ہو ورنہ
خاشاک کی صورت ترا دیوان رہے گا

دنیا میں کرم جس پہ ہُوا میرے نبیؐ کا
حامد وہ سرِ عرش بھی ذیشان رہے گا

غزل

نئے نصاب ، نئی داستان لکھتے ہیں
زمین پہ بیٹھ کے ہم آسمان لکھتے ہیں

تھکن میں لپٹے ہوئے بال و پر لکھے تم نے
بلندیوں کی طرف ہم اڑان لکھتے ہیں

لکھے ہے خوف مرا طفل اپنی تختی پر
امیرِ شہر کے بچے امان لکھتے ہیں

کسی کے زیرِ اثر کام کرنے والے لوگ
حقیقتوں کو چھپا کر گمان لکھتے ہیں

لکھا ہے میرؔ نے برسوں جسے جگرؔ نے لکھا
وہی زبان ہم اہلِ زبان لکھتے ہیں

خدا کے فیصلے برحق ہیں آسماں پہ مگر
یہاں زمین کی قسمت کسان لکھتے ہیں

عجیب لوگ ہیں وہ ریگزار میں حامدؔ
جھلس رہے ہیں مگر سائبان لکھتے ہیں

حسرت حسین حسرت

(۱۹۲۵ء۔۱۹۹۷ء)

بہار ہندو تہذیب کا گڑھ ہے۔ یہاں مختلف ادیان و مذاہب کے پیروکار پائے جاتے ہیں، اسی مردم خیز خطے میں حسرت حسین حسرت نے ۱۹۲۵ء میں جنم لیا۔ ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی۔ قیامِ پاکستان کے بعد مہاجرت کی دشواریوں اور کٹھنائیوں سے نبرد آزما ہوئے۔ ریلوے کے محکمے میں ملازمت اختیار کی۔ ۲۵ ربرس کی عمر سے نعت گوئی کا آغاز کیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد مستقل طور پر لاہور میں رہائش رہی۔ مروجہ تعلیم انٹرمیڈیٹ ہے۔ انگریزی زبان لکھنے پر اُن کو مکمل عبور حاصل تھا۔ اُن کی انگریزی میں کہی ہوئی نعتیں انگریزی داں طبقے میں قابلِ قدر گردانی گئیں۔

شعروسخن کے سلسلے میں مزدور شاعر احسان دانش سے سلسلۂ تلمذ رہا اور اُن کی زندگی میں بغیر کسی وقفے کے حسرت حسین حسرت اُن کے دانش کدے پر حاضر ہونے کو اپنے لیے اعزاز سمجھتے اور اُن سے کسبِ فیض کرتے رہے۔

"مسلوات" میں موجود اُن کی شاعری کو اُن کے صاحب زادے نے بہ طور اثاثۂ علم وادب مرتب کر کے بعدِ مرگ شائع کیا۔

"مسلوات" کی نعتیہ شاعری ایک سچے اور راسخ العقیدہ مومن کی محبت و عقیدت سے پُر ایسی شاعری ہے جس میں دھنک رنگ نظر آتے ہیں۔ آپ کو آں حضرت (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی زیارت بھی عالمِ رویا میں نصیب ہوئی۔ حسرت حسین حسرت سادہ طبع، ملنسار، نرم خو اور خوش گفتار انسان کے طور پر علمی و ادبی حلقوں میں منفرد حیثیت و کردار کے حامل رہے۔ حسرت حسین حسرت کو احسان دانش کا جانشین بھی کہا جاتا ہے۔ سانحۂ ارتحال ۱۹ر مارچ ۱۹۹۷ء ہے۔

◆◆◆

نعت

دہلیزِ پیمبرؐ کا حسرت ہے تمنائی
جھکتی ہے جہاں آکر پرویزی و دارائی

یہ شان انوکھی ہے تیرے ہی فقیروں کی
باطن میں چمن گر تھے ظاہر میں تھے صحرائی

اے کاش کہ میں بیٹھوں بے خود درِ آقا پر
اللہ مجھے دے دے اک روز وہ تنہائی

ممکن ہے رقم کرنا وصفِ شہِ دیںؐ لیکن
گردوں کی بلندی تک ہو فکر کی پہنائی

جب بہرِ دعا اٹھے ہاتھ اُنؐ کی حضوری میں
رقت کے تسلسل میں گم تھی بڑی گویائی

ذرّہ ہو کہ سورج ہو تو سب کا مفسر ہے
تیری ہی بدولت ہے فطرت سے شناسائی

یہ نعتِ نبیؐ حسرت بے رنگ سہی لیکن
لفظوں میں عقیدت کی تصویر نظر آئی

غزل

تحیر میں تو ہو موجوں کا منظر دیکھنے والو
کبھی قطرے کو بھی دیکھو سمندر دیکھنے والو

ہے محنت کا پسینہ در حقیقت اس کا آئینہ
ہتھیلی کی لکیروں میں مقدر دیکھنے والو

بجالاؤ خدا کا شکر اپنی اس بصیرت پر
تمناؤں کو رنج و غم کا محور دیکھنے والو

تمہی وہ اہل فن ہو قید ہیں جو ذات میں اپنی
بنا کر آئینہ خود اپنا پیکر دیکھنے والو

خبر بھی ہے تمہیں سائے سے بھی محروم ہو اپنے
نئی تہذیب کا سورج سروں پر دیکھنے والو

مٹائے تم نے کتنے نقش تاباں علم و دانش کے
سمجھتے بوجھتے ہیرے کو پتھر دیکھنے والو

خموشی نے اسے بخشی ہے یہ توقیر گویائی
سخن نافہم حسرتؔ کو سخنور دیکھنے والو

پروفیسر حسن اکبر کمالؔ

(۱۹۳۶ء......۲۰۱۷ء)

سید حسن اکبر ۱۴/فروری ۱۹۳۶ء کو اکبر آباد (آگرہ) ہندوستان میں پیدا ہوئے اس وقت آزادیٔ پاکستان کی جدوجہد اپنے عروج پر تھی اس لیے والدین کے ہمراہ یہ پاکستان آ گئے، ان کی تمام تر تعلیم و تربیت پاکستان میں ہوئی۔ انگریزی ادب میں ماسٹرز کی ڈگری لینے کے بعد درس و تدریس کو اپنا ذریعہ معاش و مقدر جانتے ہوئے دہلی کالج کراچی میں بحیثیت لیکچرار بعد ازاں صدر شعبہ خدمات انجام دیں۔ نجی تحویل سے سرکاری کالج بننے کے باوجود دہلی گورنمنٹ کالج کا کراچی کے بہترین کالجوں میں شمار ہوتا ہے۔

سید حسن اکبر کو ادبی دنیا میں حسن اکبر کمال کے نام سے متعارف کروانے میں مقامی جریدہ "سیپ" کے مدیر اور پاکستان رائٹرز گلڈ کے سیکریٹری سندھ نسیم درانی کا اہم کردار رہا ہے۔ ان کی وجہ شہرت ٹی وی پر گائے جانے والے ملی نغمات بھی ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں شعر گوئی سے تعلق جوڑا، اس میدان میں اپنی شناخت الگ بنائی "سخن" مجموعہ کلام جو (۱۹۶۹ء) اور "خزاں میرا موسم" مجموعہ کلام (۱۹۸۰ء) میں ادب شناس حلقوں میں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ شاعری کے علاوہ ناول نویسی بھی کی، آپ کے ناول فیروز سنز اور شیخ غلام علی اینڈ سنز نے شائع کیے۔ پاکستان کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن کی جانب سے تمغہ برائے ادبی خدمات (۱۹۸۰ء) دیا گیا۔ "خزاں میرا موسم" پر آدم جی ادبی ایوارڈ رائٹرز گلڈ سے ملا۔ حسن اکبر کمال نے ختمی مرتبت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے محبت و عقیدت کے اظہار کے لیے نعتیہ پیرائے کو اپنایا۔ "التجا" ان کا نعتیہ مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔

سید محمد قاسم نے حسن اکبر کمال کی جو نعت پیش کی ہے اس میں تخلص اکبر ہے۔ یہ تو طے ہے کہ یہ نعت ''التجا'' میں موجود نہیں ہے۔ ناقدین اعتراض اٹھاتے ہیں کہ یہ نعت حسن اکبر کمال کی نہیں ہے کیونکہ وہ اکبر نہیں کمال کے تخلص سے لکھتے ہیں۔ مجھے یہ بات کہیں نہیں ملی کہ حسن اکبر کمال نے ''اکبر'' کے تخلص سے بھی لکھا ہو۔ اس کے تصفیے کی ایک ہی صورت ہے کہ حسن اکبر کمال خود اس راز سے پردہ اٹھادیں کہ حقیقت کیا ہے اور یہی زیادہ آسان ہے۔ سید محمد قاسم کی ''پاکستان کے نعت گو شعراء'' ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئی جبکہ ''التجا'' ۲۰۰۲ء میں شائع ہو چکی تھی۔ سید محمد قاسم کا معیار صاحب مجموعہ ہوتا ہے اس کے باوجود انہوں نے کتاب چھوڑ کر نعت کہیں اور سے لی۔ محقق اپنی تحقیق کو ثبوت سے پیش کرتا ہے دوسروں سے نہیں کہتا کہ وہ اس کے درست یا غلط کو ثابت کریں۔

کراچی کے دبستان نعت (صاحب کتاب نعت گو شعراء کا تذکرہ) ص ۲۵۱

سید محمد قاسم ''پاکستان میں غزل کے نعت گو شعراء'' میں منظر عارفی، شہزاد احمد، طاہر سلطانی ان تمام حضرات کے ممنون احسان ہیں کہ انہوں نے ہماری غلطی کو جس طرح سے دیکھا یہ انہی حضرات کا طرۂ امتیاز ہے۔ بہر حال میں نے اپنی کتاب میں پروفیسر اکبر کمال کے نعتیہ مجموعہ ''التجا'' سے ایک نعت منتخب کر کے لگا دی ہے البتہ ان کی غزل کے بارے میں میں نے اس کا ماخذ نہیں لکھا اور دوسرے شعراء کی غزلیں اور نعت درج کر رہا ہوں ان کے ماخذ میں نہیں لکھ رہا۔ آپ حضرات جن جن غلطیوں کی نشاندہی کرتے رہیں گے بات آگے چلتی رہے گی۔

◆◆◆

نعت

وہ سبز گنبد، سنہری جالی ، حرم کا جلوہ جو یاد آیا
تڑپ اٹھا دل ، وہاں سے آ کر دیارِ طیبہ جو یاد آیا

بس اک نظر نے بدل دیے ہیں بہار میں سارے زرد موسم
چمن ہوا ہے یہ دل کا صحرا، کرم کا دریا جو یاد آیا

خیال تھامے ہوا کا دامن ہوا روانہ سوئے مدینہ
ہوا یہ دل بے قرار کیسا ، وہ آستانہ جو یاد آیا

حریم سرکارؐ میں تھا حاضر، میں بے نوا، نعت گو مسافر
عجیب دل نے سکون پایا ، وہ ایک لمحہ جو یاد آیا

کیا غلاموں نے ناز اپنے حضورؐ کی قدر و منزلت پہ
برائے معراج، رب کا بھیجا ہوا سندیسہ جو یاد آیا

کمالؔ تُو نے انہیںؐ پکارا، تو مل گیا دائمی سہارا
یہ تجھ پہ اللہ کا کرم ہے ، تجھے وسیلہ جو یاد آیا

غزل

دل میں ترے خلوص سمویا نہ جاسکا
پتھر میں اس گلاب کو بویا نہ جاسکا

باقی ہیں اس پہ اب بھی پرانے غموں کے عکس
چہرہ تو آنسوؤں سے بھی دھویا نہ جاسکا

پھولوں کے جسم چھیدنے والوں سے آج تک
خوشبو کو برچھیوں میں پرویا نہ جاسکا

کیا ترجمانیٔ غم دنیا کریں کہ جب
فن میں خود اپنا غم بھی سمویا نہ جاسکا

شب خوں کی رسم ایسی پڑی اہل شہر میں
لوگوں سے لمحہ بھر کو بھی سویا نہ جاسکا

آنکھوں کی بستیوں میں بھی کیا قحطِ اشک تھا
چاہا کمالؔ روئیں تو رویا نہ جا سکا

ڈاکٹر حسن رضوی

(۱۹۳۶......۲۰۰۲)

۸/اگست ۱۹۳۶ء انبالہ میں سید کوثر عباس رضوی کے گھر ایک بچہ تولد ہوا جس کا نام حسن رضوی رکھا گیا، قیام پاکستان کے وقت جس کی عمر دو سال کے قریب تھی، انبالہ شہر سے ہجرت کی اور اپنے والدین کی گود میں پاکستان آگئے۔

ڈاکٹر حسن رضوی کی تمام تر تعلیم و تربیت پاکستان میں ہوئی وہ اپنے عہد کے ایک نمائندہ صاحب علم تھے، انہوں نے زندگی کے تمام شعبوں میں کام کیا اب ان کی شخصیت اس قدر بلند و بالا ہے کہ اب ان پر اہلِ علم مقالے تحریر کریں گے بلکہ بعید بھی نہیں کہ ایسا ہو بھی گیا ہو، راقم ''پاکستان کے نعت گو شعراء'' کا تذکرہ نگار ہے اسی لئے ڈاکٹر صاحب کو شاملِ تذکرہ کر کے یک گونہ فرحت محسوس ہو رہی ہے۔

ڈاکٹر حسن رضوی ادیب، شاعر، سفرنامہ نگار، صحافی و کالم نویس، کمپیئر، انچارج ادبی صفحہ روز نامہ جنگ لاہور رہے، ان سب کاموں سے ہٹ کر ایک بڑا کام یہ کیا کہ استاد صدر شعبہ اردو ایف سی کالج لاہور رہے۔ ''وہ ترا شاعر وہ ترا ناصر'' ناصر کاظمی پر ایک تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

حسن رضوی کو اردو پنجابی دونوں زبانوں پر یکساں عبور حاصل تھا، ان دونوں زبانوں میں ان کی یادگار تخلیقات موجود ہیں۔ ان کے اردو شعری مجموعے ''کوئی آنے والا ہے''، ''اس کی آنکھیں شام''، ''کبھی کتابوں میں پھول رکھنا''، ''خواب سہانے یاد آتے ہیں'' ہیں، اور پنجابی

مجموعۂ کلام ''ہجر کی پہلی شام'' ہے۔ ڈاکٹر حسن رضوی کے تحریر کردہ سفر نامے ''میں نے ہندوستان دیکھا'' (۱۹۹۲ء)، ''چینیوں کے چین میں'' (۱۹۹۳ء)، ''بڑے سمندروں کے سفر'' (۱۹۹۵ء)، اور نعتیہ مجموعہ ''جمال احمد مرسل'' (۱۹۹۶ء)، اور ''مدینے کی ہوا'' شائع ہوئے۔

ڈاکٹر حسن رضوی کے علمی و ادبی کاموں پر ان کو گراں قدر اعزاز سے نوازا گیا ''صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی'' قاضی عبدالغفار عالمی اردو ایوارڈ بھارت۔

ان تمام تصانیف کے مالک ڈاکٹر حسن رضوی ۵/فروری ۲۰۰۲ء کو خالق حقیقی سے جا ملے اور اہلِ علم حضرات کے لئے اپنی یادگار تحریریں چھوڑ گئے۔ ان کے نعتیہ مجموعوں کو دینی ادب کے قارئین مدتوں یاد رکھیں گے آخری آرام گاہ فردوسیہ قبرستان فیروز پور لاہور میں ہے۔

نعت

وہی ہے استعارہ نوعِ انساں کی بلندی کا
زمیں سے جا کے جس نے آسمانوں پر قدم رکھا

گھٹن رُت میں وہی انعام تھا تازہ ہواؤں کا
عرب کے ریگزاروں میں جو بادل بن کے برسا تھا

اُسی نے حرفِ حق سے اِک نئی تاریخ لکھی تھی
وہ لہجے میں خدا کے میٹھی میٹھی بات کرتا تھا

کسے معلوم تھا کہ مہکے گی اِک دن وادیٔ بطحا
اُسی نے غنچے غنچے کو چٹکنا آ کے سکھلایا

اُسی کی روشنی میں آج سب کچھ دیکھ سکتے ہیں
وہ سورج جس کی کرنوں نے اندھیروں کو مٹا ڈالا

وہ اِک نورِ مجسّم ! ہر طرف جس کا اُجالا ہے
زمین و آسماں میں اب تلک اُس کو نہیں دیکھا

درود اُس پر سلام اُس پر مرا سب کچھ فدا اُس پر
وہ جس نے ہم کو آ کر زندگی کا راز بتلایا

غزل

کبھی کتابوں میں پھول رکھنا کبھی درختوں پہ نام لکھنا
ہمیں بھی ہے یاد آج تک وہ نظر سے حرفِ سلام لکھنا

وہ چاند چہرے وہ بہکی باتیں سلگتے دن تھے مہکتی راتیں
وہ چھوٹے چھوٹے سے کاغذوں پہ محبتوں کے پیام لکھنا

گلاب چہروں سے دل لگانا وہ چپکے چپکے نظر ملانا
وہ آرزوؤں کے خواب بُننا وہ قصۂ نا تمام لکھنا

مرے نگر کی حسیں فضاؤ کہیں جو اُن کا نشان پاؤ
تو پوچھنا یہ کہاں بسے وہ کہاں ہے ان کا قیام لکھنا

کھلی فضاؤں میں سانس لینا عبث ہے، اب تو گھٹن ہے ایسی
کہ چاروں جانب شجر کھڑے ہیں صلیب صورت تمام لکھنا

گئی رتوں میں حسن ہمارا بس ایک ہی تو یہ مشغلہ ہے
کسی کے چہرے کو صبح کہنا کسی کی زلفوں کو شام لکھنا

پروفیسر حُسین سحر

خادم حسین دس اکتوبر ۱۹۴۲ء کو ضلع فیروز پور بھارت کے گاؤں جلال آباد میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام حاجی میاں برکت علی تھا۔ ایم اے اُردو، ایم اے پنجابی، ایم اے اسلامیات کے حامل خادم حسین نے ایجوکیشن کی ڈگری بی ایڈ اور وکالت کی ڈگری ایل ایل بی بھی حاصل کی۔ شاعری، نقد و نظر اور نونہالوں کا ادب کے علاوہ تراجم میں بھی اُن کو مہارت حاصل رہی۔ شعرو ادب کی دنیا میں اُنھیں حسین سحر کہا جاتا ہے۔

سرکاری کالج سول لائنز ملتان میں معاون پروفیسر کے طور پر خدمات انجام دینے والے خادم حسین سحر کی کتاب "پھول اور تارے" (نونہال ادب) پر پاکستان رائٹرز گلڈ نے ادبی انعام دیا تھا۔ حمد و نعت پر مشتمل شعری مجموعے "تقدیس" اور سیرت کی کتاب "پیارے رسول" (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) پر صدرِ پاکستان کی جانب سے قومی سیرت ایوارڈ سے نوازا گیا۔ بچوں کے لیے کہانی کی کتاب "سپنوں کی وادی" نیشنل بک کونسل آف پاکستان نے منتخب کتاب کے طور پر شائع کی۔ سلام و منقبت کا مجموعہ "تطہیر"، سلام کا مجموعہ "لہو لہو"۔ مناقب علی کرم اللہ وجہہ بعنوان "باب العلم" اور غزلوں کا مجموعہ "تخاطب" شائع ہونے والی کتابیں ہیں۔ "تخاطب" کو ادبی حلقوں میں خاصی پذیرائی ملی، اس کتاب میں شامل شاعری کو اُن کے تیکھے لب و لہجے کی وجہ سے پسند کیا گیا اور اس کا ادبی حلقوں میں چرچا رہا۔ عبدالعزیز خالد کے فن اور شخصیت پر کتاب "خالد، شخص و شاعری" اُن کی بہترین تالیف ہے۔

◆◆◆

نعت

وجہِ تخلیقِ ممکنات ہیں آپؐ
رونقِ محفلِ حیات ہیں آپؐ

آپؐ کے دم سے ہے بہارِ جہاں
باعثِ حُسنِ کائنات ہیں آپؐ

سایہ کیسے ہو آپؐ کا ممکن
پرتوِ نورِ اسمِ ذات ہیں آپؐ

آپؐ کا نام زندگی کا پیام
چارۂ تلخیٔ حیات ہیں آپؐ

آپؐ کا حرف حرف ہے قرآں
نورِ آیات، بیّنات ہیں آپؐ

آپ احمدؐ بھی ہیں محمدؐ بھی
عکسِ آئینہ صفات ہیں آپؐ

نوعِ انساں بھٹک نہیں سکتی
رہبرِ منزلِ نجات ہیں آپؐ

غزل

اتنی سی اس جہاں کی حقیقت ہے اور بس
گفتار زیرِ لب ہے سماعت ہے اور بس

کیوں آشنائے چشم ہو دیدار حُسن کا
یہ گریہ آزمائی تو عادت ہے اور بس

اتنے سے جرم پر تو نہ مجھ کو تباہ کر
تھوڑی سی مجھ میں تیری شباہت ہے اور بس

اس کو جزا سزا کے مراحل میں دے دیا
جس پاس ایک عمر کی مہلت ہے اور بس

آیا جو دورِ دشت اچانک ہی سامنے
ایسا لگا کہ تیری اجازت ہے اور بس

ہم نے کہا کہ ختم ہوئے سب معاملات
دل نے کہا کہ کیا ہے قیامت ہے اور بس

آئینہ دار ہوں کہ ترا پردہ دار ہوں
پیشِ نگاہ تیری محبت ہے اور بس

حفیظ جالندھری

(۱۹۰۰......۱۹۸۲)

محمد حفیظ جالندھری ۱۹۰۰ء میں جالندھر (مشرقی پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ موصوف کی زندگی جدوجہد سے پُر ہے۔ کسبِ معاش کی فکر دامن گیر رہی اور اسی سبب سے وہ اپنی تعلیم مکمل نہ کر سکے۔ اُن کی زندگی میں کئی مرحلے ایسے آئے کہ عام آدمی اُن مراحل سے بہ آسانی گزر نہیں سکتا لیکن حفیظ بلند خیال اور ثابت قدم واقع ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے فکر و فن سے کنارہ کش نہ ہوئے۔ شب و روز اس کے فروغ میں کوشاں رہے۔ ملک الشعرا جناب شیخ غلام قادر گرامی جیسے جید اساتذۂ وقت سے استفادۂ سخن کیا۔

حفیظ جالندھری کو دوسری جنگِ عظیم کے دوران حکومتِ برطانیہ نے ہندوستان میں جنگی مقاصد کے ابلاغی شعبہ کے لیے افسرِ اعلیٰ مقرر کیا اور کئی القابات سے نوازا۔ ''خان صاحب'' اور ''خان بہادر'' کا خطاب ملا۔ تخلیقِ پاکستان کے لیے اُن کا قلم گوہر فشاں رہا ہے۔ اسلامی تاریخ پر اُن کی گہری نظر ہے اور ''شاہ نامۂ اسلام'' کی نظمیں اُس کی آئینہ دار ہیں۔ موصوف خوش قسمت انسان واقع ہوئے تھے کہ ''ترانۂ پاکستان'' تخلیق کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔

۱۹۸۲ء میں اہلِ پاکستان کو یہ صدمہ برداشت کرنا پڑا کہ ملک کا ایک ممتاز نظم گو شاعر ہم سے جدا ہو گیا۔

''شاہ نامۂ اسلام'' اگرچہ مکمل نعت کا کوئی مجموعہ نہیں۔ تاہم اس میں نعتیہ اشعار کی کمی نہیں ہے۔ اُن کی وہ تاریخی نظم جو سرکارِ مدینہ کی بعثت سے تعلق رکھتی ہے، اس میں شامل ہے۔ اس نظم میں محبت اور وارفتگی کی ایک خاص کیفیت موجود ہے جو حسنِ عقیدت کا اعلیٰ نمونہ بھی ہے۔

نعت

سلام اے آمنہؓ کے لالؐ، اے محبوبِ سُبحانی
سلام اے فخرِ موجودات، فخرِ نوعِ انسانی

سلام اے ظلِّ رحمانی، سلام اے نورِ یزدانی
ترا نقشِ قدم ہے زندگی کی لوحِ پیشانی

سلام اے سرِّ وحدت، اے سراجِ بزمِ ایمانی
زہے یہ عزت افزائی، زہے تشریف ارزانی

ترے آنے سے رونق آ گئی گلزارِ ہستی میں
شریکِ حالِ قسمت ہو گیا پھر فضلِ ربانی

سلام اے صاحبِ خلقِ عظیم انساں کو سکھلائے
یہی اعمالِ پاکیزہ، یہی اشغالِ روحانی

تریؐ صورت، تریؐ سیرت، تراؐ نقشہ، تراؐ جلوہ
تبسم، گفتگو، بندہ نوازی، خندہ پیشانی

غزل

او دل توڑ کے جانے والے دل کی بات بتاتا جا
اب میں دل کو کیا سمجھاؤں مجھ کو بھی سمجھاتا جا

ہاں میرے مجروح تبسم ' خشک لبوں تک آتا جا
پھول کی ہست و بود بھی ہے کھلتا جا مرجھاتا جا

میری چپ رہنے کی عادت ، جس کارن بدنام ہوئی
اب وہ حکایت عام ہوئی سنتا جا شرماتا جا

یہ دکھ درد کی برکھا بندے دین ہے تیرے داتا کی
شکر نعمت بھی کرتا جا دامن بھی پھیلاتا جا

جینے کا ارمان کروں یا مرنے کا سامان کروں
عشق میں کیا ہوتا ہے ناصح عقل کی بات بتاتا جا

نغمے سے جب پھول کھلیں گے چننے والے چن لیں گے
سننے والے سن لیں گے تو اپنی دھن میں گاتا جا

آخر تجھ کو بھی موت آئی خیر حفیظ خدا حافظ
لیکن مرتے مرتے پیارے وجہ مرگ بتاتا جا

حفیظ تائب

عبدالحفیظ تائب، حاجی چراغ الدین قادری سہروردی کے گھر ۱۴ر فروری ۱۹۳۱ کو احمد نگر ضلع گوجرانوالہ میں پیدا ہوئے۔ موصوف پنجابی ادب میں ایم اے اور درس و تدریس کے پیشہ سے وابستہ ہیں۔ تائب پورے انہماک سے ایک توانا اسلامی ادب تخلیق کرنے اور اِسے پروان چڑھانے میں مصروف ہیں۔ دورِ حاضر کی فکری کج روی سے دامن بچاتے ہوئے اپنی تمام فنی صلاحیتوں کو رسولِ گرامی (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم) کے ارشادات کی ترجمانی اور اُسوۂ حسنہ کی عکاسی میں صرف کر رہے ہیں۔

میں اپنے "پاکستان کے نعت گو شعراء" کے قارئین کے لیے ایک واقعہ بیان کرتا ہوں۔ 1990 کی بات ہے میں پاکستان کے نعت گو شعرا کے مواد جمع کرنے کی غرض سے لاہور گیا ہوا تھا۔ شوقِ ملاقات اس قدر مجھ پر غالب رہا کہ میں گھر سے پنسل اور کاپی لے جانا بھول گیا اور اورئینٹل کالج پہنچ کر انہیں اطلاع کرائی کہ میں کراچی سے آیا ہوا ہوں اور نعت کے حوالے سے معلومات جمع کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے چپراسی کے ذریعہ چٹ بھیجی کہ آپ ویٹنگ روم میں انتظار فرمائیں میں کلاس میں ہوں۔ کلاس ختم ہوئی تو انہوں نے شرفِ ملاقات بخشا اور میں نے اپنا پورا مدعا ان سے بیان کر دیا وہ چلچلاتی دھوپ میں رکشہ لے کر راجہ رشید محمود کے گھر گئے۔ جعفر بلوچ کے گھر گئے اور سب کو بتایا کہ یہ نوجوان کراچی سے آیا ہوا ہے اور پاکستان کے نعت گو شعرا کے اوپر کام کر رہا ہے اور جس جگہ وہ میرا تعارف کراتے میں اکثر شرمندہ ہو جاتا۔ ایک واقعہ قارئین کی نظر ہے۔ حق باہو فیملی سے تعلق رکھنے والی کوئی خاتون بیمار تھیں جن کی عیادت کے لیے وہ جا رہے تھے مجھے بھی ساتھ

لیتے گئے وہاں جانے کے بعد معلوم ہوا کہ صاحب وہاں ایک پُر تکلف کھانے کا انتظام ہے۔ وہاں ایک خانقاہی بیان ہے اور ایک نعتیہ مجلس بھی ہے۔ جب یہ سارے مدارج اختتام پذیر ہوئے تو میں حفیظ تائب کی بغل میں بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر کہا کہ شاہ صاحب دعا کرائیں۔ میں ان کی اس بات سے ڈر گیا کہ اب کیا ہوگا اور دل میں اللہ تعالیٰ سے مانگنے لگا کہ اے اللہ تو مجھے جانتا ہے اور یہ جو کہہ رہے ہیں میں اس کا اہل نہیں ہوں۔ حفیظ تائب نے مجھ سے کہا شاہ صاحب جو آتا ہے کہیں۔ میں نے درود تنجینا پڑھ کر دعا شروع کی۔ مجھے اپنی کم علمی اور جہل پر بے اختیار رونا آ رہا تھا۔ میں خود بھی رو رہا تھا اور اہلِ محفل بھی رو رہے تھے اور یوں یہ مجلس اختتام کو پہنچی۔ ایک ہفتہ کے بعد وہ دوبارہ ملنے کے لیے آئے تو ان کے پاس مٹھائی کی ایک بڑی ٹوکری تھی میں اپنے خالہ زاد بھائی سنجر رزاقی کے گھر رکا ہوا تھا۔ انہوں نے کہا بھئی یہ مٹھائی کا کیا سلسلہ ہے تو تائب صاحب نے کہا جس مریضہ کے لیے آپ نے دعا کرائی تھی یہ اسی کی طرف سے ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ طاہر سلطانی جس محفل میں ہوں اگر میری ملاقات ان سے ہو تو وہ فوراً ہی مجھے دعا کے لیے کہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ دونوں تصوف کے لوگ ہیں اور جانتے ہیں کہ کس سے کیا کام لینا ہے۔

تائب شاعرِ شیریں مقال، خوش گفتار اور شعائرِ اسلامی سے وابستہ انسان ہیں۔ سرورِ دو جہاں سے محبت و عقیدت اُن کی زندگی کا نصب العین ہے۔ وہ اسی محور پر زندگی کے شب و روز گزارنے کے عادی ہیں۔

حفیظ تائب کی نگارشات یہ ہیں "صلو علیہ و آلہٖ" (اردو مجموعہ نعت) 1978 'سک متراں دی (پنجابی مجموعہ نعت) 1978' "وسلموا تسلیما" (اردو مجموعہ نعت) 1990 '(وزارت مذہبی امور کی جانب سے پہلا صدارتی ایوارڈ) وہی یٰسیں وہی طٰہٰ (اردو مجموعہ نعت) 1998 (وزارت مذہبی امور کی جانب سے پہلا صدارتی ایوارڈ، وزارت اوقاف پنجاب کا پہلا ایوارڈ نیشنل لٹریری ایوارڈ اور وزیر اعظم ادبی انعام برائے نعت گوئی بھی حاصل کیا) مناقب (اردو مجموعہ مناقب) 1999 ، لیکھ (پنجابی حمد' نعت' منقبت' غزل' نظم گیت) 2000 'کوثریہ (اردو مجموعہ نعت) 2003 ، (وزارت مذہبی امور کی جانب سے پہلا صدارتی ایوارڈ) نسیب (اردو مجموعہ غزل)

2003، تعبیر (اردو قومی و ملی منظومات) 2003، کلیات حفیظ تائب 2005ء

ڈاکٹر عاصی کرنالی ''اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر'' صفحہ ۴۰۰ پر رقم طراز ہیں:

''ریاض مجید کے بقول'' پاکستان اور ملت اسلامیہ کو درپیش مسائل کا اظہار جس شائستگی سے ان کی نعتوں میں ملتا ہے دوسروں کے ہاں نظر نہیں آتا۔ مسلمانوں کی زبوں حالی، پاکستان میں سیاسی انتشار، اخلاقی و مذہبی قدروں کی پامالی، سے لے کر مسجد اقصیٰ تک کے ماتم، افغانستان میں روسی جارحیت پر نالہ و فریاد کے جو مضامین تائب کی نعت گوئی میں ملتے ہیں ان کے سبب نہ صرف تائب کے فن بلکہ صنفِ نعت کو وسعت ملی ہے''

ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق کی رائے میں'' فکر و فن کے اعتبار سے حضرت تائب کی فضیلت کے کئی اسباب ہیں۔ ایک تو یہ کہ ازل کی نعمتوں میں انہیں عشقِ رسولؐ عطا ہوا اور نعت گوئی ان کا مقدر قرار پایا ہے پھر اس عظیم کام کے لیے جو صلاحیت انہیں ملی ہے وہ محض عطیہ ربانی ہے۔ جو ان کی کرامت کی بڑی دلیل ہے۔ ان کے کلام میں مضامین کی رنگا رنگی، بیان کی سادگی، الفاظ کی فراوانی، تراکیب لغت کی جاذبیت، مروجہ بحروں کا حسنِ انتخاب، نئی بحروں کے تجربے، مشکل اور طویل ردیفوں کی جدت، تشبیہات و استعارات کی ندرت اور نورِ علیٰ نور شاعر کے لہجے کا انکسار اور نیاز مندانہ بیان، یہ سب مل کر ان کے کلام کی لفظی اور معنوی خوبیوں کو چار چاند لگا دیتے ہیں''

نعت

مٹی دہر سے کفر و باطل کی ظلمت، زمیں جگمگائی، فلک جگمگایا
ہوا جلوہ گر آفتابِ رسالتؐ، زمیں جگمگائی، فلک جگمگایا

ہنسی زندگی، جھوم اُٹھی مشیت، زمیں جگمگائی، فلک جگمگایا
چلی باغِ عالم میں بادِ مسرت، بر آئی بالآخر تمنائے فطرت

صداقت، محبت، وفا کا اجالا، کراں تا کراں ساری دنیا میں پھیلا
ہوئی جب نمودار صبحِ سعادت، زمیں جگمگائی، فلک جگمگایا

مساوات و انصاف کا ابر برسا، ہوا دامنِ زندگی دُھل کے اُجلا
فضا سے چھٹا ہر غبارِ جہالت، زمیں جگمگائی، فلک جگمگایا

ہوئی جلوہ ریزی جو غارِ حرا سے زمانہ چمک اُٹھا اُس کی ضیا سے
ملی نوعِ انساں کو راہِ ہدایت، زمیں جگمگائی، فلک جگمگایا

غزل

اک درد سا پہلو میں مچلتا ہے سرِ شام
آکاش پہ جب چاند نکلتا ہے سرِ شام

بے نام سی اک آگ دہک اٹھتی ہے دل میں
مہتاب جو ٹھنڈک سی اگلتا ہے سرِ شام

یہ دل ہے مرا یا کسی کٹیا کا دیا ہے
بجھتا ہے دمِ صبح تو جلتا ہے سرِ شام

کچھ دیر شفق پھوٹتی ہے جیسے افق پر
ایسے ہی مرا حال سنبھلتا ہے سرِ شام

چھٹ جاتی ہے آلامِ زمانہ کی سیاہی
جب دور تری یاد کا چلتا ہے سرِ شام

میں دُور بہت دُور پہنچ جاتا ہوں تائبؔ
رُخ سوچ کا دھارا جو بدلتا ہے سرِ شام

حنیف اسعدی

حنیف اسعدی ۱۹۱۹ء میں شاہ جہان پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ انہیں اپنے والدِ محترم مولانا اسعد شاہ جہان پوری سے شرفِ تلمذ حاصل تھا جو خود صاحبِ دیوان شاعر اور اُس دور کے اُستادِ سخن تھے۔ والد کی نسبت سے اسعدی کہلائے۔

حنیف اسعدی کو دورِ حاضر کے نعت گو شعراء کی صف میں ممتاز مقام حاصل ہے۔ اُن کی نعتوں میں فکری پاکیزگی اور بلند پروازی پائی جاتی ہے۔ نعت لکھنے کے لیے بنیادی شرط والہانہ پن ہے۔ اگر یہ جذبہ کارفرما ہو تو صحیح معنوں میں نعت گوئی کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

حنیف اسعدی ایک باعمل اور متشرع انسان ہیں۔ ذاتِ ختمی مرتبت (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم) سے عقیدت و محبت نے قوتِ اظہار کو پروان چڑھایا اور نعت کی زمین پر گل ہائے رنگا رنگ کھلائے۔ ایک راسخ العقیدہ مومن کے شب و روز کی آرزوئیں اور تمنائیں شعری قالب میں خود بہ خود ڈھل گئیں۔ اُن کی نعتوں کا مجموعہ "ذکرِ خیر الانام (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم)" سرورِ دو جہاں (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم) سے محبت کرنے والوں کے لیے ایک بیش بہا تحفہ ہے۔ ناظم آباد، کراچی میں قیام تھا۔

ڈاکٹر عاصی کرنالی "اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر" صفحہ ۳۴۴ پر حنیف اسعدی کے متعلق لکھتے ہیں "حنیف اسعدی جہاں اپنی داخلی اور باطنی کیفیات کے ترجمان ہیں، وہیں نعت کو دعوت و ارشاد کی صورت میں بھی پیش کرنے کی سعادت سے بہرہ مند ہیں۔ ان کی نعتوں میں والہانہ پن ہے جو تقاضائے محبت ہے لیکن یہ والہانہ پن بہ ہر نفس اور بہ ہر قدم شعور و آگہی اور ادب و تکریم کے تابع ہے۔"

◆◆◆

نعت

اُسؐ ذات پر صفات کی حجت ہوئی تمام
سیرت تمامِ نور، بدن روشنی تمام

سب کو بقدرِ ظرف ملا ہے شعورِ ذات
اُمّی لقبؐ پہ ختم ہوئی آگہی تمام

اس منزلت پہ مسجدِ اقصیٰ بھی ہے گواہ
ختم الرسل امام، نبی مقتدی تمام

بے قیدِ وقت بھیجے گا اُن پر خدا درود
یہ سلسلہ ہوا ہے نہ ہو گا کبھی تمام

آقائے کائنات کی طاعت گزاریاں
سجدے ہمہ نیاز، بدن بندگی تمام

وہ آخری سفیر ہیں دینِ حنیف کے
اُن پر ہوا ہے سلسلۂ رہبری تمام

غزل

ابھی نہ جاؤ ابھی راستے سجے بھی نہیں
ابھی چراغ سرِ کہکشاں جلے بھی نہیں

جبینِ چرخ پہ گلگونہ شفق مل کر
ابھی تو شام کے سائے کہیں گئے بھی نہیں

عروسِ شب نے ابھی چاندنی اتاری ہے
ابھی تو گیسوئے شب ٹھیک سے کھلے بھی نہیں

ابھی سے ترکِ تعلق کے مشورے تو نہ دو
ابھی تو یادوں کے سارے دیے بجھے بھی نہیں

مرے سفر میں ستارے تھے سب شریکِ سفر
یہ راہرو تو مری راہ گزر کے تھے بھی نہیں

حنیف ساجد

نعتیہ مجموعہ ''خورشیدِ بطحا'' کے شاعر کا نام محمد حنیف ساجد اور قلمی نام حنیف ساجد ہے۔ ہندوستان کے شہر روہتک میں حنیف ساجد ۲/ جولائی ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوئے۔ پانچ کتابیں انہوں نے اُردو ادب کو عنایت کیں جن کے نام یہ ہیں:

۱.........	''آتشِ خاموش''	(مجموعۂ غزل)	۱۹۹۰ء
۲......	''خاکِ بینا''	(مجموعۂ غزل)	۱۹۹۴ء
۳......	''آدمِ خوابیدہ''	(مجموعۂ غزل)	۱۹۹۸ء
۴......	''اقلیمِ کرب''	(مجموعۂ غزل)	۲۰۰۴ء
۵......	''خورشیدِ بطحا''	(نعتیہ مجموعہ)	۲۰۰۶ء

حنیف ساجد کے علم و فن کا اعتراف کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا ہے جن میں اکبر حمیدی، ڈاکٹر انور سدید، ایوب جوہر، بشریٰ رحمٰن، ثاقب رزمی، ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی، ڈاکٹر خواجہ حمید یزدانی، محمد حنیف رامے، ڈاکٹر رشید امجد، رئیس امروہوی، حکیم محمد سعید، ڈاکٹر سفیر اختر، ڈاکٹر رشید، ڈاکٹر شاہد حسن رضوی، ظہیر کاشمیری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر وحید قریشی شامل ہیں:

◆◆◆

نعت

لبوں پہ حرفِ درود رکھنا، نظر میں اُن کا جمال رکھنا
نبیؐ کی چاہت قدم قدم پر گرہ دل میں سنبھال رکھنا

انہی کی صورت مسافتیں اور انہیں کی صورت قیامِ منزل
عقیدتوں کے سفر میں ہر دم انہیں کی روشن مثال رکھنا

محبتوں کے سفر میں شعلے، کہیں پہ سنگِ ستم کے طوفاں
نبیؐ کی راہوں میں زندگی ہو تو کچھ نہ دل میں ملال رکھنا

یہی ہے شہرِ بدن کی ظلمت کا سب سے بہتر علاج آخر
دلوں کی تیرہ شبی میں ہر دم انہی کا نورِ جمال رکھنا

حیا کے پردے میں آنکھ رکھنا، لبوں کی گردش میں اُن کی یادیں
سماعتوں میں ہمیشہ اُن کے حروفِ ذکرِ کمال رکھنا

انہی کی عظمت بیان کرنا، سلام پڑھنا حنیف ساجد
محبتوں کی روش روش پر ادب کا تکمیل خیال رکھنا

غزل

بج رہے ہیں گر فصیلِ جبر کے دیوار و در
عرصہ آفات کے شاید ہیں کچھ شام و سحر

یوں نہ کر تو آج میری راہ کو بے برگ و بار
یہ بھی ممکن ہے کہ کل تیرا بھی ہو اس پر گزر

ہو رہا ہوں ظلمتِ دوراں سے بھی میں مستفید
تیرگی میں روشنی کے روز کرتا ہوں سفر

اب نگاہ خاک میں ہو کس لیے آنسو کوئی
اُگ رہی ہے فصلِ تازہ سینۂ امواج پر

زندگی کی راہ میں جو خود نہیں بینا حنیفؔ
راستہ دکھلائے کیا اس کو چراغِ رہ گزر

حیرت الٰہ آبادی

(۱۹۲۶ـ۲۰۰۶)

اکتوبر ۱۹۲۶ء میں قصبہ ہیبت پور الٰہ آباد کے زمیندار سید ظفر حسن (عبرت الٰہ آبادی/ شاعر) کے گھرانے میں پیدا ہونے والے سید مہدی حسن کا قلمی نام حیرت الٰہ آبادی ہے۔ کراچی میں یہ پہلی بار سنا گیا کہ بزمِ داغ، انجمن یادگار جگر کی طرح کسی شاعر نے خود اپنے نام سے بزم قائم کی اور اس کا ماہنامہ رسالہ ''بقلم خود'' بھی نکالا۔ جس کی خصوصیات ہر شاعر کا اپنی ہی تحریر میں کلام لکھنا اور اس کو شائع کرنا تھا۔ ۱۶ر ستمبر ۲۰۰۶ء کو کراچی میں وفات پانے والے حیرت الٰہ آبادی کا تعارف ''پاکستان کے نعت گوشعراء'' میں بھی دیا گیا ہے۔ آپ اس وقت بقید حیات تھے ''سترہ دن'' (قطعات/ ۱۹۶۵ء کی جنگ) نعتوں کے مجموعے ''منارۂ نور'' (۱۹۸۹ء) اور ''نورِ بے مثال'' (۱۹۹۷ء) کے ساتھ ہی ''آگ، خون، پانی'' ـ ''کشکولِ وفا'' (غزلیں ۱۹۸۹ء) اور شعری مجموعہ ''پتے، کانٹے، پھول'' حیرت الٰہ آبادی کی یادگار ہیں۔ آپ کی آخری آرام گاہ کراچی میں ہے۔

◆◆◆

نعت

شام سے لکھنے جو بیٹھا تا سحر لکھتا رہا
میں ثنائے سیرتِ خیر البشر لکھتا رہا

محترم میں بحر و بر نورِ سحر لکھتا رہا
جانے کیا کیا شوق میں' میں رات بھر لکھتا رہا

لوگ انگشتِ مبارک کی طرف دیکھا کیے
آسماں دیباچۂ شق القمر لکھتا رہا

نیکیاں ملتی رہیں اِک ایک حرفِ نعت پہ
میں اِدھر لکھتا رہا مولا اُدھر لکھتا رہا

دامنِ رحمت میں آنسو سب گہر بنتے گئے
میں وفورِ شوق میں باچشمِ تر لکھتا رہا

مل ہی جائے گی سندِ فردوس کی اِک دن ضرور
روز و شب نعتِ نبی حیرت اگر لکھتا رہا

غزل

جگر کا خون بُتِ سر کشید کرتا ہے
لہو سے عشق کو جوہر کشید کرتا ہے

اسی کے ہاتھ میں آتا ہے بے بہا موتی
سمندروں سے جو پتھر کشید کرتا ہے

بڑے ہی چاہ سے دامن میں ٹانکنے کے لیے
ہماری چشم سے گوہر کشید کرتا ہے

جنوں کے ہاتھ سے لے کر چراغ راہِ عمل
گماں یقین کے پیکر کشید کرتا ہے

اسی کو ملتی ہے تاریخ میں جگہ حیرتؔ
جو شب سے صبح کا منظر کشید کرتا ہے

خادم عظیم آبادی

سید بہاء الدین کا تعلق بیدل عظیم آبادی اور مرحوم ڈاکٹر جمیل عظیم آبادی کے وطن عظیم آباد سے ہے۔ شعری دنیا میں آپ خادم عظیم آبادی کے نام سے معروف ہیں۔ پہلا مجموعہ شاعری ''خوشبو کے دھمال'' کے بعد وہ ۲۰۱۱ء میں حمد و نعت کا مجموعہ نور سحر بزم فردوسی 9/1199 آر دستگیر سوسائٹی کراچی سے طبع کروا چکے ہیں جس کا اہتمام الحمد پبلی کیشنز، کراچی نے کیا۔

حمدوں کے درمیان کچھ نظمیں اور پھر نعتیں جہان حمد اور مجلس احباب ملت پاکستان کے طرحی حمدیہ، نعتیہ مشاعروں کے لیے کہی اور پیش کی گئی تھیں۔ سہ ماہی ادبی جریدہ ''شاعری'' کے مدیر سہیل غازی پوری کی ہمراہی میں گزشتہ ربع صدی سے آپ دبستان وارثیہ اور دیگر تنظیموں کے مشاعروں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے رہے ہیں۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد کل وقتی شاعر ہو گئے ہیں۔ قیام گلستان جوہر کراچی میں ہے۔

نعت

خوب صورت شان و شوکت کیوں نہ ہو
ہر زباں پر ان کی مدحت کیوں نہ ہو

ان کا شیدائی جہاں یوں ہی نہیں
وہ محبت ہیں، محبت کیوں نہ ہو

چاند کی مانند ہیں تاروں کے بیچ
انبیاؑ میں ان کی حشمت کیوں نہ ہو

آپ ختم الانبیاﷺ ہیں بالیقیں
اس حوالے سے بھی شہرت کیوں نہ ہو

نعت کی خادمؔ سعادت جب ملی
پھر حضوری کی اجازت کیوں نہ ہو

غزل

اس کی آنکھوں سے آنسو چھلکتے رہے
لوگ سمجھے کہ جگنو چمکتے رہے

سر پٹکتی رہی غم سے پاگل ہوا
اور شاخوں پہ پتے سسکتے رہے

زعم تھا جانتے ہیں ہم اس کا پتا
اور اس کی گلی میں بھٹکتے رہے

پھول معصوم تھے جو خزاں کھا گئی
اس روپے پہ کانٹے بلکتے رہے

اس کی آنکھیں تھیں یا میکدہ تھا کوئی
اتنی پی لی کہ پی کر بہکتے رہے

بھیک دیتے رہے اس گداگر کو سب
جس کے کاسے میں سکے کھنکتے رہے

تیری غزلوں میں خادمؔ سبھی رنگ تھے
جو جبینِ غزل پر دمکتے رہے

خاطرؔ غزنوی

خاطر غزنوی علم وادب کی معروف شخصیت اور کہنہ مشق شاعر ہیں اردو غزل ونظم اور نثر میں ان کا بلند پایہ مقام ہے، نقد ونظر کی دنیا میں تحقیق ومقالات سے تعلق رکھنے والے اہل علم آپ کے کام سے باخبر ہیں، ان کے شعری مجموعے "خواب درخواب"، "روپ رنگ رزم" وغیرہ سے ادبی قارئین باخبر ہیں، انہوں نے ادبی دنیا کو خاصے کی چیزیں دیں۔

خاطر غزنوی نے شعرائے پشتو کے کچھ کلام کا ترجمہ کر کے اردو نعتیہ شاعری کے دامن کو مزید کشادہ کر دیا ہے اور پشتو شعراء سے اردو نعتیہ ادب کے قاری باخبر ہوئے۔ صوبہ سرحد کے علاوہ پاکستان کے دوسرے صوفی شعراء کرام کے صوفیانہ افکار سے فیض بھی اٹھایا اور عصر جدید کے حوالے سے ہم آہنگ کر کے فضائے نعت کو گل ہائے رنگا رنگ اور معطر بنا دیا۔

ہمارے ہاں غزلیہ شاعری کے قد آور حضرات نے جب سے نعتیہ شاعری میں قدم رکھا ہے اس وقت سے نعتیہ شاعری کے انداز بیان میں عملی اعتبار سے غور وفکر کیا جانے لگا ہے، اور اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ترسٹھ سالہ زندگی کا احاطہ کیا جانے لگا ہے، جس کی وجہ سے نعتیہ شاعری کی فضا رنگ ونور میں گھر گئی ہے۔

خاطر غزنوی نے بیدار آنکھوں سے مدینۂ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دیکھا ہے جس کا اظہار "سلسلہ انوار کا" میں موجود ہے، مختصر نعتیہ مجموعہ ہونے کے باوجود عمدہ نعتوں سے پُر ہے۔ قارئین ان کی نعتوں کو پڑھ کر اندازہ لگائیں کہ شاعر نے شاعرانہ فکر کو قوس قزح کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ ان کی نعتوں میں محبت وعقیدت کے ساتھ ساتھ حسن ادب بھی موجود ہے۔

◆◆◆

نعت

اُسوۂ پاک سدا باعثِ تکریم ہوا
ہر عمل آپؐ کا سنت ہوا تعلیم ہوا

آپؐ کا جود و سخا صورتِ باراں برسا
آپؐ کا صدق و صفا کوثر و تسنیم ہوا

آپؐ کے حسنِ تکلم سے اُجالے پھیلے
جو بھی ارشاد ہوا رفعتِ تعلیم ہوا

وہ جو اک خیرِ بشر افضل و اعلیٰ ٹھہرا
وہی اعزاز سرِ احسنِ تقویم ہوا

تھا پیام ایسا سنورنے لگی ہر ایک روش
تھا کلام ایسا کہ ہر دور میں تسلیم ہوا

وہ جو مکے سے مدینے کی طرف ہجرت تھی
واقعہ ایسا تھا تاریخ میں تقویم ہوا

وہ کہ لاریب تھے صادق بھی امیں بھی خاطرؔ
تھا وہ کردار کہ خم ہر سرِ تسلیم ہوا

غزل

گو ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے
لیکن اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے

گرمیِ محفل فقط اک نعرۂ مستانہ ہے
اور وہ خوش ہیں کہ اس محفل سے دیوانے گئے

میں اسے شہرت کہوں یا اپنی رسوائی کہوں
مجھ سے پہلے اس گلی میں میرے افسانے گئے

یوں تو وہ میری رگِ جاں سے بھی تھے نزدیک تر
آنسوؤں کی دھند میں لیکن نہ پہچانے گئے

وحشتیں کچھ اس طرح اپنا مقدر ہو گئیں
ہم جہاں پہنچے ہمارے ساتھ ویرانے گئے

کیا قیامت ہے کہ خاطر کشتۂ شب بھی تھے ہم
صبح بھی آئی تو مجرم ہم ہی گردانے گئے

خالد احمد

(۱۹۴۳ء، ۲۰۱۳ء)

محمد مصطفیٰ خاں کو لکھنؤ والے احمق پھپھوندوی کے نام سے اچھی طرح جانتے ہیں۔ اُنھی کے گھر میں تہور علی خاں برادر مصطفیٰ کی بیٹی ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور نامی دو بہنیں افسانہ نگاری و ناول کے حوالے سے پوری دنیا میں اپنی دھوم مچاتی رہیں، اور اُن کے بھائی خالد احمد نے شعرو ادب اور صحافت کی دنیا میں اپنے نام کا سکہ رواں کیا۔ خالد احمد خاں ۵ رجون ۱۹۴۳ء کو لکھنؤ ہی میں پیدا ہوئے اور قیامِ پاکستان کے وقت اُن کی عمر ۴ سال تھی۔ نہایت کم عمری میں "پُوت کے پاؤں پالنے میں نظر آتے ہیں" کے مصداق اُنھوں نے کتابیں پڑھنے اور مضمون لکھنے اور شاعری کرنے کا آغاز کیا، بڑی بہن کا تعلق نقوش سے رہا، چھوٹی بہن کہانیاں اور افسانے لکھتی رہیں۔

اور یہ اُن دونوں کی پیروی میں آگے بڑھتے رہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ گھرانہ لاہور آیا، یہاں احمد ندیم قاسمی، محمد طفیل جیسے مشاہیرِ صحافت و ادب کی شفقت و رفاقت اُن کو میسر آئی۔ خالد احمد نے فنون میں اداریہ کے بعد والا صفحہ لکھنا شروع کیا اور معتبر جرائد میں اپنا کلام چھپواتے رہے۔ افسانہ نویس، شاعر، ڈراما نگار، دانش ور اور ماہ نامہ "بیاض" لاہور کے مدیر خالد احمد کے پہلے شعری مجموعے کا نام "دراز پلکوں کے سائے" تھا جب کہ کالموں کا انتخاب "لمحہ لمحہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ فلمی نغمہ نگاری کے شوق میں فلم "تیسرا کنارہ" کے نغمات بھی لکھے۔

خالد احمد نے سائنسی مضامین میں گریجویشن کیا، اور اُردو ادب کو اوڑھنا بچھونا بنایا۔ نعتِ ختمی مرتبت (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے بھی اُن کو والہانہ لگاؤ رہا، عبدالعزیز خالد کی طرح مشکل پسند مضامین کا انتخاب کرتے ہوئے مسلسل نعتیں لکھیں اور قصائد کے انداز میں نعتیہ شاعری کرتے ہوئے مجموعہ "تشبیب" (۱۹۸۴ء) منظرِ عام پر لائے جس پر ۱۹۸۵ء میں ظہور نظر ادبی ایوارڈ برائے سیرت دیا گیا۔ خالد احمد کا مستقل قیام لاہور میں رہا اور وہیں انتقال ہوا۔ مشاعروں اور ادبی کانفرنسوں میں شرکت کے لیے دنیا کے کئی ممالک کی سیر کر چکے ہیں:

نعت

دوام آپؐ کا نام
جاہِ رجال شاہؐ امام

آپؐ پہ ہے حُسن تمام
آپؐ کے لب روحِ کلام

آپؐ کے بول اوجِ پیام
نانِ جویں رنگِ طعام

میرے رسولؐ، میرے امام
ہر شکل، ہر ہنگام

یاد آئے آپؐ کا نام
جانتا ہے وہ غلام

کب سے ہیں آپؐ کے نام
خالد کے صبح و شام

غزل

زمیں کو پھول فلک کو گھٹائیں دیتا ہے
مجھے فلک سے وہ اب تک صدائیں دیتا ہے

وہی نواگرِ عالم، خدائے صوت و صدا
وہی ہوا کو فقط سائیں سائیں دیتا ہے

وہی کہیں گلِ نغمہ، کہیں گُلِ نوحہ
وہی غموں کو سُروں کی قبائیں دیتا ہے

وہ کوہسارِ تحیّر، وہ آبشارِ ندا
خموشیوں کو بھی کیا کیا ندائیں دیتا ہے

کوئی تو روئے لپٹ کر جوان لاشوں سے
اسی لیے تو وہ بیٹوں کو مائیں دیتا ہے

مری زباں پہ کوئی لفظ اس کے حق میں نہیں
مگر وہ دل کہ اسی کو دعائیں دیتا ہے

خلیق قریشی

(۱۹۱۴ء۔۱۹۷۴ء)

خلیق قریشی کا اصل خاندانی نام غلام رسول تھا۔ وہ ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے تھے۔ اپنے قلم کو حق و صداقت کا ہتھیار بناتے ہوئے اُنہوں نے صحافت کی وادیٔ پُر خار میں قدم رکھا، اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران اُنہوں نے ایسے مضامین اور اداریے لکھے جن سے تعمیرِ پاکستان کا جذبہ نمایاں ہوا، اور اس میں فروغ حاصل ہوا۔

اُن کی تصانیف کے عنوان سے ہی اُن کی نیت کا خلوص اور مقاصدِ جلیلہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے "ضربِ کاری"، "تعمیرِ ملت" اور "حدیثِ دیدۂ و دل"۔ انسان اور انسانیت سے محبت کرنے والے خلیق قریشی نے نعت نگاری کو بھی اپنایا اور سادہ پیرائے میں دل نشین نعتیں لکھیں۔ اُن کا نعتیہ مجموعہ "برگِ سدرہ" ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا تھا۔ خلیق قریشی ۱۹۷۴ء میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

نعت

وجہِ قرارِ قلبِ پریشاں تمہیؐ تو ہو
اصلِ فروغِ دیدۂ حیراں تمہیؐ تو ہو

حُسنِ بہارِ عارضِ انسانیت ہو تم
تابِ جمالِ محفلِ امکاں تمہیؐ تو ہو

طیبہ کی ہر گلی ہے تمہیؐ سے سوادِ خلد
بطحا کی وادیوں میں زر افشاں تمہیؐ تو ہو

لکھا ہے جس میں رازِ چمن بندیٔ جہاں
اُس نامۂ جمیل کے عنواں تمہیؐ تو ہو

تفسیر و شرحِ نکتۂ لولاک کون ہے
روحی فدا وہ سرورِ دوراں تمہیؐ تو ہو

مولا مرے غریب و اسیر و یتیم کے
ہمدرد و غمگسار و نگہباں تمہیؐ تو ہو

تم سے ہے حکمِ احسنِ تقویم کا ثبوت
جس پر ہے حق کو ناز وہ انساں تمہیؐ تو ہو

غزل

ہم نہ ہوں گے تو ہمیں یاد کرو گے یارو
تذکرے ہوں گے یہی جب بھی ملو گے یارو

ہم نے روداد وفا خود سے مرتب کی ہے
داستاں پھر یہ کبھی سن نہ سکو گے یارو

ہم نہ ہوں گے تو کسے پاؤ گے دل کا محرم
ہم نہ ہوں گے تو یہ دکھ کس سے کہو گے یارو

ہم سے زندہ ہے رہ و رسم محبت اب تک
اس کو جاں دے کے کہاں زندہ رکھو گے یارو

ہم نے ہر بار حوادث کی کلائی موڑی
تم انہیں کس طرح مغلوب کرو گے یارو

وقت پوچھے گا ہمیں وقت ہمیں ڈھونڈے گا
اور تم وقت کے ہمراہ چلو گے یارو

ہم ہی تاریخ زمانہ کے مرتب ہیں خلیق
ہمیں تاریخ میں اک روز لکھو گے یارو

خواجہ رحمت اللہ جرؔی

خواجہ رحمت اللہ جرؔی ۲۲ ؍اگست ۱۹۳۷ء کو حیدر آباد دکن میں خواجہ محمد عبید اللہ (مرحوم) کے گھر پیدا ہوئے۔ بی ایس سی اور بی ای (سول) تک تعلیم عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن سے حاصل کی۔

شاعری سیکھنے کے لیے انہوں نے الحاج احمد علی شہاب (مرحوم) سے رجوع کیا اور آپ فارغ اصلاح ہو گئے۔ پہلی ملازمت بحیثیت لیکچرار ۱۹۶۷ ابو صدیق پولی ٹیکنک کالج بمبئی میں ملی۔ ۱۹۶۸ء میں آپ پاکستان آ گئے۔ کچھ عرصے کراچی میں بحیثیت انجینئر مختلف اداروں میں تعینات رہے۔ بعد ازاں بحیثیت چیف پروجیکٹ منیجر سعودی عرب (عرعر) میں کئی سال فرائض انجام دینے کے بعد کراچی واپس آ گئے اور آج کل یونائیٹڈ کنسٹرکشن کمپنی کراچی میں بحیثیت چیف انجینئر فرائض انجام دے رہے ہیں۔

رحمت اللہ جری کی شاعری پر اہل قلم نے دل کھول کر اظہار خیال کیا ان میں ڈاکٹر انور سدید، حکیم محمد سعید، پروفیسر آفاق صدیقی، ڈاکٹر سیفی پریمی، نذیر فتح پوری، ڈاکٹر حنیف ترین، عتیق احمد، ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی، نصرت ہاشمی، خواجہ حمید الدین شاہد، مجاہد لکھنوی، اعجاز احمد طاہر اعوان، افتخار اجمل شاہین، معین دانش، نسیم سحر کھی، شفیق احمد شفیق اور دیگر اہل قلم شامل ہیں۔

ضرب لطیف (۱۹۸۸ء)، فصلِ دل (۱۹۹۲ء) نعتیہ مجموعہ رقص قندیل (۲۰۱۶ء) ان کی مطبوعہ کتابیں ہیں۔ غیر مطبوعہ کتب درج ذیل ہیں:

بولتی آنکھیں (نظموں کا مجموعہ)، رقصِ سحری (معریٰ غزلیں)، پیاز کے تراشے (پابند غزلیں)، ایک مربع، ایک شب خون (قطعات) ضرب تثلیث (ہائیکو)، شعری نثر (نثری مضامین)

نعت

خوشبو کو تسلط سے رہا کیوں نہیں کرتے
گر عشق ہے اُنؐ سے تو وفا کیوں نہیں کرتے

جو پاس ہے تم اس کو سوا کیوں نہیں کرتے
ایماں کی حرارت کو دیا کیوں نہیں کرتے

انوارِ رسالتؐ کا ملے تم کو بھی حصہ
اپنے لیے محفل میں جگہ کیوں نہیں کرتے

جب آپ خطاؤں کے اندھیروں میں گھرے ہوں
احساسِ ندامت کی ضیا کیوں نہیں کرتے

الزام نہ دو اپنی تباہی پہ کسی کو
تم راہِ محمدؐ پہ چلا کیوں نہیں کرتے

وہ دُور محمدؐ سے ہیں جو ذات میں تنہا
تم خود کو سمندر میں فنا کیوں نہیں کرتے

گلہائے عقیدت کو جڑی کرکے نچھاور
اُنؐ سے ہوں جو طالب تو عطا کیوں نہیں کرتے

غزل

ہر اسم سے ہم دیتے ہیں صدا ' مشکل جو کبھی آجاتی ہے
ہر اسم کی اپنی ایک صفت ' کوئی نہ کوئی آجاتی ہے

جب درد سوا ہو جاتا ہے انساں کا بھلا ہو جاتا ہے
اک حد پہ تڑپ رک جاتی ہے پھر غم میں کمی آجاتی ہے

ہر بار سمجھتے ہیں گر کر ' مشکل ہے سنبھلنا غم میں مگر
آشا کی کرن جب پھوٹتی ہے ' چہرے پہ خوشی آجاتی ہے

آساں ہے سمجھنا اس کا کہاں ' دیوانہ ہے کس کا کون یہاں
آتی ہے گلی سے خوشبو یا خوشبو سے گلی آجاتی ہے

اوروں سے شکایت کیا کیجئے ' ہم میں ہے کثافت کیا کیجئے
عرفانِ خدا کے رستے میں ' خود اپنی خودی آجاتی ہے

اک ہم سے بچھڑنے والے کی ' رہتی ہے سدا نظروں میں شبیہ
ہر بار خوشی کے موقع پر ' آنکھوں میں نمی آجاتی ہے

جینے کی تمنا میں اکثر ' بزدل بھی جری ہو جاتے ہیں
آلام سے آنکھیں چار ہوں جب ' جرأت بھی جری آجاتی ہے

خواجہ ریاض الدین عطشؔ

(۱۹۲۵ـ۲۰۰۱)

خواجہ ریاض الدین عطشؔ ۴/ مارچ ۱۹۲۵ء کو عظیم آباد (پٹنہ) بہار میں پیدا ہوئے تاریخی اعتبار سے عظیم آباد کوئی غیر معروف علاقہ نہیں بلکہ جب برصغیر کے مسلمانوں پر سکوت مرگ کا سا عالم طاری ہوتا جارہا تھا یہ عظیم آباد ہی تھا جہاں کے باسیوں نے شاہ اسماعیل شہید کی تحریک کو فروغ دینے کے لیے بے مثل قربانیوں اور لازوال اخوت کی ہمہ گیر دعوت دین و جہاد کو برصغیر کے مختلف گوشوں تک پہنچانے میں شاہ صاحب شہید اور ان کے رفقاء سے معاونت کا عملی مظاہرہ و نمونہ پیش کیا۔

انگریز حکمرانوں نے مسلمانان برصغیر پر جو مظالم ڈھائے وہ اس خطے کی تاریخ کی پیشانی پر شہداء کے خون سے درخشاں نظر آتے ہیں۔ یہ ۱۷۵ برس پہلے کی بات ہے جب شہر انبالہ میں انگریزوں نے علماء و مشائخ عظام کو تختۂ دار پر لٹکایا کیوں کہ وہ دین وملت کی آزادی کے نعرے لگاتے عملی جہاد میں دامے، درمے، قدمے، قلمے و سخنے برسرپیکار تھے۔

خواجہ ریاض الدین عطشؔ کی پرورش ایک ادبی و علمی گھرانے میں ہوئی۔ ان کے دادا شہنشاہ اقلیم سخن مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی کے ارشد تلامذہ میں شمار کیے جاتے تھے۔ خواجہ ریاض الدین عطشؔ عالم بلوغت میں مشرقی پاکستان کے دارالحکومت ڈھاکا پہنچے ۱۹۵۴ء میں انہوں نے اپنے اسلاف کی پیروی میں شعروادب سے اپنا ناتا جوڑتے ہوئے بزم سخن قائم کی، ڈھاکا شہر میں

اس انجمن کو علم و ادب کے فروغ میں اہم گردانا جاتا تھا۔ مؤلف کتاب ہذا کے ایک قریبی ساتھی پروفیسر ہارون الرشید اور ڈھاکا کے کئی ایک جانکاروں نے بتایا کہ بزم سخن میں مشرقی پاکستان کے نئے اور پرانے معروف و مشاق شعراء مولانا کامل رزاقی، افسر ماہ پوری شاغل فریدی وغیرہ محفل ہوا کرتے تھے۔

سقوط مشرقی پاکستان کے بعد عطش کراچی آئے اور یہاں سے عازم امریکہ ہوئے تاہم وقفے وقفے سے وہ کراچی آیا کرتے تھے اور یہاں ان کی تصانیف کے حوالے سے تقریبات بھی منعقد کی گئیں۔ ''داغ کا آخری چراغ''، ''اردو کا شجرہ نسب''، ''اردو ہزار داستان''، ''اردو دشمن تحریک کے سو سال'' (نثر) جبکہ شعری مجموعوں میں ''جوش جنوں''، (نظمیں) ''ورد نفس'' اور مجموعہ ''حمد و نعت'' ان کی تصانیف کراچی کے کتب خانوں اور صاحبان علم و ادب کے ہاں دیکھی جا سکتی ہیں۔

عبدالقادر بیدل عظیم آبادی کے شہر میں جنم لینے والے خواجہ ریاض الدین عطش ۸/ جنوری ۲۰۰۱ کو امریکہ کے شہر شکاگو میں انتقال کر گئے اور وہیں کے مسلم قبرستان میں انہیں آخری آرام گاہ نصیب ہوئی۔

نعت

نازشِ خلقت میرے محمدؐ
رازِ مشیت میرے محمدؐ

روحِ عبادت جانِ شریعت
مظہرِ وحدت میرے محمدؐ

بحرِ عطا و جود و سخاوت
خلق و عنایت میرے محمدؐ

روزِ قیامت سایۂ رحمت
شافعِ اُمت میرے محمدؐ

نورِ سراپا شاہِ مدینہ
فقر طبیعت میرے محمدؐ

عرش و ملائک جن و خلائق
سب کی حاجت میرے محمدؐ

لکھتے عطش کیا مدح نہ ہو جب
لفظوں میں طاقت میرے محمدؐ

غزل

حسرتِ پائمال میں گم ہیں
ہم فریبِ خیال میں گم ہیں

بجھتی یادوں کے سرمئی سائے
شامِ رنج و ملال میں گم ہیں

ہم حصارِ وجود کے راہ رو
گردشِ لازوال میں گم ہیں

شمعِ انسانیت کے نور فروغ
ظلمتِ انفعال میں گم ہیں

وہ ابد تک عروج کا پرتو
ہم ازل سے زوال میں گم ہیں

ہجر کی بے پناہ راتوں میں
لوگ شوقِ وصال میں گم ہیں

کشتیِ زیست کھے رہی ہے عطش
بحرِ کارِ ملال میں گم ہیں

خورشید احمر

خورشید احمر یوپی کے مردم خیز شہر کانپور (اتر پردیش، بھارت) میں ۱۹۴۰ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اسی شہر میں حاصل کی۔ بعدازاں ہجرت کے نتیجے میں بنگلہ دیش آگئے اور یہاں ڈھاکا یونیورسٹی سے ۱۹۶۷ء میں اُردو اور فارسی میں بی اے آنرز کیا۔ آپ کی دل آویز شخصیت اخلاص و ایثار، محبت و شرافت اور مشرقی اقدار کا ایک خوش کن نمونہ ہے۔ آپ بہ یک وقت اُردو اور انگریزی کے ادیب، شاعر اور صحافی ہیں۔ ڈھاکا سے ہی صحافت سے منسلک رہے اور اس وقت روزنامہ ''ڈیلی نیوز'' سے بہ حیثیت کالم نگار منسلک ہیں۔

آپ کا شعری مجموعہ ''شہر چراغاں'' کانپور اکادمی کے زیر اہتمام ۲۰۰۰ء میں منظر عام پر آیا۔ اگرچہ یہ مکمل نعتیہ مجموعہ نہیں ہے لیکن اس میں حمد و نعت بھی شامل ہیں۔ یہ نعتیں فقط قافیہ پیمائی کی حامل نہیں ہیں بلکہ فکر و فن کی ایک بلندی اِن کو چھوتی ہے۔ اِن کی حمد نگاری اور نعت گوئی میں زبان و بیان کے تمام محاسن اور اُسلوب و اظہار کی تمام خوبیاں پوری توانائی کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ خورشید احمر کا شمار عہد حاضر کے ممتاز شعراء میں ہوتا ہے۔ لہجے کی شائستگی اور فکر کی تازگی نے اُن کی تخلیقی کاوشوں کو جو رنگ و آہنگ عطا کیا ہے، اُس کی مثال اُن کے ہم عصر شعراء میں کم ملتی ہے۔

خورشید احمر ''نورٌ علیٰ نور'' میں رقمطراز ہیں:

''نعت وہ پاکیزہ صنف سخن ہے جس میں پیکر نبوت ﷺ کے صوری محاسن کے ذکر کے ساتھ ساتھ مقصد نبوتؐ (Mission of The Prpohethood) سے ایسی وابستگی کا اظہار بھی پایا جائے جس میں خاتم الانبیاء ﷺ سے صرف عقیدت و محبت کا اظہار نہ ہو بلکہ حضورؐ رسالت مآبؐ کے پیغام توحید اور اس کے حقیقی مشن کو واضح اور نمایاں کرتا ہو۔ اس امر میں کوئی

کلام نہیں کہ نعتیہ اشعار، تعلیماتِ نبویؐ سے قلبی تعلق پیدا کرنے کا بہت ہی مقبول اور موثر ذریعہ ہیں۔فرد اور معاشرے کے تزکیے کے لیے ہم نعت کے موجودہ اور مروجہ اداروں کو بروئے کار اور موثر بنا سکتے ہیں۔اس کے ذریعے ہم اپنی زندگیوں کو خوشگوار اور صحت مند خطوط پر استوار کر کے مجموعی طور پر ہم اپنے معاشرے اور اپنے ابنائے نفس کے دل کو نرم و گداز بنا سکتے ہیں۔یہ ہمارے عہد کی اوّلین ضرورت ہے۔نعت کے ذریعے ہم اپنے ابنائے نفس کو خواہ ان کا تعلق کسی بھی ملک اور معاشرے سے ہو خیر سگالی اور باہمی احترام و محبت کا پیغام دے سکتے ہیں۔دل گداختہ پیدا کرنے کے لیے نعت کی سماعت ناگزیر ہے۔

نعت

جب سے غلام ساقیِ کوثر ہوا ہوں میں
صحرائے تشنہ لب سے سمندر ہوا ہوں میں

معراجِ مصطفیٰؐ کا ثنا خواں ہے جب سے دل
تقدیرِ روز و شب کا سکندر ہوا ہوں میں

جب سے ہوئی ہے نورِ مجسمؐ کی آگہی
تاریکیوں کی قید سے باہر ہوا ہوں میں

یکبارگی جو سوئے حرم اٹھ گئی نگاہ
مہتاب سے زیادہ منور ہوا ہوں میں

خورشید ذرہ ذرہ ہے جس کا چراغِ طور
اس شہرِ معرفت کا گداگر ہوا ہوں میں

غزل

جب بھی ہوا سوال کوئی کس طرح جیے
جتنے تھے دل کے زخم وہ سب مسکرا دیے

خود آگہی کی دھوپ میں جو چل کے آئے ہیں
ان سے مزاجِ گردشِ دوراں تو پوچھیے

چاہی جو اس نے اپنی وفا کی کوئی دلیل!
پہنچے ہیں دشتِ شوق میں ہم اپنا سر لیے

محرومیِ حیات کا آئینہ دار ہوں
کیسی گزر رہی ہے ابھی کچھ نہ پوچھیے

ہم بھی حصارِ وضع سے آگے نہیں گئے
بیٹھے تھے بزمِ ناز میں وہ بھی لیے دیے

ہے سلسلہ دراز غمِ روزگار کا
خورشید زلفِ ناز کا سودا نہ کیجیے

پروفیسر خیالؔ آفاقی

سرزمینِ آگرہ گہوارہ علم و ادب ہے۔ اس مردم خیز خطے میں بے شمار علمائے ادب پیدا ہوئے۔ جنہوں نے تاریخ ساز خدمات انجام دیں۔ آگرہ وہ خوش نصیب شہر ہے جسے غالبؔ اور تاج محل کی وجہ سے تاریخِ عالم میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔

پروفیسر عقیل احمد آفاقی ایک دینی گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں وہ تصوف آمیز فکر کے ساتھ خدا ترسی کے ماحول میں پروان چڑھے۔ اِن کے والد علاؤ الدین صوفی نقش بندی مجددی رشد و ہدایت کے ساتھ ساتھ مخلوقِ خدا کی باطن کی اصلاح کے لیے بھی کام کرتے رہے۔

پروفیسر عقیل احمد کو ادبی دنیا میں خیالؔ آفاقی کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ آپ ایم اے، معارفِ اسلامیہ، ایم اے اُردو اور اُردو فاضل اسناد کے حامل اُستاد ہیں۔ خیالؔ آفاقی بہ حیثیت شاعر و ادیب اور ناول نگار و افسانہ نویس معروف ہیں۔ اسٹیج ڈرامے کے فن سے بھی واقفیت رکھتے ہیں۔ مختلف موضوعات پر دو سو سے زائد مضامین لکھ چکے ہیں۔ بچوں کے ادب سے بھی تعلق خاطر ہے۔ چناں چہ بچوں کے لیے ''حیاتِ طیبہ'' (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اُن کی ایک کتاب زیرِ تکمیل ہے۔

نعتیہ مجموعہ ''عودِ سخن'' (۲۰۰۶ء) سے پہلے اُن کی چار شعری کتابیں ''شب نامہ''، ''رودِ خیال''، ''آب دیدہ'' اور ''خوابیدہ'' منظرِ عام پر آ چکی ہیں:

نعت

مدینے کا سفر ہے اور میں ہوں
فلک کی رہ گزر ہے اور میں ہوں

مُقدر اوج پر ہے اور میں ہوں
کوئی پیشِ نظر ہے اور میں ہوں

چلا ہوں اب حرم سے سوئے طیبہ
بڑی سیدھی ڈگر ہے اور میں ہوں

عجب مستی کا عالم ہے نہ پوچھو
محبت کا اثر ہے اور میں ہوں

خرد بھی ہے مرے ہمراہ لیکن
جنوں بھی ہم سفر ہے اور میں ہوں

میں انؐ کے راستے پر چل رہا ہوں
بس اک انؐ کی نظر ہے اور میں ہوں

مُقدر آزمانے کی گھڑی ہے
اب انؐ کا سنگِ در ہے اور میں ہوں

غزل

رقص میں ہے بزمِ پیمانہ بدوش
اور میں مدہوش پیمانہ بدوش

اک حقیقت بر لبِ وہم و گماں
اک حقیقت ہے کہ افسانہ بدوش

بر لبِ من داستانِ بزمِ شب
شمع کشتہ خاکِ پروانہ بدوش

چل دیا پھر کارواں سوئے حرم
ایں چہ بوالعجبی صنم خانہ بدوش

رقص میں ہے آخرِ شعلہ ہنوز
مست بر شمشیر پیمانہ بدوش

مجرمِ الفت بر سر دیوانگیست
عقل آوارہ ہے دیوانہ بدوش

دشت میں شاید کوئی شہرِ خیال
اور میں جیسے کوئی خانہ بدوش

ذوقؔی مظفرنگری

حافظ محمود الحسن صدیقی ذوقؔی مظفرنگری ۱۵ر جنوری ۱۹۲۱ء کو حافظ محمد عمر صدیقی کے گھر بہ مقام مظفرنگر (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ اُن کی والدہ محترمہ حمانساء بیگم ابراہیم ذوقؔ کی نواسی تھیں۔ اِسی مناسبت سے اپنا تخلص ذوقؔی رکھا ہے۔

ذوقؔی حافظِ قرآن، فاضلِ قرأت اور ادیب کامل ہیں۔ لاہور میں درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں۔ علمی وابستگی نے تخلیقی عمل کو پروان چڑھایا اور ورثہ میں آنے والی فکر نے راہ نمائی کی۔ غزلوں کا مجموعہ ''تنویرِ فن'' کے نام سے چھپ کر اہلِ علم حضرات سے دادِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔

''نجم الہدیٰ'' نعتوں کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۸۰ء میں سیرت النبی (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم) ایوارڈ حاصل کر چکی ہے۔ انھیں چشتیہ، صابریہ سلسلے سے بھی ارادت ہے۔ اُن کی نعتوں میں ''ہادیٔ جہاں (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم) سے بے پناہ محبت کا جذبہ نمایاں ہے۔ لاہور میں مقیم ہیں۔

نعت

جب دلوں میں نورِ یزداں کے دریچے کھل گئے
کفر کے محلوں میں ایماں کے دریچے کھل گئے

ظلمتوں کا قفل ٹوٹا روشنی کی ضرب سے
شب کدوں میں صبحِ خنداں کے دریچے کھل گئے

اللہ اللہ یہ ہے فیضانِ مسیحائے زماں
درد کی دُنیا میں درماں کے دریچے کھل گئے

قید کا موسم گیا، آئی رہائی کی ہوا
مٹ گیا ہے حبس، زنداں کے دریچے کھل گئے

حبذا پیغمبرِ انسانیتؐ کا التفات
مرحبا تہذیبِ انساں کے دریچے کھل گئے

گنبدِ خضرا پہ جب پلکوں سے دی ہیں دستکیں
دیدۂ ذوقی پہ عرفاں کے دریچے کھل گئے

غزل

گل پوش بام و در ہیں مگر گھر میں کچھ نہیں
یہ سب نظر کا نور ہے منظر میں کچھ نہیں

موجوں کا اضطراب ہو یا گوہرِ حیات
احساس کا فسوں ہے سمندر میں کچھ نہیں

پرچھائیوں کا ناچ ہے ویران صحن میں
آسیبِ شب ہے اور مرے گھر میں کچھ نہیں

منزل سے بے نیاز چلے جا رہے ہیں لوگ
بھٹکے ہوؤں کی آنکھ کے پتھر میں کچھ نہیں

دن رات جھانکتا ہے دریچوں کے ذہن سے
افکار کا جمال ہے پیکر میں کچھ نہیں

ذوقی گلی گلی میں ہیں بھیجے فریب کے
اغراض کی صدا ہے قلندر میں کچھ نہیں

ذہین شاہ تاجی

(۱۹۰۲ء ـ ۱۹۷۸ء)

سید محمد طاسین معروف روحانی و علمی شخصیت، ادیب، مترجم اور نعت گو کا تذکرہ ہم "پاکستان کے نعت گو شعراء" (حصہ اول ۱۹۹۲ء) میں کر چکے ہیں۔ حضرت یوسف شاہ تاجی بابا کے مرید خانقاہ تاجیہ اور ماہنامہ "تاج" کراچی کے بانی ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ ذوالفقار علی بخاری، جوش ملیح آبادی اور سلیم احمد، قرۃ العین حیدر، ابن انشاء، افتخار احمد عدنی و دیگر مشاہیر اور شعراء و دانشوران کے احباب یا عقیدت مند تھے۔ پیرزادہ دیدار بخش فراقی ان کے والد تھے۔ جے پور راجستھان کے ضلع شیخاواٹی میں کھنڈیلہ کے مقام پر ۱۹۰۲ء میں پیدا ہونے والے ذہین شاہ تاجی نے "تذکرہ تاج الاولیاء" (بابا تاج الدین ناگپوری) "کتاب التوطین" (منصور حلاج) "وہابیت اور اسلام" کے عنوان سے نثری کتب تالیف کیں۔ بہ حیثیت شاعر اردو غزلیات کا مجموعہ "آیات جمال" اور فارسی مجموعہ "جمال آیات"۔ اردو نعت نگاری "لمعات جمال" کی صورت میں۔ منظومات اردو فارسی "اجمال جمال" "حمد و محمدیت" "جمالستان" (اردو منظومات) ان کی یادگار ہیں۔ تذکرہ میں پاکستان آمد بہار کالونی میں قیام جہاں سلیم احمد بھی رہے سیلاب کی تباہ کاریاں اور پیری مریدی کے واقعات نہ صرف دلچسپ بلکہ کراچی کی تاریخ یا منظر نامہ بھی کہلا سکتے ہیں۔

۲۳ جولائی ۱۹۷۸ء کو ادیبوں، شاعروں، عقیدت مندوں، سول انتظامیہ کے ہر دل عزیز ذہین شاہ تاجی بابا کا وصال ہوا۔ اپنے مرشد کے قرب کا حصول مطلوب تھا سو آستانہ تاجیہ میوہ شاہ قبرستان کراچی میں ہی مزار مبارک بنا، جہاں آج بھی زیارت مندوں کی عقیدت کا سلسلہ جاری و ساری ہے۔

علم و ادب سے تعلق رکھنے والے حضرات کراچی سے شائع ہونے والی کتابوں میں حضرت ذہین شاہ تاجی کا تذکرہ نہ دیکھیں تو انہیں ملال ہوتا ہے۔ شہزاد احمد نے کبھی بھی ذہین شاہ تاجی کو پڑھنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور نہ ان پر کچھ لکھنے کی کوشش کی۔ کراچی کا ہر صاحب علم ان کے اس رویے سے شاکی ہے۔ بزرگوں کو بھلا دینا اچھی بات نہیں ہے۔

نعت

دو جہاں میں ہے ضیائے شمعِ دینِ مصطفیٰؐ
ہیں زمین و آسماں زیرِ نگینِ مصطفیٰؐ

ہے رُخِ شمس و قمر پر تو گزینِ مصطفیٰؐ
اللہ اللہ جلوۂ نورِ جبینِ مصطفیٰؐ

پستیوں میں بھی نمایاں رفعتوں کی شان ہے
وقتِ سجدہ عرش تھا زیرِ جبینِ مصطفیٰؐ

ظلم کے بدلے میں ملتی ہے ہدایت کی دعا
درس ہے اخلاق کا تعلیمِ دینِ مصطفیٰؐ

قلبِ مؤمن جو خدا کا گھر خدا کا عرش ہے
غور سے دیکھا تو نکلا سر زمینِ مصطفیٰؐ

ہر نبی کا اِک جدا طاسین ہے لیکن ذہینؔ!
خاص طاسینِ محمدؐ ہے ذہینِ مصطفیٰؐ

غزل

خاک سے لالہ و گل سنبل و ریحاں نکلے
تم بھی پردے سے نکل آؤ کہ ارماں نکلے

بند آنکھیں کیے ہم منتظر جلوہ رہے
جب کھلی آنکھ تو خود جلوۂ جاناں نکلے

شیخ میخانے میں آنے کو مسلمان آیا
کاش میخانے سے نکلے تو مسلماں نکلے

کیا کوئی بزم حسیں زیر زمیں اور بھی ہے
پھول کیوں چاک جگر چاک گریباں نکلے

رنگ و بو قافلہ در قافلہ آئے تھے ذہین
چند اُڑتے ہوئے سائے تھے گریزاں نکلے

راغبؔ مرادآبادی

(۱۹۱۸_۲۰۱۱)

اصغر حسین ادبی دنیا میں راغبؔ مرادآبادی کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ۲۷/ مارچ ۱۹۱۸ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اُن کے آباء و اجداد مرادآباد کے رہنے والے تھے۔

راغب کی مروجہ تعلیم بی اے، ادیب، فاضل اور منشی فاضل ہے۔ وہ طبیہ کالج کے فارغ شدہ مستند حکیم بھی ہیں۔ اُن کو عصرِ حاضر کے نمائندہ اساتذہ سے شرفِ تلمذ حاصل رہا ہے۔ ظفر علی خان، جوشؔ ملیح آبادی اور صفیؔ لکھنوی سے استفادۂ فن کیا۔ قیامِ پاکستان کے وقت آپ کی عمر تیس سال کے قریب تھی۔ آغازِ ملازمت جنرل ہیڈ کوارٹر دہلی سے ہوا، اور پاکستان بننے کے بعد وزارتِ صنعت میں ملازمت کی۔ منسٹری آف لیبر سے بھی وابستہ رہے۔ ۱۹۸۰ء میں ریٹائر ہوئے۔

راغبؔ مرادآبادی اپنی بعض خصوصیات کی وجہ سے عصرِ حاضر میں ممتاز اور منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔ اُن کی زود گوئی اور بدیہہ گوئی ماضی کے اُن اُستادانِ فن کی یاد تازہ کرتی ہے جو ایک نشست میں بے شمار اشعار کہہ دیتے تھے۔ یہ خصوصیت راغبؔ میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ آپ کثیر التصانیف شاعر ہیں۔ نعتیہ شاعری کے آٹھ مجموعے، غزلیہ شاعری کے دو مجموعے، دینی اور قومیت کی شاعری کے چھ مجموعے اور نثری کتاب "مکالماتِ جوشؔ و راغبؔ" چھپ کر عوام و خواص سے دادِ تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

راغبؔ مراد آبادی کا شمار اس وقت اساتذہ سخن میں ہوتا ہے۔ علمِ عروض پر آپ کی نظر گہری ہے۔ رباعی موصوف کی پسندیدہ صنف ہے۔ نعتیہ مجموعہ "مدحِ رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم)" صنعتِ غیر منقوطہ میں اُن کی فنی مہارت اور قادر الکلامی کا آئینہ دار ہے۔ راغبؔ کی نعتوں میں سرورِ کائنات (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم) سے محبت و عقیدت کا درس نمایاں نظر آتا ہے۔ کراچی سے شائع ہونے والی نعتیہ کتب پر آپ کی آراء بھی نظر آتی ہیں۔ کراچی کے بزرگ شعراء میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ فیڈرل بی ایریا، کراچی میں مقیم تھے:

ڈاکٹر عاصی کرنالی "اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر" صفحہ ۳۱۰ پر راغبؔ مراد آبادی کے حوالے سے رقم طراز ہیں "مدحت خیر البشر" میں راغب صاحب نے غالب کی غزل کی زمینوں پر نعتیں کہی ہیں۔ غالب کے مصرعوں کی تضمین نہیں کی، صرف ان کی زمینوں کو برتا ہے اور اس انوکھے اور عمدہ تجربے کے حوالے سے نعت گوئی میں ایک نیا اضافہ ہو گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں قرآن و حدیث کے حوالے موجود ہیں۔ بعض اشعار میں آیات و احادیث کے حوالے موجود ہیں۔ بعض اشعار میں آیات و احادیث کی تفہیم کی ہے۔"

◆◆◆

نعت

رسولِ ہدیٰؐ کا کرم اللہ اللہ
ہوا دُور اِک اِک الم اللہ اللہ

سوادِ حُدودِ حرم اللہ اللہ
حدودِ حرم اور ہم اللہ اللہ

رہا اللہ اللہ کرم اُس کا ہر دم
ہوا سہل کارِ عدم اللہ اللہ

محمد ہر طرح مالکِ ملک اُس کا
وہ سردارِ اہلِ ہمم اللہ اللہ

مددگار ہو گا وہ ہر کلمہ گو کا
لحد ہو کہ راہِ عدم اللہ اللہ

رہو محوِ مدحِ رسولِ دو عالمؐ
ہو ہر لحظہ کارِ اہم اللہ اللہ

غزل

موجِ نسیمِ صبح نہ جوشِ نمو سے تھا
جو پھول سرخرو تھا خزاں کے لہو سے تھا

تیرے سکوت نے اسے ویران کردیا
دل باغ باغ تھا تو تری گفتگو سے تھا

اب دل کے رہ گزار میں وہ چاندنی کہاں
اپنا بھی ربط و ضبط کسی ماہ رو سے تھا

مدت ہوئی کہ دل کا وہ گلشن اجڑ گیا
شاداب جو ترے نفسِ مشکبو سے تھا

خواب و خیال ہیں وہ نشاط آفرینیاں
رقصِ بہار دل میں تری آرزو سے تھا

سوئے ادب کہوں کہ اسے بے تکلفی
راغب بجائے آپ مخاطب وہ تو سے تھا

پروفیسر رحمان خاور

ظل الرحمٰن خان ریاست رام پور کے ادبی گہوارے میں ۳ رجنوری ۱۹۳۷ء کو مولوی ننھے خان رخوش شادانی کے گھر پیدا ہوئے۔ ریاست رام پور کی ادبی، ثقافتی اور علمی خدمات کو ہمیشہ تاریخ میں یاد رکھا جائے گا۔ نواب کلبِ علی خان صاحب کی فیاض طبیعت نے علم و ادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ نواب کا زمانہ ریاست رام پور کی تاریخ ادب میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب کہ دنیائے ادب کی مشہور و معروف ہستیاں ریاست رام پور میں قیام پذیر تھیں۔ مرزا داغ دہلوی، امیر اللہ تسلیم، امیر مینائی اور ان تینوں کے ہم عصر جلال لکھنوی بھی وہاں موجود تھے۔

ظل الرحمٰن جو رحمٰن خاور کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں اُن کا خمیر اسی مٹی سے اُٹھا ہے۔ موصوف کا تاریخی نام بخت یار عالم ہے۔ مروجہ تعلیم ایم اے اُردو ہے۔ گورنمنٹ اسلامیہ آرٹس و کامرس کالج میں معلم رہے۔ مرزا عابد علی بیگ تحر رام پوری سے شرف تلمذ حاصل تھا۔ جنوری ۱۹۵۸ رام پور سے ہجرت کر کے کراچی آگئے ریڈیو پاکستان کراچی سے کمرشیل سروس کے لیے اسکرپٹ لکھتے رہے۔ اسلامیہ کالج سے ۱۹۸۹ میں ریٹائر ہو گئے۔

۳۸ رسال سے شفیعِ عاصیاں جناب سرورِ کونین (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم) کی مدحت سرائی میں مگن ہیں۔ محراب حرم ۱۹۸۹ء اور ''بعد از خدا بزرگ توئی'' موصوف کے نعتیہ مجموعے ہیں جن میں چیدہ چیدہ نعتیں جمع ہیں۔ روایت مجموعہ غزل (۱۹۸۲) میری نظمیں میرے گیت (۲۰۱۳ء) میں شائع ہوئے۔ آپ کراچی میں مقیم رہے پھر اپنے بیٹے کے ساتھ کینیڈا میں رہائش پذیر ہو گئے اور اب وہاں کی ادبی سرگرمیوں میں حصہ لے رہے ہیں۔

نعت

روشن ہے جس سے زیست کی یہ انجمن تمام
اس نورِ آگہیؐ پہ فدا جان و تن تمام

توصیفِ مصطفیٰؐ کے لیے لفظ اب کہاں
اس ذاتِ پاکؐ پر ہوئے سارے سخن تمام

اُٹھا حرا کے غار سے وہ سیلِ رنگ و بو
گلزارِ خلد بن گئے دشت و دمن تمام

میں اور میری کج کلہی دونوں کچھ نہیں
نسبت ہے آپؐ کی ہے مرا بانکپن تمام

آئی ہے اس طرف جو مدینے سے کچھ ہوا
خوشبو میں بس گئی ہے فضائے وطن تمام

خاورؔ نہ پوچھ وصف مرے کملی پوش کا
ہر رنگ، ہر لباس میں گل پیرہن تمام

غزل

محبت یہ بتا کیا سلسلہ ہے
یہ منزل ہے کہ میرا راستہ ہے

اب اس کا نام دل سے کیا مٹانا
جو ہم نے لکھ دیا ہے لکھ دیا ہے

درِ دل پر صدائیں دینے والے
چلا بھی آ کہ دروازہ کھلا ہے

میں اپنے آپ میں گم ہوگیا ہوں
تری آواز کا جادو بھی کیا ہے

یہ کہتی ہے تیرے ہونٹوں کی جنبش
کہ ان سے اور کوئی بولتا ہے

زمیں ہے یا کوئی مہتاب خاورؔ
ستارہ ہے کہ مٹی کا دیا ہے

رحمٰن کیانی

(۱۹۲۲.....۱۹۹۰ء)

پاک فضائیہ کے افسر عبدالرحمن کیانی کی عرفیت محمد میاں تھی، مولوی حافظ محمد عبدالحق فرنگی محل اور ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فارغ التحصیل ہونے والے طالب علم بعدازاں اُستاد مقرر کیے گئے تھے۔ اُن کے گھر ۳۰ راگست ۱۹۲۲ء بہ مطابق ۲۹ رمحرم ۱۳۴۲ ہجری کو رحمٰن کیانی نے جنم لیا، بزرگوں سے عربی و فارسی کی ابتدائی تعلیم لینے کے بعد انڈین ایرونائیکل سے تکنیکی تعلیم حاصل کی، ۱۹۴۳ء میں ۱۹ ربرس کی عمر میں برطانیہ کی رائل ایئرفورس میں اسلحہ ساز کے طور پر ملازمت سے عملی زندگی کا آغاز کیا اور دوسری جنگِ عظیم میں سپاہی بن کر جنگ میں حصہ لیا اور ۱۹۴۶ء میں رائل ایئرفورس سے سبک دوش ہو گئے۔ ۱۹۵۳ء میں اسلحہ سازی کی انجینئرنگ میں ڈپلوما لیا اور جنگِ عظیم سے فراغت کے بعد ۱۹۵۸ء میں ایئریونی ورسٹی امریکا سے سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔ ۱۰ ربرس تک ایئرو ناٹکس اسکول میں پڑھاتے رہے۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں بھی شریک رہے، اور ۱۹۷۶ء میں پاک فضائیہ سے بہ طور ماسٹر وارنٹ افسر وظیفہ یاب ہوئے۔ رحمٰن کیانی نے ۱۴ ربرس کی عمر میں شعر گوئی کا آغاز کر دیا تھا اور روایتی گل و بلبل کے اشعار لکھنے لگے تھے، ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر رہے۔

۱۹۵۸ء میں ترقی پسند تحریک سے علیحدہ ہو کر قومی و ملی شاعری پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ ۱۹۶۵ء میں اُن کا طویل رجزیہ ملک کے موقر جرائد میں شائع ہوا، سرکاری اور عوامی سطح پر اُن کی پذیرائی کی گئی، خود کو ایک شعلہ بیاں رجز خواں منوانے کے بعد فروری ۱۹۹۰ء میں لاہور میں دارِفانی سے کوچ کر گئے۔ اُن کا نعتیہ کلام ''شمشیرِ ضیا بار'' ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا۔

نعت

رائج ہزار ڈھنگ ہوں ذکرِ حبیبؐ کے
شاہیں سے مانگیے نہ چلن عندلیب کے

مانا حبیبؐ خالق اکبر رسولؐ کو
خیرالوریٰ و شافعِ محشر رسولؐ کو

لیکن جو ذات مدحِ بشر سے بلند ہے
ہم سے یہ پوچھیے کہ ہمیں کیوں پسند ہے

جب بھی سپاہیوں سے پیمبر کو پوچھیے
خندق کا ذکر کیجیے خیبر کو پوچھیے

ہم کو حنین و مکہ و موتہ بھی یاد ہیں
ہم امتیِ بانیِ رسمِ جہاد ہیں

لڑتے ہیں جس کے شوق میں ہم جھوم جھوم کر
پیتے ہیں جامِ مرگ کو بھی چوم چوم کر

ہاں مُفتی و فقیہہ نہیں مان لیتے ہیں
ناموسِ مصطفیٰؐ پہ مگر جان دیتے ہیں

غزل

وقت کہتا ہے کہ پھر سینہ سپر ہو جایئے
سر اگر کاندھوں پہ ہے شوریدہ سر ہو جایئے

اہلِ شب کی یورشوں میں آپ بھی جیسے چراغ
رکھ کے سر اپنا ہتھیلی پہ نڈر ہو جایئے

دیکھیے رنگیں تباہی میں ہے کتنا بانکپن
جب کبھی اپنے لہو سے تر بتر ہو جایئے

دشمنوں سے عمر بھر کیوں مانگیے جینے کی بھیک؟
سر کٹا کر اس سے بہتر ہے امر ہو جایئے

شر ہو جب مدِ مقابل بدر و خندق کی طرف
دیکھیے اور پیروِ خیر البشرؐ ہو جایئے

رضاؔ ہمدانی

(۱۹۱۰۔۱۹۹۴)

رضا ہمدانی ۷؍مئی ۱۹۱۰ء کو پشاور میں منشی مہدی حسن ہمدانی کے گھر میں پیدا ہوئے۔ پشاور یونی ورسٹی سے گریجویشن کیا۔ اُن کا ذریعۂ معاش تجارت اور صحافت رہا، بعد میں قومی ورثہ اسلام آباد میں افسرِ تحقیق کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔ اُن کو علاقائی زبانوں پر عبور حاصل رہا تھا۔ اردو کے علاوہ مادری زبان پشتو، ہندکو اور پنجابی کے ساتھ انگریزی میں بھی لکھ پڑھ سکتے تھے۔

معروف شاعر فارغؔ بخاری کے ساتھ مل کر انجمن ترقی اُردو کے لیے بیش بہا خدمات سر انجام دیں۔ اُن کی تالیفات میں ''ادبیاتِ سرحد''، ''پشتو کلاسیکی شعراء کا تذکرہ'' (مع ترجمہ بزبان اُردو)، ''سائیں احمد علی پشاوری'' جمال الدین افغانی کے حوالے سے تعارفی کتب، ''لوک کہانیاں'' ''یادوں کے جزیرے''، ''صلیبِ فکر'' (شعری مجموعہ)، ''خوشحال خان خٹک کے افکار'' کے ساتھ ہی دل نشیں نعتوں کا مجموعہ ''سدرۃ المنتہیٰ'' بھی اُن کی یادگار ہیں۔

جبکہ راجا رشید محمود کی مشہور کتاب ''پاکستان میں نعت'' میں رضا ہمدانی کی کتاب کا کوئی حوالہ نہیں ملتا۔ رضا ہمدانی کا انتقال ۱۰؍جولائی ۱۹۹۴ء کو پشاور میں ہوا۔

◆◆◆

نعت

نائبِ ذوالجلال بے ہمتا
بندۂ خاصِ خالقِ یکتا

ہادی رہبر طریقِ نجات
شاہِ دیں فخرِ جملہ موجودات

شمعِ فانوسِ محفلِ لاہوت
گلِ خوش رنگ روضۂ ناسوت

تو بہارِ حدیقۂ وحدت
زینتِ عرش و کرسی و جنت

نغمۂ تارِ سازِ الا اللہ
واقفِ رمز و رازِ الا اللہ

باعثِ خلقتِ زمین و زماں
وجہِ تزئینِ محفلِ امکاں

اُس کے آتے ہی اک خوشی چھائی
باغِ توحید میں بہار آئی

غزل

خرابِ عشق سہی عالمِ شہود میں ہوں
ہوں اشک اشک مگر عالمِ وجود میں ہوں

کسی نے نغموں میں تحلیل کر دیا ہے مجھے
نہ گنگناؤ کہ میں پردۂ سرود میں ہوں

تو اپنی ذات سے مجھ کو الگ نہ جان کہ میں
ترے جمال کی نکہت کے تار و پود میں ہوں

خود اپنی ذات کا عرفاں نہ ہو سکا مجھ کو
ابھی میں کشمکشِ دامِ ہست و بود میں ہوں

رضی عظیم آبادی

رضی عظیم آبادی کا خاندانی نام محمد رضی احمد ہے۔ وہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو مشرقی پاکستان میں غلام مصطفیٰ کے گھر پیدا ہوئے۔ ان کے والدین بہار (انڈیا) سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان آئے تھے۔ رضی عظیم آبادی کی تعلیم کا سلسلہ وہیں شروع ہوا، ۱۹۷۰ء میں ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ مشرقی پاکستان کے نامساعد حالات سے گھبرا کر اکتوبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان آئے اور کراچی کو جائے سکونت بنایا۔ رضی عظیم آبادی بھی ان مظلوم افراد میں شامل ہیں جنہوں نے دو ہجرتوں کا کرب سہا ہے۔ کراچی میں آ کر علامہ اقبال کالج میں داخلہ لے کر تعلیم کا سلسلہ آگے بڑھایا۔ ۱۹۷۴ء میں بی اے کا کیا اور بعد ازاں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ پیشے کے طور پر ٹریڈنگ کمپنی میں اکاؤنٹنگ کے امور سر انجام دے رہے ہیں۔

''حلقہ مری زنجیر کا'' مجموعہ غزل ہے اور ''ذکرِ خیر الوریٰ'' نعتیہ مجموعہ ۲۰۱۵ شائع ہوا ہے۔ جبکہ پہلا نعتیہ مجموعہ کلام ۲۰۰۵ء میں بنام ''آئینۂ یزداں'' شائع ہوا تھا۔

رضی عظیم آبادی کی شاعری پر متعدد ناقدینِ فن، مشاہیرانِ شعر و سخن نے اپنی مثبت رائے کا اظہار کیا ہے:

کاوش عمر، مبارک مونگیری اور افسر ماہ پوری کی حوصلہ افزائی کی بنا پر رضی عظیم آبادی شاعری میں متحرک ہیں اور مدحِ حضور اکرم، نورِ مجسم میں مصروف ہیں اور نعتیہ محافل میں شرکت کرتے ہیں۔

◆◆◆

نعت

ذہن و دل میں تھی نہ تحریر و زباں میں روشنی
مدحِ پیغمبر سے ہے حرف و بیاں میں روشنی

اُس کی خاکِ پا کا ہر ذرّہ ہے مہرِ نیم روز
جس کی آمد نے لٹا دی شہرِ جاں میں روشنی

اس قدر سورج کو بھی تابندگی حاصل نہیں
جس قدر ہے اُن کے سنگِ آستاں میں روشنی

دم بخود اسریٰ کی شب تھے ماہ و انجم کہکشاں
رقص کرتی تھی فضائے بیکراں میں روشنی

آج بھی شمعِ یقیں کا فیض جاری ہے یہاں
پھیلتی جاتی ہے دنیائے گماں میں روشنی

ذکر اُس مہرِ رسالت کا جو رہتا ہے سدا
اس لیے رہنے لگی میرے مکاں میں روشنی

جسمِ اطہر سے تو کرنیں پھوٹتی ہی ہیں رضی
حد ہے لو دیتی ہے پیروں کے نشاں میں روشنی

غزل

یہ کیسا دور ہے کہ خود پہ اعتبار نہیں
اسی لیے تو یہ موسم بھی سازگار نہیں

سکونِ قلب میسر نہیں چمن میں کہیں
خزاں کا دور ہے پت جھڑ ہے یہ بہار نہیں

سفر میں دھوپ کی چادر کو اوڑھ لیتا ہوں
کسی طرح بھی کہیں سایۂ اشجار نہیں

چلے بھی آؤ دلِ بیکراں میں وسعت ہے
کہ اس کے قریے میں اب تک کوئی حصار نہیں

ضروری کب ہے کہ محلوں میں ہی رہے انساں
کچھ ایسے لوگ ہیں جن کا کہ گھر دوار نہیں

خرد نہ بند کرے خود پہ بابِ دانائی
جنوں بغیر یہ کشتی لگے گی پار نہیں

یہ جانور بھی تو حالات سے گزرتے ہیں
فقط بشر ہی رہتی جبر کا شکار نہیں

رعنا اکبر آبادی

(۱۸۹۵ـ۱۹۹۷ء)

منظور احمد نے ۲۰ ویں صدی کے آغاز سے پانچ برس قبل ۱۸۹۵ء میں آگرہ (اکبر آباد) میں آنکھ کھولی، اُس وقت برصغیر میں انگریزوں کا طوطی بول رہا تھا اور مسلمان آزادیٔ ہند کے لیے اپنے پر تول رہے تھے۔ بہ قول کسے، سر سید نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کی بنیاد جس دن رکھی، اُسی دن پاکستان کے قیام کی خشتِ اوّل رکھی جا چکی تھی۔ ایک تمنا، ایک آرزو، ایک دُعا کہ اسلامیانِ ہند بھی اپنی آزاد مملکت قائم کرلیں اور اسلام پر اپنے طرزِ حیات کو قائم کرلیں۔

منظور احمد جو "رعنا اکبر آبادی" کے نام سے مشہور ہوئے، اُن کے والد بزرگوار منشی نثار احمد صاحب اپنے علاقے میں محکمۂ بندوبست میں انسپکٹر منصرم اور تحصیل دار بھی رہے۔ انہوں نے منظور احمد کو منشی عالم اور مولوی فاضل کی اسناد کے حصول کے لیے دہلی بھیجا جہاں سے یہ کام یاب لوٹے اور محکمۂ ریلوے میں ملازمت کرنے لگے۔ شاعری کا رجحان دورانِ مطالعہ پیدا ہو چلا تھا نعت، منقبت، رباعی جیسی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ جس کی حوصلہ افزائی ہوئی اور "ذکر و فکر" کے عنوان سے ۱۹۴۰ء میں پہلا مجموعہ انہی اصناف میں شائع کروالیا۔ پھر ۵ سال تک ملازمت میں رہنے کے بعد ریلوے کی ملازمت ترک کر کے اپنا ذاتی کاروبار کرنے لگے اور ایک تجارتی رسالہ بھی نکالا جو آٹھ برس تک تواتر سے شائع ہوتا رہا۔

ہجرت کے بعد کراچی کو اپنا مستقل مستقر بنانے کے بعد رعنا اکبر آبادی نے اپنا ذاتی

کاروبار جمایا اور اکبر آبادی کے خواجہ محمد امیر ، المعروف صبا اکبر آبادی سے اپنی صاحب زادی کی شادی کروی جن کے صاحب زادوں میں سلطان جمیل نسیم (افسانہ نگار) ، تاجدار عادل (شاعر اور ٹی وی پروڈیوسر) بھی شہرت کے حامل ہیں۔ جب کہ رعنا اکبر آبادی کے صاحب زادے سہیل رعنا ریڈیو، فلم اور ٹی وی کے موسیقار کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ گویا آپ کا گھرانہ "ایں خانہ ہمہ آفتاب" کے مصداق ہے۔

رعنا اکبر آبادی کے شعری مجموعوں میں "غزلِ رعنا"، "رباعیاتِ رعنا" جس میں ایک ہزار رباعیات ہیں اور ان پر جوش ملیح آبادی کا اثر نمایاں ملتا ہے۔ نیز ۱۹۴۰ء میں شائع ہونے والا مجموعہ "ذکر و فکر" (اشاعتِ ثانی) کراچی سے شائع ہوئے۔

جب کہ ان کی نعتوں کا مجموعہ "تسبیحِ رعنا" بھی ۱۹۶۹ء میں منظرِ عام پر آچکا ہے۔ جس کی نعتیں محبت و عقیدت سے پُر ہیں۔ رعنا اکبر آبادی کا انتقال ۱۵ر جنوری ۱۹۷۹ء میں کراچی میں ہوا تھا۔

نعت

گلِ معنی کھلا جب رحمۃ للعالمینؐ آئے
مشیت تھی کہ آخر میں بہارِ اوّلیں آئے

تڑپ کر رہ گیا ایک ایک ذرہ بزمِ ہستی کا
تجلی تھی کچھ ایسی ہر نظر کچھی یہیں آئے

زمیں پر لے کے اوجِ عرش سے تحفے محبت کے
خدا واقف ہے کتنی مرتبہ روح الامیں آئے

ستارے رہ گئے سارے تڑپ کر بامِ قدرت پر
زمیں کے چاند بن کر جب یہ بالائے زمیں آئے

رسولؐ اللہ کا عرفاں ہے عرفانِ خدا رعنا
اگر ایماں نہ ہو اُن پر خدا کا کیا یقیں آئے

غزل

سنتے ہیں کہ مل جاتی ہے ہر چیز دعا سے
اک روز تمہیں مانگ کے دیکھیں گے خدا سے

جب کچھ نہ ملا ہاتھ دعاؤں کو اٹھا کر
پھر ہاتھ اٹھانے پڑے ہم کو بھی دعا سے

دنیا بھی ملی ہے غم دنیا بھی ملا ہے
وہ کیوں نہیں ملتا جسے مانگا تھا خدا سے

تم سامنے بیٹھے ہو تو ہے کیف کی بارش
وہ دن بھی تھے جب آگ برستی تھی گھٹا سے

اے دل تو انہیں دیکھ کے کچھ ایسے تڑپنا
آجائے ہنسی ان کو جو بیٹھے ہیں خفا سے

آئینے میں وہ اپنی ادا دیکھ رہے ہیں
مرجائے کہ جی جائے کوئی ان کی بلا سے

رفیع الدین رازؔ

مرزا رفیع الدین بیگ کا قلمی نام رفیع الدین رازؔ ہے۔ وہ ۲۱ راپریل ۱۹۳۸ء کو بیگو سرائے (بہار۔ انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ دو ہجرتوں کا کرب سہا۔ پہلی ہجرت بہار (ہندوستان) سے مشرقی پاکستان (بنگلہ دیش) کی اور دوسری ہجرت بنگلہ دیش سے کراچی (پاکستان) آئے۔ یہاں وہ خالی ہاتھ آئے تھے اور انھوں نے دوسری بار اپنی نئی زندگی کا آغاز صفر سے کیا اور آج ان کی محنت کا صلہ اللہ رب العزت نے انھیں عزت، دولت، شہرت اور عظمت عطا کر کے دے دیا۔

ایم اے (جنرل ہسٹری) کی ڈگری جامعہ کراچی سے حاصل کی اور شعر و سخن میں خوب نام کمایا۔ آج رفیع الدین رازؔ کے اشعار دنیا بھر میں سفر کر رہے ہیں۔ اس وقت رفیع الدین رازؔ کو انگلینڈ، کناڈا اور امریکا کا سب سے معتبر، اہم اور بڑا شاعر تسلیم کر لیا گیا ہے۔

رفیع الدین رازؔ نے غزل، نظم، مسدس، ہائیکو، ماہیے، ترویجی، حمد، نعت، منقبت، سلام اور منظوم سیرت لکھی ہے۔ ان کی اب تک شعری و نثری 18 تصانیف شایع ہو چکی ہیں۔

مطبوعہ کتابیں: (۱) دیدۂ خوش خواب (مجموعۂ غزل) (۲) بینائی (مجموعۂ غزل/نظم)، (۳) پیراہنِ فکر (مجموعۂ غزل) (۴) روشنی کے خدوخال (نعتیہ مسدس)، (۵) ابھی دریا میں پانی ہے (مجموعۂ نظم) (۶) اتنی تمازت کس لیے (مجموعۂ غزل)، (۷) جو اِک دن آئینہ دیکھا (مجموعۂ نظم)، (۸) رنگِ ادب رفیع الدین رازؔ نمبر، (۹) فن و شخصیت (مقالہ ایم اے اُردو)، (۱۰) جمالِ حرفِ رازؔ (۱۲۵ منتخب غزلیں)، (۱۱) سازو راز (مجموعۂ رباعیات)، (۱۲) دوہا پھلواری (دوہے)، (۱۳) دل آئینہ ہوا (نعتیہ مجموعہ) (۱۴) سقراط سے شیخ چلی تک (انشائیے)، (۱۵) اک کون و

مکاں اور (مجموعۂ غزل) (۱۶) قطعات البم (قطعات)' (۱۷) بات سے بات (انشائیے) (۱۸) سخن سرمایہ (کلیاتِ رفیع الدین راز)' (۱۹) کہسار خوش جمال (مجموعۂ غزل)' (۲۰) پیراہن بدلتا ہے لہو (مجموعۂ غزل)' (۲۱) در آئینہ (مجموعۂ غزل)' (۲۲) دل کا گلستان (ہائیکو)

گزشتہ سال جناب رفیع الدین رازؔ کی کلیاتِ غزل "سخن سرمایہ" سات مجموعہ ہائے غزل پر مشتمل شائع ہوئی جس کی بیرونِ ممالک کے سات شہروں میں تقریباتِ رونمائی منعقد ہوئیں جو کہ نہ صرف خوش آئند ہے بلکہ ایک ریکارڈ بھی ہے۔

"رفیع الدین راز......فن وشخصیت" کے عنوان سے کراچی یونی ورسٹی سے ایم اے (اُردو) کا تحقیقی مقالہ کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ جناب گوہرؔ ملسیانی نے رفیع الدین رازؔ کی تمام شعری ونثری تصانیف کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک غیر رسمی مقالہ بہ عنوان "سخن کا چراغ......رفیع الدین راز" تحریر کیا جو زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔ ہندوستان کی ایک یونی ورسٹی سے رفیع الدین رازؔ کے فن وشخصیت پر پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ مکمل ہو چکا ہے اور متعدد ایسے شعری انتخاب ترتیب دیے گئے ہیں جن میں ساحرؔ لدھیانوی، فراقؔ گورکھپوری اور جاں نثار اخترؔ کے ساتھ رفیع الدین رازؔ کو شائع کیا گیا ہے۔ ان کے مجموعۂ حمد ونعت "دل آئینہ ہوا" سے ایک نعت پیشِ خدمت ہے۔

نعت

جب انجمن میں آمدِ ذاتِ نبیؐ ہوئی
سورج نے روشنی سے کہا روشنی ہوئی

اللہ رے، وہ نام کہ جس نام کے طفیل
دنیائے رنگ و نور کی صورت گری ہوئی

صحرا نے نقشِ پائے نبیؐ چوم کر کہا
لو آج میری شاخِ تمنا ہری ہوئی

اے بادِ خوش خرام مجھے بھی تو کچھ بتا
طیبہ سے آ رہی ہے کسے ڈھونڈتی ہوئی

طیبہ کی سر زمین پہ دن ہو کہ رات ہو
رہتی ہے رنگ و نور کی چادر بچھی ہوئی

صدیوں سے جس دیار میں ٹھہری ہوئی تھی دھوپ
اس دشت، اس زمیں کی فضا شبنمی ہوئی

ہاتھوں میں احتیاط کا دامن ہے پھر بھی رازؔ
اک سرحدِ گماں ہے یقیں سے ملی ہوئی

غزل

نہ وحشت کا وہ عالم ہے نہ وہ سودا رہا سر میں
کہاں تک کوئی ڈھونڈے موم کے اوصاف پتھر میں

وہ اک چہرہ کہ جس کے حسن کی تفہیم کی خاطر
مری بینائی رقصاں ہے ہر اک شاخ گل تر میں

مجھے لگتا ہے پھر تشکیل نو کا مرحلہ آیا
میں جب بھی دیکھتا ہوں کوئی پتھر دست آزر میں

ضروری ہے گلوں کا تذکرہ آنگن کی مٹی میں
وگرنہ دشت کی ویرانیاں آجاتی ہیں گھر میں

دلوں کے فاصلوں کو آؤ مل کر کم کریں ہم تم
چلو چلتے ہیں پھر ہم سنگ اسود رکھ کے چادر میں

سبب کیا ہے یہ ہم پر راز اب تک کھل نہیں پایا
رکھا ہے اس نے کیوں آتش فشاں مٹی کے پیکر میں

روشن علی عشرت

روشن علی عشرت کا آبائی وطن لکھنؤ ہے، جناب کی پیدائش سے لے کر تعلیم و تربیت کا زمانہ کلکتہ شہر گزرا، شاعری سے لے کر مزدوروں کے مفادات کے لیے کام کرتے رہے۔ حالات و واقعات کی تبدیلی سے مشرقی پاکستان کی مہاجرت اختیار کی، زندگی کے طویل و کٹھن ادوار وہاں پر گزارے، وہاں کی فلمی شاعری سے لے کر بزم شعر و ادب تک میں سرگرم عمل رہے۔

روشن علی عشرت کا ذریعہ معاش پرائیوٹ ملازمت رہی ہے۔ تاہم بنگلہ دیش کے قیام کے سبب بے شمار لوگوں کی طرح ایک یہ افتاد ان پر بھی آن پڑی کہ وطن ثانی کے لیے ہجرت کے عمل سے گزرے۔ جناب کا آخری مسکن کراچی رہا ہے، تاہم یہاں علمی و ادبی مجالس سے کنارہ کش اور مضافاتی بستی محمود آباد میں مقیم رہے۔ جس درجہ کے شاعر رہے ان سے کم تر درجے کے شعراء تعلقاتی ادب کی وجہ سے ناموری کی طرف گامزن رہے۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ ''صلیب'' ادبی قارئین تک آیا، ایک طاقتور ابلاغی صلاحیت سے بھرپور مجموعہ غزل نے بہت سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ بھی کیا۔ اللہ بھلا کرے ان کے شاگردوں کا جنہوں نے اپنے استاد کو گوشۂ گمنامی میں جانے سے بچالیا۔

روشن علی عشرت کا نعتیہ مجموعہ ''شاخِ طوبیٰ'' ہے۔ جس میں ان کی محبت و عقیدت کے جوہر اپنی شاعرانہ عظمت کے ساتھ جلوہ فگن ہیں۔ انسان پر جتنی بھی بلائیں نازل ہوں دل میں اسلامی طرز حیات سے لگاؤ کی خواہش موجود ہو تو بلاشبہ نعت رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) زندگی کے دھارے کو بدل دیتی ہے، آدمی آہستہ آہستہ اپنے فطری طرز معاشرت کی طرف لوٹ جاتا ہے۔ آپ بھی اپنے غمگسار شاگردوں کو چھوڑ کر ادبی محفلوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کنارہ کش ہو گئے۔ ۱۸ر جنوری ۲۰۰۲ء میں خاک کراچی میں پنہاں ہو گئے۔ اللہ ان کے ساتھ عافیت کا معاملہ فرمائے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے ان کا نعتیہ مجموعہ تادیر یاد رکھا جائے گا۔

◆◆◆

نعت

رسولِ آخر بھی بن کے آئے رہے بھی ہر کارواں سے آگے
تمہاری منزل ہے یا محمدؐ حدودِ وہم و گماں سے آگے

ملی جسے معرفت تمہاری وہ فاتحِ شش جہات ٹھہرا
اسی کے نقشِ قدم ہیں روشن فصیلِ کون و مکاں سے آگے

لبِ مشیت پہ آپؐ ہی کا تھا اسم پُر نور یا محمدؐ
وجودِ لوح و قلم سے پہلے بنائے حرف و بیاں سے آگے

ملک ہی پر منحصر نہیں کچھ حضورؐ کی ہو اگر عنایت
پرندِ فکرِ رسا بھی گزرے بلندیٔ آسماں سے آگے

تجلیوں کی لطیف موجیں فلک کی چادر سے کیسے رُکتیں
پلک جھپکتے شہِ دوعالمؐ پہنچ گئے آسماں سے آگے

کبھی کسی معرکے میں جس نے نبیؐ کی نصرت سے منہ نہ موڑا
اٹھائے انسانیت کا پرچم وہی رہا کارواں سے آگے

محبتِ سرورِ دوعالمؐ کا پاس تجھ کو اگر ہے عشرت
بساطِ حرص و ہوس الٹ دے قدم بڑھا دشتِ جاں سے آگے

غزل

رہتی کہاں ہے ساتھ وفادار کی طرح
میری حیات بھی ہے مرے یار کی طرح

مانوس ہوں جو میں تپشِ روزگار سے
لگتی ہے دھوپ سایۂ دیوار کی طرح

وہ شخص جو نہ حق سے گریزاں رہا کبھی
دربار میں کھڑا ہے خطا کار کی طرح

اس شہر میں ضمیر فروشی کا ہے رواج
یہ شہر کب ہے مصر کے بازار کی طرح

گلچیں سے ساز باز جو رکھتے ہیں دوستو
چبھتے ہیں ان کی آنکھ میں ہم خار کی طرح

اس عہدِ نو میں ان کی سیاست عجیب ہے
انکار بھی وہ کرتے ہیں اقرار کی طرح

عشرت فراقِ دوست میں تلخابۂ حیات
میں پی رہا ہوں شربتِ دیدار کی طرح

رونق حیات

''خاندانی نام محمد رونق خان قلمی نام رونق حیات ۔ لقب شاعرِ جمالیات ولسیات'' ۔ ولادت چودہ جولائی سنہ انیس سو چوّن ۱۹۵۴ء نسلاً یوسف زئی افغان ۔ ولدیت احمد اللہ خان جو انیس سو اڑتالیس میں ہجرت کر کے کراچی تشریف لائے ۔ ان کا پیشہ تجارت تھا ۔ رونق حیات بی اے پاس ہیں ۔ ملازمت کا آغاز سنہ انیس سو تہتر ۱۹۷۳ء سے کیا اور چودہ جولائی دو ہزار چودہ ۲۰۱۴ء کو بحیثیت لیبر آفیسر ریٹائر ہوئے ۔ شاعری میں تلمذ راغب مراد آبادی سے ہے ۔ آغاز شاعری انیس سو اکہتر ۱۹۷۱ء سے کیا ۔ رونق حیات کے مطبوعہ شعری مجموعوں میں ہجر کی کہکشاں ۔ سورج کا گھر ۔ قربتیں ۔ دشتِ ہجر ۔ اشکِ رواں کا موسم، پاؤں چھونے کی طلب (نعتیہ) یہ مجموعے غزلیات منظومات قطعات' رباعیات اور نعتیہ کلام پر مشتمل ہیں ۔ متوقع مجموعوں میں دہکتے گلاب (جمالیاتی ولسیاتی منظومات) جگنو مری آنکھوں میں، (ماہیے) اس کے علاوہ نظموں' غزلوں، نعتوں اور حمدوں اور دیگر اصناف یہ غیر مرتب کلام خاصا موجود ہے ۔ ان پر ایم اے کے تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں ۔ ان پر اردو ادب کے جن اہم مشاہیر ناقدین وشعراء نے آرا دی ہیں ان میں ڈاکٹر جمیل جالبی، اسلم فرخی، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی ۔ سحر انصاری، احفاظ الرحمٰن، فراست رضوی، پروفیسر جی کتاؤ (جاپانی) ڈاکٹر نثار ترابی ۔ ریاض صدیقی ۔ ڈاکٹر عزیز احسن ۔ ڈاکٹر خاور جمیل، منظر عارفی ۔ مذکورہ مشاہیر کے علاوہ بھی بہت سے ہیں ۔ خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی کے انتقادی مضمون میں رونق حیات کی شاعری پر سیر حاصل رائے اور ان کی شاعرانہ انفرادیت کا اعتراف ملتا ہے ۔''

◆◆◆

نعت

جب اُن کے روضے کے دیوار و در کو دیکھتے ہیں
تو عکس و آئینہ، آئینہ گر کو دیکھتے ہیں

سفر کو جب بھی نکلتے ہیں ہم مدینے کے
تو خوشبوؤں میں بسی رہ گزر کو دیکھتے ہیں

قدم قدم پہ ہم اس جلوہ گاہِ رحمت میں
نظر کو، نور کو، دل کو، جگر کو دیکھتے ہیں

جو اہلِ دل ہیں، وہی دیکھتے ہیں شہرِ نبیؐ
جو اہلِ زر ہیں فقط مال و زر کو دیکھتے ہیں

وہ جن کے قدموں کو رشکِ فلک کہا دل نے
جُھکا جُھکا انہی قدموں پہ سر کو دیکھتے ہیں

تجلیات کے آگے درِ رسولؐ کی ہم
بُجھا بُجھا ہوا شمس و قمر کو دیکھتے ہیں

بہ شوقِ دیدِ مدینہ جب اُڑتے ہیں طائر
بلندیوں کو نہ پھر بال و پر کو دیکھتے ہیں

غزل

شکستِ ساز کا منظر کبھی نہیں دیکھا
بدن نے روح کے اندر کبھی نہیں دیکھا

ہماری آنکھ کو پتھر بنانے والوں نے
خود اپنی آنکھ کا پتھر کبھی نہیں دیکھا

میں خوش گمانِ محبت تھا اس لیے میں نے
خیال و خواب سے باہر کبھی نہیں دیکھا

یہ میرا دل مرے سینے سے اس کے سینے میں
گیا تو ایسا کہ مڑ کر کبھی نہیں دیکھا

ستم تو یہ ہے، کہ بجھتے ہوئے چراغوں نے
ہوا کے ہاتھ میں خنجر کبھی نہیں دیکھا

ستارے دیکھنے والوں نے میری قسمت کے
خود اپنا بگڑا مقدر کبھی نہیں دیکھا

خدا کا شکر ہے رونق کہ اس کی آنکھوں نے
مرے غموں کا سمندر کبھی نہیں دیکھا

رئیس امروہوی

(۱۹۱۳ء۔۱۹۸۸ء)

سید محمد مہدی رئیس امروہوی کا پورا گھرانہ چشم بددور شعر و سخن اور صحافت پر مامور چار دانگ عالم میں مشہور رہا۔ سید محمد تقی جنگ کے مدیر، رئیس امروہوی جنگ کے قطعہ نگار، سید محمد عباس عالمی ڈائجسٹ، انشاء کے منتظم اشاعت، سید محمد اصغر جون ایلیا سرگزشت کے کالم نگار، شاعر چار مجموعوں کی شہرت۔

چالیس برس کا عرصہ روزانہ قطعہ لکھنے والے "الف" سے شعری مجموعہ کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ "مثنوی یزداں"، "پس غبار"، "ملبوسِ بہار"، "انجم السحر"، "قطعات رئیس امروہوی"، "حمیر خانہ" اور "حکایات نے" (غزلیں) تک کا سفر شعری سرمایہ دے گیا۔ جنگ میں جنسیات و نفسیات پر مبنی کالموں کے مجموعے "عالم ارواح"، "عجائب نفس"، "مظاہر نفس"، "ٹیلی پیتھی"، "ہپناٹزم" کون سا موضوع ان کی گرفت میں آ کے کتاب نہ بنا؟۔

رئیس اکادمی سے مستقل ان کے فکر و فن پر مشتمل کتابیں شائع ہو رہی ہیں۔

اچھے مرزا ڈائجسٹوں میں قسط وار پھر کتاب "المیہ مشرقی پاکستان" (دو حصے) لکھ گئے۔

صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی کے حامل رئیس امروہوی ۱۲ ستمبر ۱۹۱۳ء امروہہ ضلع مراد آباد میں علامہ سید شفیق حسن ایلیا کے گھر پیدا ہوئے اور ۲۲ ستمبر ۱۹۸۸ء کو حادثے میں وفات پا گئے۔ سخی حسن قبرستان میں تمام برادران و خویش ایک ہی احاطے میں مدفون ہیں۔

نعت

کس کا جمالِ ناز ہے جلوہ نما یہ سو بہ سو
گوشہ بہ گوشہ در بہ در قریہ بہ قریہ کو بہ کو

میری نگاہِ شوق میں حسنِ ازل ہے بے حجاب
غنچہ بہ غنچہ گل بہ گل لالہ بہ لالہ بو بہ بو

یہ میرا اضطرابِ شوق رشکِ جنونِ قیس ہے
جذبہ بہ جذبہ دل بہ دل شیوہ بہ شیوہ خو بہ خو

تیرا تصورِ جمال میرا شریکِ حال ہے
نالہ بہ نالہ غم بہ غم نعرہ بہ نعرہ ہو بہ ہو

بزمِ جہاں میں آج بھی یاد ہر طرف تری
قصہ بہ قصہ لب بہ لب خطبہ بہ خطبہ رو بہ رو

عالمِ شوق میں رئیس کس کی مجھے تلاش ہے
خطہ بہ خطہ رہ بہ رہ جادہ بہ جادہ سو بہ سو

غزل

مجبور ہر انجمن ہیں ہم لوگ
اپنے میں جلا وطن ہیں ہم لوگ

جو سبزہ و برگ سے ہو محروم
وہ شبنمِ بے کفن ہیں ہم لوگ

اے اپنی ہی خلوتوں میں ملبوس!
شاید تری انجم ہیں ہم لوگ

خود اپنے وجود میں مقید
پابستۂ بے رسن ہیں ہم لوگ

ہر ذرّے میں سامعہ ہے بیدار
کس شخص سے ہم سخن ہیں ہم لوگ

اے عالمِ رنگ رنگ تخلیق
آزردۂ جان و تن ہیں ہم لوگ

ہر عہد کی شہریت سے محروم
ہر شہر میں بے وطن ہیں ہم لوگ

ریاض ندیم نیازی (سبی)

سبی بلوچستان سے اُردو کے نعتیہ ادب کو نعتیہ مجموعہ ''خوشبو تری جوئے کرم'' پیش کرنے والے مداح رسول (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) کا نام ریاض ندیم نیازی ہے۔انہوں نے اپنی زیرِ تذکرہ کتاب میں اپنے حوالے سے جو کچھ زیبِ تحریر کیا ہے۔اس کے مطابق وہ ۱۳/اگست ۱۹۶۸ء کو سبی بلوچستان میں پیدا ہوئے۔بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ سے صحافت میں ایم اے کیا اور پھر ایک سرکاری ملازمت سے وابستہ ہو گئے۔ان کی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے ہوئی۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ''نعتوں،غزلوں اور اشعار پر مشتمل تقریباً ۱۸ کتب اور بچوں کے ادب پر دو کتابیں ان کے فکر و قلم کی مجز نمائی کا ثبوت ہیں۔

ریاض ندیم نیازی کی ادبی فعالیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ انجمن عندلیبان ریاض رسول (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) سبی کے سیکریٹری جنرل ہیں۔دستگیر ٹرسٹ،پاکستان کے مرکزی و ضلعی سیکریٹری نشر و اشاعت ہیں۔حلقۂ پاسبان حرف (پاکستان) کے جنرل سیکریٹری، دستک ادبی سنگت سبی و تھنکرز فورم سبی کے سیکریٹری نشر و اشاعت ہیں۔دستک ویلفیئر سوسائٹی (رجسٹرڈ) سبی کے شعبۂ حمد و نعت کے چیئرمین بھی ہیں اور جنگ کوئٹہ اور جیو نیوز کے اعزازی نمائندے ہونے کے علاوہ نعت کالج کمیشن کراچی،رائیٹر فورم کوئٹہ،ادب سرائے ساہیوال، دبستانِ وارثیہ،کراچی اور دبستانِ بولان کوئٹہ کے اعزازی رکن بھی ہیں۔

''خوشبو تری جوئے کرم'' ریاض ندیم نیازی کا پہلا نعتیہ مجموعہ ہے جو لاہور سے ۲۰۱۰ء میں

شائع ہوا ہے۔اس نعتیہ مجموعے میں ۵ حمدیں، ۴۸ نعتیں اور ۲۲ مناقب و سلام اپنی بہاریں بکھیر رہے ہیں۔اس نعتیہ مجموعے پر پورے پاکستان سے تیس سے زیادہ اہلِ علم و دانش نے اپنی گراں قدر رائے عطا فرمائی ہے۔عرفان الحق صائم اور قمر وارثی نے قطعۂ تاریخ تحریر کیا ہے۔ ''حروفِ عقیدت'' کے عنوان سے جو تحریر ہے،اس میں نیازی صاحب نے اپنی نعتیہ شاعری کے پس منظر اور پیش منظر پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ علامہ ریاض الدین سہروردیؒ کے حلقۂ نعت سے وابستہ ہو کر پہلے نعت خواں بنے پھر نعت گو شاعر بن گئے۔ ۱۹۹۷ء میں انہیں عمرے کی سعادت کے بعد حج کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔وہ علماو مشائخ کے عظیم اور مشہور خانوادے خانوادۂ سلطان باہوؒ سے قلبی و روحانی وابستگی رکھتے ہیں اور اسی سلسلہ ہائے طریقت میں مرید ہیں۔

نعت

جو مدحتوں کو لبوں پر سجائے جاتے ہیں
وہ تیز دھوپ میں بھی سائے سائے جاتے ہیں

خدا کرے شرف حاضری مجھے بھی ملے
کہ لوگ خود نہیں جاتے بلائے جاتے ہیں

میں لمحہ لمحہ درود و سلام بھیجتا ہوں
وہ لمحہ لمحہ مجھے یاد آئے جاتے ہیں

سکونِ قلب کی خاطر رضائے رب کے لیے
ہم اُن کے ذکر کی محفل سجائے جاتے ہیں

دیارِ طیبہ کا سارا جمال، سب منظر
مری نظر، مرے دل میں سجائے جاتے ہیں

دعا کرو کہ انہیں اور بھی ملے توفیق
جو مدحتوں کے حسیں گل کھلائے جاتے ہیں

ندیم دیر نہ ہو جائے اُس حرم میں چلو
جہاں سبھی کے مقدر بنائے جاتے ہیں

غزل

نہیں یہ بات کہ دار و رسن سے ہار گیا
میرا جنوں تو خود اپنی لگن سے ہار گیا

نہ مصلحت ہے نظر میں کوئی نہ کوئی جواز
مرا گلاب گلِ نسترن سے ہار گیا

کچھ اس طرح ہوا ویران گلستاں میرا
اجاڑ دشت و بیابان بن سے ہار گیا

وہ اس کی قید میں دم گھٹ کے مر گیا آخر
ہماری روح کا پنچھی بدن سے ہار گیا

تیری فطانت و چالاکیوں سے ہارا نہیں
ندیم صرف ترے بھولپن سے ہار گیا

ڈاکٹر ریاض مجید

دنیا کی پیدائش سے لے کر آج تک ہر چیز محوِ سفر ہے، انسان کا تعلق براوراست قادر مطلق سے ہے اور وہ اپنے مقرر کردہ وقتوں میں اپنی قدرت کا اظہار کرتا رہتا ہے۔

ماضی کی دنیا آج کے طور طریقوں سے یکسر مختلف رہی ہے، آج ہم دنیا کے لوگوں پر نظر ڈالتے ہیں تو بے شمار خاندان اپنی صلاحیتوں کے فروغ کے لیے محوِ سفر ہیں، ڈاکٹر ریاض مجید کا خاندان دہلی کے علماء و مشائخ کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے "دریا گنج" دہلی کی تاریخی مسجد ہے جسے عرف عام میں "گھٹا مسجد" کہا جاتا تھا، یہ خاندان لدھیانہ منتقل ہوا اور پھر موجودہ جالندھر کینٹ میں مقیم ہو گیا، اس خاندان کے افراد قیام پاکستان کے وقت ملتان، فیصل آباد اور لاہور میں رہائش پذیر ہو گئے۔

ڈاکٹر ریاض مجید ۱۲ر اکتوبر ۱۹۴۲ء کو جالندھر کینٹ مشرقی پنجاب انڈیا میں پیدا ہوئے، ان کے خاندان میں گزشتہ کئی صدیوں سے فروغ علم میں کام کرنے والے افراد کا شمار علماء و مشائخ، مصنفین اور مؤلفین میں ہوتا ہے اور ان کا تذکرہ "تاریخ آرائیاں" مطبوعہ علمی بک ڈپو لاہور میں

موجود ہے۔

اصلی نام ڈاکٹر ریاض الحق اور قلمی نام ریاض مجید برصغیر کے نعتیہ ادب کے حوالے سے ایک محترم اور صاحب علم شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے، ڈاکٹر صاحب کی پی ایچ ڈی کا مقالہ ''اردو میں نعت گوئی'' ایک ایسا علمی، و ادبی اور قومی اثاثہ ہے جو مدتوں اس موضوع پر تصنیف و تالیف کرنے والوں کے پیش نظر رہے گا۔

ڈاکٹر ریاض مجید نے نعت گوئی کے لیے جو تنقیدی اصول مقرر کیے ہیں نعتیہ مقدمہ نگار اس کو پیش نظر رکھیں تو نعت کی تحقیق و تدوین میں گراں قدر اضافہ ہوگا اور نعت گو شعراء حضرات کی نعتوں میں جو کجروی اور کم علمی کی باتیں نظر آتیں ہیں وہ دور ہو جائیں گی۔ ڈاکٹر ریاض مجید کی اب تک کوئی ''۱۷'' کتابیں صاحبانِ علم و فن تک پہنچ چکی ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی محنت کو ہمیشہ بار آور بناتا ہے، ڈاکٹر ریاض مجید کے نعتیہ مجموعے ''اللھم صل علی محمد'' کو ۱۹۹۴ء میں صدارتی سیرت ایوارڈ دیا گیا ہے۔ جبکہ ''حی علیٰ شاہ'' پنجابی نعتیہ ہائکو (۱۹۹۱ء) کا صدارتی سیرت ایوارڈ یافتہ مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت نصیب فرمائے اور ہمیں ان کی تحریروں سے استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

ڈاکٹر شہزاد احمد نا قابلِ فہم ''معاصر فوبیا'' میں مبتلا ہیں۔ اور سوچے سمجھے بغیر اپنے معاصرین پر اعتراضات اٹھانے کے عادی معلوم ہوتے ہیں۔ حقیقت حال تو یہ ہے کہ ڈاکٹر اشفاق اور پروفیسر یونس کے ہاں تو بے شک ضیاء القادری بدایونی کا ذکر نہیں ہوا لیکن ڈاکٹر ریاض مجید نے اپنے مقالے میں بھرپور انداز میں ضیاء القادری بدایونی پر اظہار خیال کیا ہے۔ اپنے ایک اہم معاصر کے خلاف اس کذب بیانی کا پردہ چاک کرنے کے لیے، اور اہلِ علم و تحقیق کی توجہ مبذول کرانے کے لیے میں ڈاکٹر ریاض مجید کی لکھی ہوئی عبارت من و عن نقل کر رہا ہوں تا کہ اس کذب بیانی کے رجحان کی تردید ہو سکے جس کا اظہار ڈاکٹر شہزاد احمد نے اپنے مضمون میں کیا ہے۔ اس قسم کی غیر ذمہ داریوں کے بعد ڈاکٹر شہزاد احمد کا تحقیقی کام کس پائے کا رہ جاتا ہے؟ اور اس پر کتنا اعتماد کیا جا سکتا ہے؟۔ غور طلب نکتہ ہے؟ ڈاکٹر ریاض مجید لکھتے ہیں کہ:

''مولانا ضیا القادری برصغیر پاک و ہند کے ان نعت گو شاعروں میں سے ہیں جن کی نعت گوئی قیام پاکستان سے پہلے مقبولیت حاصل کر چکی تھی۔ مجموعہ ''تجلیات نعت'' ان کے شغف نعت اور جذبہ شیفتگی رسول کا ترجمان ہے۔ نعت گوئی اُن کا ذوق ہی نہیں پوری زندگی تھی۔ نعت میں ان کی

دوسری کتاب "نغمہ ہائے مبارک" ہے۔ یہ ایک مجموعہ سلام کا تاریخی نام ہے۔ اس مجموعے میں مولانا نے اپنے اور دوسرے شاعروں کے سلاموں کو جمع کیا ہے۔ جنہیں دربارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش کیے جانے کی سعادت حاصل ہے۔ مولانا نے ایک منظوم سفر نامہ بھی لکھا۔ جس میں انہوں نے اپنے سفر کی کیفیات و مشاہدات کو قلم بند کیا ہے۔ نعت گوئی کے علاوہ مولانا کی ایک خدمت (نعت کے ذیل میں) بہت اہم ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے حلقۂ اثر میں نعت گوئی کو مقبولِ عام بنایا اور باقاعدہ ایک اسلوبِ نعت کی ترویج کی"۔

ڈاکٹر عزیز احسن نعتیہ حوالے سے جو بھی تحریر لکھتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اندر وہ ایک الہامی قوت کے زیر اثر ہیں۔

"ڈاکٹر ریاض مجید نے تحقیقی اور تخلیقی سطح پر ناقابل فراموش نقوش قائم کیے ہیں۔ ان کی نعتیہ تخلیقات متعدد کتب کی صورت میں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں مثلاً الھم صلی علی محمد، سیدنا محمدؐ، اللھم بارک علی محمدؐ اور سیدنا رحیمؐ۔ ریاض مجید موضوع کی نزاکتوں سے بھی آگاہ ہیں اور ان کے شعری عمل میں اُسوۂ رسول کریم کی تعلیمات کا انسانیت افروز پہلو بھی نمایاں ہے۔ ان کی شاعری میں اسلوب کی جدت اور اظہار کی صفائی نے جاذبیت پیدا کر دی ہے زبان و بیان میں شعریت کا عنصر نمایاں ہے۔ شہزاد احمد ریاض مجید کے بارے میں کیا لکھتے ہیں اور ڈاکٹر عزیز احسن نے کیا لکھا ہے۔ قارئین اس کا موازنہ خود کر لیں۔

نعت

معراجِ بندگی و عبادت نصیب ہو
یارب! نبیؐ کی حُب و اطاعت نصیب ہو

تیرے کرم سے ربِّ محمدؐ ہے کیا بعید
جنت کی، زندگی میں بشارت نصیب ہو

دن تیرے دھیان میں ترے اذکار میں کٹے
دیکھوں جو خواب، تری زیارت نصیب ہو

آنکھوں میں پھیل جائے نمی اُن کے نام سے
سنگِ سیاہ دل کو وہ رقت نصیب ہو

دیکھوں جو آپ کو تو فزوں تر ہو ذوقِ نعت
جنت میں بھی حضورؐ کی مدحت نصیب ہو

پوری ہو جو بھی اُن کے وسیلے سے ہو دعا
جو ہو نصیب اُن کی بدولت نصیب ہو

ہے یہ دعا ریاضؔ مدینے میں موت آئے
اور جنت البقیع میں تُربت نصیب ہو

غزل

میں چل رہا ہوں مگر کس طرف نہیں معلوم!
مجھے خود اپنے سفر کا ہدف نہیں معلوم!

بلا رہی ہے ہمیں خواب کے جزیروں سے
یہ کس طرح کی ہے آواز دف نہیں معلوم!

کس انتشار کے جنگل میں بھٹکی نسل ہیں ہم!
ہمیں ہمارا مقام اور صف نہیں معلوم!

وہ معرکہ تھا حقیقت کا یہ کہ خواب کی جنگ
کہاں پہ عمر ہوئی ہے تلف نہیں معلوم!

بس ان کے سینوں میں اک چیز دل کے نام کی تھی
ہمیں کچھ اور نشانِ سلف نہیں معلوم

ہیں سر بلند ریاضؔ اعتبارِ رفتہ سے
ہیں اپنی جیب میں دُر یا خزف نہیں معلوم!

ساغر صدیقی

(۱۹۲۸.....۱۹۷۴)

نام محمد اختر تخلص ساغر ہے۔ ۱۹۲۸ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے قریہ میں جناب حبیب الرحمٰن سے حاصل کی۔ شروع میں طبیعت اخبار نویسی کی طرف مائل تھی۔ اپنے اُستادِ محترم کے ساتھ امرتسر آ گئے۔ ۱۹۴۴ء میں جامعہ السنہ شرقیہ ہال بازار امرتسر کے طرحی مشاعروں میں حصہ لینا شروع کیا۔ عرشؔ امرتسری، محسنؔ مینائی، فرخؔ امرتسری نے کلام کو سراہا۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے شعراء حضرات سے آپ کے مراسم رہے۔ اُن میں امینؔ گیلانی، نفیسؔ خلیلی، احمد راہیؔ، ظہیرؔ کاشمیری کے نام نمایاں ہیں۔

۱۹۴۷ء میں لاہور آ گئے۔ انارکلی میں ڈاکٹر حبیب الرحمٰن برقؔ کا گھر آماج گاہ رہا۔ "چادر صحرا" اور "شب آگہی"، مجموعۂ کلام کی صورت میں چھپ کر عوام و خواص سے دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

ساغرؔ صدیقی آخری ایام میں مکمل طور پر نعت گوئی کی طرف مائل ہو گئے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ انہوں نے اپنے آپ کو نعتِ رسولِ اکرم (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم) کے لیے وقف کر دیا ہے۔ نعتیں ایسے پُرکیف انداز سے سناتے کہ سامعین سحر زدہ ہو جاتے اور اُن کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔ فدائی رسالت مآب (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم) نے ۲۰ رجولائی ۱۹۷۴ء کو دارِ فانی سے دارِ بقاء کی طرف کوچ کیا۔ "سبز گنبد" آپ کا نعتیہ مجموعہ ہے جو خاص و عام میں یکساں مقبول رہے گا۔

◆◆◆

نعت

لبوں پہ جس کے محمدؐ کا نام رہتا ہے
وہ راہِ خلد پہ محوِ خرام رہتا ہے

جو سر جھکائے محمدؐ کے آستانے پہ
زمانہ اُس کا ہمیشہ غلام رہتا ہے

ہمیں نہ چھیڑ کہ وارفتگانِ بطحا ہیں
ہمیں تو شوقِ مدینہ مدام رہتا ہے

جو غمگسار ہے، نادار اور غریبوں کا
وہ قدسیوں میں بھی عالی مقام رہتا ہے

ہمیں ضرورتِ آبِ بقا نہیں ساغر
ہمارے سامنے کوثر کا جام رہتا ہے

غزل

چمن میں غنچے کھلے ہوئے ہیں مگر نگارِ چمن نہیں ہے
نگاہ میں وسعتیں نہیں ہیں خیال میں بانکپن نہیں ہے

کبھی خرد کے جہاں سے گزرے کبھی جنوں کا نگر بسایا
ہیں بے نیازِ قیام و راحت' ہمارا کوئی وطن نہیں ہے

تمہاری کاکل کا نام لے کر بہار پھولوں کو ڈس رہی ہے
غرورِ شبنم تو پھر اڑا ہے' وقارِ سرو و سمن نہیں ہے

یہاں جو بڑھ کر اٹھائے مینا' اُسی کا ساغر اُسی کا مینا
ہیں اپنے اپنے نصیب ساقی کسی کا کوئی تجن نہیں ہے

سجاد مرزا

مرزا عبدالحمید بیگ، ہوشیار پور (بھارت) میں عبدالکریم بیگ کے گھر میں ۸ر فروری ۱۹۴۴ء کو پیدا ہوئے۔ پنجاب یونی ورسٹی سے اُردو میں ایم اے کیا، اور درس و تدریس کے پیشے کو اپنایا۔ اُنھیں "سجاد مرزا" کے نام سے ادبی حلقوں اور مشاعروں میں پکارا جاتا ہے۔

سجاد مرزا نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی، نظم، غزل اور نعت، تمام ہی اصناف میں اُن کا قلم رواں دواں رہا، اور کثرتِ قلم کاری نے اُنھیں کئی کتابوں کا مصنف و مؤلف بنا دیا جس میں "وحشتِ تنہائی"، "کیفِ دوام" کے علاوہ پنجابی ادب کی کتاب "اکھرا ہتھ زنجیراں" بھی مخصوص حلقوں میں پذیرائی حاصل کر چکی ہے۔ سجاد مرزا کے دو نعتیہ مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں ان میں پہلا "کیفِ دوام" اور دوسرا "چراغِ آرزو" کے نام سے شائع ہوا تھا۔

سجاد مرزا کی نعتیہ شاعری کو ہوا کا تازہ جھونکا قرار دیا جا سکتا ہے، ایسا جھونکا جو حبس اور گھٹن کے ماحول میں فکر کا وہ چراغ روشن کرتا ہے جس سے ماحول میں خوش گوار تبدیلی کا احساس ہوتا ہے۔

بوجھل تلمیحات یا تشبیہات اور غیر ضروری استعاروں سے سجاد مرزا نے اجتناب برتا ہے، جس کے باعث خیالات میں روانی اور پڑھنے والے کے لیے آسانی پیدا ہو گئی ہے، اُن کے جدید انداز میں لکھے گئے نعتیہ کلام کی پذیرائی و حوصلہ افزائی ہوتی رہی ہے۔

نعت

اے حبیبِ خدا خاتم الانبیا! ذکر کرتا ہے ربِّ علا آپؐ کا
جن و انساں ملائکؑ بھی محوِ ثنا میرے آقا ہے یہ مرتبہ آپؐ کا

نور افشاں سبھی راستے ہو گئے سارے اسرا کے اسرار بھی کھل گئے
لوحِ احساس پر جب دکھائی دیا روشنی کا نشاں نقشِ پا آپؐ کا

ایک مدت سے دوری مقدر میں ہے جانے کب مجھ کو اذنِ حضوری ملے
میں خطاکار عاجز ہوں، مسکین ہوں کملی والے ہوں لیکن گدا آپؐ کا

مرکزِ جذبِ دل آپؐ کا آستاں عاصیوں کے لیے جائے امن و اماں
غم زدوں کے لیے آپؐ ہیں مہرباں ہے کھلا بابِ جود و سخا آپؐ کا

بے قراری کو یونہی قرار آئے گا ہر صعوبت کا احساس مٹ جائے گا
ہر اندھیرا مقدر کا چھٹ جائے گا روضہ دیکھوں جو خیرالوریٰ آپؐ کا

تاجدارِ زمین و زمن آپؐ ہیں دونوں عالم پہ سایہ فگن آپؐ ہیں
فرش سے عرش تک روزِ محشر تلک ذکر ہوتا رہے گا سدا آپؐ کا

ارضِ بطحا میں پہنچوں یہ مقدور ہو آبِ زم زم پیوں تشنگی دور ہو
میں ہوں اُمیدوارِ نگاہِ کرم، میں ہوں سرکار مدحت سرا آپؐ کا

غزل

وقت کی تقسیم سے انسان آدھا رہ گیا
ذہن یوں بکھرا کہ ہر امکان آدھا رہ گیا

بھول کر آئے نہیں ساون کے بادل اس طرف
میرے گاؤں کا ہر اک دہقان آدھا رہ گیا

فکر کے سینے میں یہ کیسی دراڑیں آ گئیں
بے سلیقہ جو چلا پیکان آدھا رہ گیا

حضرتِ انسان کی خوش فعلیوں کو دیکھ کر
گھٹتے گھٹتے آج کا شیطان آدھا رہ گیا

رنگ، خوشبو، روشنی کے استعارے کیا ہوئے
اے سخنورا کیوں ترا وجدان آدھا رہ گیا

یوں ہوئی تقسیم بچوں میں وراثت باپ کی
صحن ٹکڑے ہوگیا دالان آدھا رہ گیا

لوگ خوشحالی کے مژدے سن رہے تھے رات دن
کیا ہوا سجاد جو اعلان آدھا رہ گیا

سجادسخن

جب بھی رام پور کا نام لیا جاتا ہے ذہن کے دریچوں میں اردو ادب کے ان مشاہیر کا خیال ابھرتا ہے جو نواب کلبِ علی خان کی علم پروری کی وجہ سے دائرۂ ادب میں جمع ہو گئے تھے، جلال لکھنوی، امیر اللہ تسلیم، امیر مینائی، رام پور کی رضا لائبریری کی تو بات ہی الگ ہے، مولانا عرشی اور غالب اور ان کی تحقیقات خاصے کی چیز ہیں۔

سجاد علی خان 1934ء کو وارث علی کے گھر رام پور میں پیدا ہوئے، ان کے والد ریٹائرڈ فوجی اور سیاسی اعتبار سے خاکسار تحریک کے سرگرم کارکن تھے، علمی و ادبی اور سیاسی ماحول میں بچپن گزارنے والے سجاد علی دس سال کی عمر میں شعری مجالس میں شریک ہونے لگے جو ان کے علم و ادب سے لازوال تعلق کو ظاہر کرتا ہے، جب انسان کی طبیعت میں حرص و ہوس کا دخل نہ ہو تو اللہ تعالیٰ نیکی و بھلائی کا راستہ دکھاتا ہے اور اہل اللہ کی صحبت بھی عطا کر دیتا ہے۔

18 سال کی عمر میں سجاد علی عزیز میاں نیاز بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے دامن سے بندھ گئے۔

ادبی دنیا میں انہیں سجاد سخن کے نام سے جانا جاتا ہے، ان کی شاعری معاشرتی پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے، جو شخص نصف صدی سے شعر و ادب کی دنیا میں موجود ہو پھر ایک قلندرانہ زندگی بسر کرتا رہے، یہ بڑے حوصلے کی بات ہے۔ اختر لکھنوی مرحوم اکثر و بیشتر دولت ہاؤس اورنگی نمبر ۵

میں ہونے والے مشاعروں میں شرکت کی تاکید کرتے تھے، میں اپنی طبیعت کو کبھی راغب نہیں پاتا تھا جبکہ سجاد سخن، اختر لکھنوی راقم جونپوری اور کوئٹہ وغیرہ سے آنے والے مہمان شریک ہوا کرتے تھے۔ آج میں خود سوچ میں پڑ گیا ہوں کہ سجاد سخن کے بارے میں کیا لکھوں ایک شہر میں ہوتے ہوئے انہیں کبھی بھی نہیں دیکھا، تاہم ان کے تحریر کردہ ادبی مضامین گاہے بگاہے پڑھتا رہا ہوں۔

سجاد سخن کی نعتیہ شاعری ہو یا حمدیہ شاعری دونوں ہی میں ایک صوفی باصفا کے تخلیق کردہ مضامین کا تصور ذہن میں اُبھرتا ہے، یہی ان کی شاعری کا روشن پہلو ہے:

ڈاکٹر عاصی کرنالی "اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر" صفحہ ۶۱۲ پر شفیق الدین شارق کے حوالے سے لکھتے ہیں "رسول اکرم کی صفات مبارکہ کے رنگ، آپ کی حیات طیبہ کی روشنی اور آپ کی ذات نفیسہ کی خوشبو انسانی زندگی کے کون سے شعبے میں نہیں پھر ان کی خصوصیات کی بے شمار جہتیں جس زاویے سے دیکھو نمایاں سے نمایاں تر ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یہ رنگ، یہ روشنی اور یہ خوشبو جب شاعری میں نعت کا انداز اختیار کر لیتی ہیں تو قرطاس و قلم کا اعتبار مضبوط ہو جاتا ہے۔"

◆◆◆

نعت

دل پہ انوارِ رسالتؐ کے دریچے کھل گئے
بند کیں آنکھیں تو قسمت کے دریچے کھل گئے

جب گناہوں کی ندامت آنسوؤں میں ڈھل گئی
یوں لگا جیسے کہ رحمت کے دریچے کھل گئے

سرورِ کون و مکاں کی رہنمائی کے طفیل
حرف کی قسمت پہ مدحت کے دریچے کھل گئے

اِک بشر! اور عرشِ اعظم پر خدا کے روبرو
آدمی زادوں پہ عظمت کے دریچے کھل گئے

جب لبِ گویا پہ اُترا اسمِ ختم المرسلینؐ
ذہن و دل پر نور و نکہت کے دریچے کھل گئے

ایسا لگتا ہے ہر اِک نذرانۂ مدحت کے بعد
مجھ پہ طیبہ کی مسافت کے دریچے کھل گئے

میرے آقا پر نزولِ آیۂ قرآں کے ساتھ
خلق پر علم و بصیرت کے دریچے کھل گئے

غزل

قبول موت ہمیں عظمت خودی کے لیے
کرم کی بھیک نہ مانگیں گے زندگی کے لیے

نہ ہو امید تو دوزخ سے کم نہیں دنیا
فریب کتنا ضروری ہے آدمی کے لیے

نصیب والوں کو ملتی ہے دولتِ احساس
نہیں یہ جنس گراں مایہ ہر کسی کے لیے

غم و خوشی پہ بھروسا نہ کر ، یہ ہرجائی
کبھی کسی کے لیے ہیں کبھی کسی کے لیے

بہت سنا چکا افسانہ ہائے عشق سخن
تلاش اور کوئی پہلو سخنوری کے لیے

سراج الدین سراج

مجموعۂ غزلیات ''آئینۂ ہنر''، ''لفظوں کے چراغ'' کے شاعر کا نام سراج الدین ہے، سراج تخلص اختیار کر کے سراج الدین سراج ہو گئے، والد کا نام سید الطاف حسین مرحوم ہے۔

سراج الدین سراج کی پیدائش ۵ر نومبر ۱۹۵۲ء کو کراچی میں ہوئی، بی اے، بی ایڈ پر تعلیم کا سلسلہ موقوف ہوا، زیارتِ حرمین شریفین سے مشرف ہو چکے ہیں، حمد کا مجموعہ ''حمد و ثنا کی گونج'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے اپنی دلی عقیدتوں کے اظہار کے لئے نعتیں کہیں اور خوب کہیں، ''چراغِ مصطفوی'' (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) آپ کا نعتیہ مجموعہ ہے جو آپ کی وارداتِ قلبی کا مظہر ہے، آپ کی کلیات ''صبحِ امکاں'' کے نام سے چھپ چکی ہے۔

''چراغِ مصطفوی'' (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی اشاعت ۲۰۰۶ء میں ہوئی، پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور پروفیسر سحر انصاری نے فلیپ تحریر کئے، کراچی کے مشہور اور تازہ لب و لہجہ کے شاعر جناب فہیم ردولوی مرحوم کے تلمیذ ہیں۔

شاعر و ادیب اپنی کتابوں میں اپنا رابطہ پتا یا ٹیلی فون نمبر لکھیں تو تحقیق کرنے والا ان سے یا ان کے کسی اہلِ تعلق سے ان کے متعلق اپنی ضرورت کی معلومات تو حاصل کر سکے، کتاب منظر عام پر لا کر کتاب کے قاری سے دور ہو جانا سمجھ میں نہیں آتا۔

نعت

یادِ شہِ کونینؐ میں ہر اشک گوہر ہے
سرمایۂ جاں میرے لئے دیدۂ تر ہے

ہیں نقشِ قدم آپؐ کے یا چہرۂ خورشید
طیبہ کی گلی ہے کہ گزرگاہِ سحر ہے

کیا کوئی سمجھ پائے مقامِ شہِ والاؐ
ہے عقل تحیّر میں تو سکتے میں نظر ہے

محبوبِؐ خدا کو ہوئی معراج میسّر
صدیوں کو سمیٹے ہوئے لمحوں کا سفر ہے

آیات سے قرآنِ مبیں کی ہوا ظاہر
جس سمت ہے رُخ اُن کا مشیّت بھی اُدھر ہے

مایوس جہاں سے نہ ہوا کوئی سوالی
دنیا میں فقط سیدِ کونینؐ کا در ہے

کیوں اپنی زباں سے کروں اظہار تمنّا
کیا دل کی تمنّا ہے سراجؔ اُن کو خبر ہے

غزل

ترے فراق کے لمحے گزر ہی جائیں گے
کبھی تو زخم مرے دل کے بھر ہی جائیں گے

ابھی تو جوش میں ہے ذوقِ جادہ پیمائی
کبھی جو ہوش میں آئے تو گھر ہی جائیں گے

تری جدائی کے لمحے عذاب ہیں لیکن
ترے بغیر بھی یہ دن گزر ہی جائیں گے

خیال تھا کہ نہ آتے تمہاری محفل میں
اب آگئے ہیں تو کچھ بات کر ہی جائیں گے

خیالِ خاطرِ احباب جو نہیں رکھتے
وہ ایک روز دلوں سے اتر ہی جائیں گے

عجب مزاج کے حامل ہیں عشق کے مارے
جدھر ہوئے ہیں وہ رسوا ادھر ہی جائیں گے

سراجؔ شوق سا کیا کوئی ترجماں ہوگا
خموش رہ کے بھی ہم بات کر ہی جائیں گے

سرشار صدیقی

(۲۰۱۷ـ۱۹۲۶)

سرشار صدیقی دسمبر ۱۹۲۶ء کو کان پور میں پیدا ہوئے۔ اسی کوچۂ ادب میں اُن کا بچپن گزرا۔ یہ شہر صنعتی ہونے کے ساتھ ساتھ ادبی مرکز بھی ہے۔ جہاں آئے دن بڑے بڑے مشاعرے اور سیاسی جلسے جلوس ہوتے رہتے ہیں۔ اسی شہر میں مردِ آہن مولانا حسرت موہانی کی رہائش تھی۔ تحریکِ آزادیٔ ہند کے حوالے سے کان پور تاریخی اہمیت کا حامل شہر ہے۔

سرشار صدیقی کا شمار ترقی پسند شعراء میں ہوتا ہے۔ ذریعہ معاش اُن کا اشتہار سازی ہے۔ یہ ایک ایسا شعبۂ حیات ہے کہ اس میں بے شمار تجربات و مشاہدات ہوتے رہتے ہیں۔ اُن کے اثرات اُن کے تخلیقی عمل میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے تین سال بعد ترکِ وطن کر کے اسلامی جمہوریہ پاکستان میں وارد ہوئے۔ اُس وقت اُن کی عمر چوبیس سال کے قریب تھی۔ سیکولر ہندوستان کو شعوری طور پر قبول کر چکے تھے۔ مگر جب سرشار صدیقی اپنے روحانی مرکز کی طرف رجوع ہوئے تو اُن میں ایک ایسا انقلاب رونما ہوا جو اَب اپنی اساس کی تلاش میں سرگرمِ عمل ہے اور اسی تلاش کے پس منظر میں موصوف کی کتاب ''اساس'' معرضِ وجود میں آئی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ نعتیہ مجموعہ سرمایۂ ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے۔ جن لوگوں نے سرشار کو پہلے دیکھا ہے وہ اب سرشار سے مل کر حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔ ایسا مدح خوانِ رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم) کہ ہر وقت آنکھیں نم ہیں۔ ہر سانس میں مدینہ بسا ہے اور ہر ذکر سرکارِ دو عالم (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم) کے دربار سے وابستہ ہے۔ شاید روح کی یہی تڑپ آپ کو ہر سال مدینۃ النبی (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم) کی گلیوں میں پہنچا دیتی ہے۔

◆◆◆

نعت

بوسہ دے کر حرم کے زینے کو
قافلہ چل پڑا مدینے کو

اب تو آئے ہیں زیست کے آداب
اب تو جی چاہتا ہے جینے کو

دل ہے گنجینۂ ثنائے رسولؐ
لیے پھرتا ہوں اِس خزینے کو

دُور سے اک جھلک نظر آئی
پھر تو دیکھا کیا مدینے کو

جس میں تھے ساری زندگی کے گناہ
میں ڈبو آیا اُس سفینے کو

اشک تھمتے نہیں ہیں اب، جیسے
ٹھیس لگ جائے آبگینے کو

غزل

مرے وجود کو اس نے عجب کمال دیا
کہ مشتِ خاک تھا افلاک پر اچھال دیا

مکاں کو جھوٹے مکینوں سے پاک کرنا تھا
سو میں نے اس سے ہر امید کو نکال دیا

مری طلب میں تکلف بھی انکسار بھی تھا
وہ نکتہ سنج تھا سب مرے حسب حال دیا

بدل کے رکھ دیے ہجر و وصال کے مفہوم
مجھے تو اس نے بڑی کشمکش میں ڈال دیا

میں اس کی بندہ نوازی کے رمز جانتا ہوں
کہ رزقِ شوق دیا لقمۂ حلال دیا

مرے خدا نے عطا کی مجھے زباں اور پھر
زباں کو مرتبۂ جراتِ سوال دیا

پروفیسر سہیل اختر

سہیل اختر مشرقی پنجاب کے قصبہ سنگرور میں ۱۹۳۱ء میں پیدا ہوئے۔ میٹرک تک تعلیم وہیں حاصل کی۔ ۱۶ رسال کی عمر میں اپنے والدین کے ساتھ سفر ہجرت کرتے ہوئے پاکستان آئے۔ تحریک آزادی کے سارے منظر نامے کو کھلی آنکھوں سے دیکھا اور اب وہ خود اس تاریخ کا حصہ ہیں۔

پروفیسر سہیل اختر نے پنجاب یونیورسٹی سے فارسی اور اردو میں ایم اے کیا۔ ملازمت کے سلسلے میں ۱۹۶۲ء میں بہاولپور آئے اور گورنمنٹ کالج بہاولپور میں شعبہ اردو میں بطور لیکچرار کے اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ وقت گزرتا گیا اور وہ وقت بھی آہی گیا کہ صدر شعبہ اردو اور پرنسپل کے منصب جلیلہ پر فائز رہ کر ۱۹۹۰ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ اب ان کی ساری توانائی علم و ادب کے فروغ کے لیے صرف ہو رہی ہے۔ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کرنے کے بعد نعت کے میدان میں اپنی تازہ فکری کو فروغ دینے میں ہمہ وقت مصروف نظر آتے ہیں۔ ان کا نعتیہ مجموعہ "قوسِ عقیدت" ہے۔ جس میں دینی ادب کے قارئین اور مبصرین ادب ان کے فکروفن کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس مجموعے میں حمد و نعت اور ملی نظمیں موجود ہیں:

نعت

دعا میں آئے گا یونہی اثر آہستہ آہستہ
شجر کو جیسے لگتا ہے ثمر آہستہ آہستہ

نظر آئے گا طیبہ کا نگر آہستہ آہستہ
کٹے گا زندگی بھر کا سفر آہستہ آہستہ

ابھی تو آبلہ پائی مقدر اپنا ٹھہری ہے
کبھی منزل پہ جچے گی نظر آہستہ آہستہ

ازل کی لوح کے اسرار مخفی صورت قرآں
اتر آئے سب اس کے قلب پر آہستہ آہستہ

سہیل اک دن مدینے سے بلاوا آئے گا تجھ کو
عقیدت رنگ لائے گی مگر آہستہ آہستہ

غزل

جب کوئی عالمِ شہود نہ تھا
میں بھی اک خواب تھا وجود نہ تھا

اپنی تخلیق سے ہوا محدود
ورنہ میں جانتا حدود نہ تھا

مجھ میں بھی لو تھی آگ سے پہلے
میرا سرمایہ صرف دود نہ تھا

جانے اس نے مجھے خریدا کیوں
میں زیاں ہی زیاں تھا سود نہ تھا

طرزِ اظہار نے کیا مخصوص
خاص اشعار کا ورود نہ تھا

اک اسیری یہاں تھی شرطِ شناخت
اور میں بندۂ قیود نہ تھا

تجھ سے رنگینیٔ جہاں ہے سہیلؔ
پہلے یہ رنگ ہست و بود نہ تھا

سہیلؔ غازی پوری

نام سہیل احمد خان ہے اور تخلص سہیلؔ، ۱۹۳۴ء میں غازی پور (یو۔پی) بھارت میں پیدا ہوئے۔ بی اے تک آپ کی تعلیم ہے۔ ملازمت پاکستان کسٹم میں تھی۔ آپ کے چار مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پہلا "اجالوں کے دریچے" ۱۹۸۲ء میں۔ دوسرا "موسموں کی گرد" ۱۹۸۵ء میں اور تیسرا "عکسِ جاں" ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔ چوتھا مجموعہ نعتیہ ہے جو "شہرِ علم" کے نام سے ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔

سہیلؔ غازی پوری نفیس، خوش فکر اور خوش نوا شاعر ہیں۔ ان کی نعتوں میں اُن کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں جو حبِ نبی (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم) سے عبارت ہیں۔ سہیلؔ کی نعتیہ شاعری مدینہ منورہ کے ذکر سے بھری ہوئی ہے۔ ایسا لگتا ہے، شہرِ نبی (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم) اُن کے لہو میں رچ بس گیا ہے۔ سہیلؔ کی نعتوں میں ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہر نعت کا مطلع ایسی محبتوں کا حامل ہے کہ قاری اور سامع کی روح میں اُتر جاتا ہے اور وہ بقیہ اشعار جیسے جیسے پڑھتا جاتا ہے سرکار (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم) کی محبت سے اُس کی آنکھیں نم ہوتی چلی جاتی ہیں۔ آپ کراچی کی ادبی محفلوں میں ایک مقبول شاعر ہیں۔

ڈاکٹر عاصی کرنالی "اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر" صفحہ ۵۹۷ پر رقم طراز ہیں کہ حنیف اسعدی اپنے جائزے میں سہیل غازی پوری کے بارے میں لکھتے ہیں "مذہب کی گہری وابستگی نے ان کے حمدیہ اشعار اور نعتیہ شاعری میں حقیقت اور آمد کا رنگ بھر دیا ہے۔ اسی سبب سے ان کے اس قبیل کے کلام میں وہ جذب و اثر پایا جاتا ہے جو صرف اور صرف سچائی کی روشنی سے پھوٹتا ہے اور دل و دماغ کے ساتھ ساتھ روح کو بھی تازگی اور بالیدگی بخشتا ہے۔"

◆◆◆

نعت

محبت ہے تو یوں نعتِ نبیؐ کا حق ادا کیجے
لکھا کیجے، پڑھا کیجے، کہا کیجے، سنا کیجے

انہیںؐ کے نام کی برکت سے تقدیریں بدلتی ہیں
انہیںؐ کا نامِ نامی جاگتے سوتے لیا کیجے

کچھ ایسا لطف آیا آپؐ کی مدحت سرائی میں
کہ دل کہنے لگا پیہم ثنائے مصطفیؐ کیجے

شبِ غم اُن کی فرقت میں چراغِ سوزِ غم بن کر
جلا کیجے، بجھا کیجے، بجھا کیجے، جلا کیجے

محمد مصطفیٰ صلی علیٰ کے آستانے پر
سلیقہ سے، ادب کے ساتھ عرضِ مدعا کیجے

بڑی مشکل سے اُن کے در پہ پہنچے ہیں سہیلؔ آخر
مزا اب ہے کہ اُن پر جان و دل دونوں فدا کیجے

غزل

محفل میں آنسوؤں کی جو قیمت ہے اور ہے
صحرا میں تشنگی کی جو لذت ہے اور ہے

خوش ہے اتار کے عکسِ حسیں مگر
درپردہ آئینے کی جو حالت ہے اور ہے

مانے کوئی نہ مانے مگر دل کو ہے یقیں
پر گفتگو کی جو بھی حقیقت ہے اور ہے

کانٹوں کو اتنی بات سمجھ میں نہ آسکی
پھولوں میں خوشبوؤں کی جو دولت ہے اور ہے

منظر چھپا ہوا بھی نظر آئے گا ضرور
چشمِ وفا جو تجھ میں بصارت ہے اور ہے

لہروں کے اضطراب نے آخر بتا دیا
دریا کے فکر و فن میں جو شدت ہے اور ہے

مدت کے بعد راز یہ کھل کر رہا سہیلؔ
دل کے مکاں میں جس کی حکومت ہے اور ہے

سید حنیف اخگر

(۱۹۲۸۔۲۰۰۹)

سید حنیف اخگر ۱۹۲۸ء کو بھارت کے شہر ملیح آباد میں پیدا ہوئے، تقسیم ہند کے بعد پاکستان آئے اور پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کراچی میں بینک کی ملازمت سے کیا، اسی دوران کراچی یونیورسٹی سے ایم بی اے کی تکمیل کے بعد سعودی عرب چلے گئے، کچھ عرصہ بعد امریکہ تشریف لے گئے اور اقوام متحدہ انٹرنیشنل سروسز میں ملازمت اختیار کرلی۔

حنیف اخگر نے شمالی امریکہ میں ایک ادبی ادارہ "حلقہ فن و ادب" کی بنیاد ڈالی، اور امریکہ میں اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا، ان کے مطبوعہ نعتیہ مجموعے کا نام "خلق مجسم" ہے جبکہ "چراغاں" اور "خیاباں" بہاریہ شاعری کے مجموعے ہیں، انہوں نے عالمی اردو کانفرنس نئی دہلی سے "عالمی اردو ایوارڈ" حاصل کیا، نیز انہیں "خواجہ میر درد" ایوارڈ سے بھی نوازا گیا، انہوں نے ایک کتاب "اسٹاک مارکیٹ ان پاکستان" بھی لکھی، تیس برس شمالی امریکہ میں قیام کے دوران دوسو سے زائد مشاعروں کی صدارت فرمائی انہوں نے "حلقہ فن و ادب" کے تحت بے شمار بین الاقوامی ادبی کانفرنسیں اور یادگار مشاعرے منعقد کیے، پاکستان بھارت کا کوئی اہم شاعر یا ادیب ایسا نہیں ہے جو ان کی دعوت پر امریکہ نہ گیا ہو، امریکہ کے تمام ادبی حلقے ان کی ادبی خدمات کے معترف ہیں۔

سید حنیف اخگر کا شمار عہد موجود کے نہایت معتبر شعراء میں ہوتا ہے غزل ان کی ادبی شناخت تھی، انہوں نے اسلاف کی اقدار و روایات کو مشعل راہ بنائے رکھا، ان کی غزل میں جدید آہنگ کے ساتھ صوفیانہ رنگ بھی موجود ہے۔

حمدیہ اور نعتیہ شاعری میں بھی انہوں نے اپنی انفرادیت برقرار رکھی، اساتذہ کرام کی زمینوں میں نعتیں لکھ کر انہوں نے ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے، ان کی نعتوں میں زندگی رواں دواں دکھائی دیتی ہے، وہ مشاعرے میں ترنم کے جادو جگاتے تھے، ۲/ جون ۲۰۰۹ء کو شمالی امریکہ میں ان کا انتقال ہوا وہیں تدفین عمل میں آئی، ان کے پس ماندگان میں گیارہ بچے اور ایک بیوہ ہیں۔

نعت

میں مدینے کو چلا ہوں ساری دنیا چھوڑ کر
اب اندھیروں میں نہ لوٹوں گا اجالا چھوڑ کر

آنکھ سے دامن پہ جو آئے بنام مصطفیٰؐ
قطرہ وہ دریا کو شرماتا ہے دریا چھوڑ کر

مرحبا صد مرحبا! اے اُمہات المومنینؓ
عشرتِ عقبیٰ چُنی آرامِ دنیا چھوڑ کر

راستہ سیدھا دکھایا ہے محمدؐ نے ہمیں
ہم کہیں جا ہی نہیں سکتے یہ دنیا چھوڑ کر

مال و زر کیا دولت کونین اپناتا نہیں
کوئی مومن آپؐ کا نقشِ کفِ پا چھوڑ کر

وہ شفیع المذنبینؐ ہیں، رحمۃ اللعالمیں
جو زمیں پر آئے ہیں عرشِ معلیٰ چھوڑ کر

ہر نفس اختر معطر ہے نبیؐ کی یاد میں
یاد اُنؐ کی کب گئی دل کو اکیلا چھوڑ کر

غزل

بن کے خوشبو وہ بسا ہے مجھ میں
ہر نفس موجِ صبا ہے مجھ میں

ہے تصور میں کوئی مست خرام
اک قیامت سی بپا ہے مجھ میں

طاقتِ جنبشِ پا ہو کہ نہ ہو
ہمتِ لغزشِ پا ہے مجھ میں

دل میں اک تیر ترازو ہو کر
درد کو تول رہا ہے مجھ میں

کوئی ارمان نہ نکلا اب تک
ایک میلہ سا لگا ہے مجھ میں

حسبِ ہر جبرِ مشیت اختر
وصفِ تسلیم و رضا ہے مجھ میں

سید مظفر احمد ضیاؔ

کراچی میں بے شمار لوگوں کو ادب نواز اور شاعروں کا سرپرست ہونے کا اعزاز حاصل رہا ہے ایسی ہی ایک شخصیت سید مظفر احمد ضیاء کی بھی تھی۔ ضلع میرٹھ کے مقام "الدن" میں ۱۵/ جولائی ۱۹۳۱ء کو الحاج سید ممتاز علی کے گھر میں یہ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم میرٹھ کے مختلف علاقوں میں حاصل کی۔ ۱۹۴۸ء میں پاکستان آ کے بہاول پور کے صادق ایجرٹن کالج سے انٹر کیا، اسلامیہ کالج لاہور سے گریجویشن، پنجاب یونی ورسٹی سے ۱۹۵۳ء میں اسلامک اسٹڈیز میں ماسٹرز کی ڈگری لینے کے بعد اردو ادب میں بھی امتیازی نمبروں سے ایم اے کیا، کراچی آنے کے بعد ضیا نے سندھ مسلم کالج سے وکالت کی ڈگری حاصل کی۔

کلکٹر آف کسٹمز کی حیثیت سے وہ کراچی، لاہور اور کوئٹہ میں تعینات رہے، ان کی خدمات بورڈ آف ریونیو کے لیے بھی حاصل کی جا چکی ہیں۔ سرکاری ذمے داریوں کی بجا آوری کے سلسلے میں انہوں نے ایشیا اور یورپ کے بیشتر ممالک کے دورے بھی کیے۔

سید مظفر احمد ضیا کی شہرت و نیک نامی میں ان کے شعری مزاج اور ادبی و تہذیبی رویے کو بھی دخل رہا ہے۔ انسانوں کے دکھ درد اور رنج و غم کو اس طرح محسوس کرنا اور اس کا اظہار کرنا کہ سننے پڑھنے والا کہے کہ "میں نے یہ جانا کہ بیشک یہ بھی میرے دل میں ہے" خاص وصف ہے جو قدرت سے ہی ملتا ہے۔

''کاغذی پیرہن'' سید مظفر احمد ضیاء کا پہلا شعری مجموعہ کراچی سے شائع ہوا تھا اس کے بعد '' اسلامی تصوف، اہل مغرب کی نظر میں'' ان کی تالیف منظر عام پر آئی، ''روشنی کا سفر'' دوسرا شعری مجموعہ شائع ہوا، جس میں حمدیہ و نعتیہ اور منقبتی کلام شامل ہے۔

سید مظفر احمد ضیا نے محکمہ کسٹمز کی جانب سے سالانہ مشاعروں کی روایت ڈالی اور تاحیات اس سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے بہت سے نادار و مستحق شعراء کے لیے یافت کی سبیل پیدا کی وہ اہل قلم کی دامے، درمے، قدمے سخنے اعانت خاموشی سے کیا کرتے تھے۔ نئے ہزاریے کے پہلے برس کے آخری دنوں میں سید مظفر احمد ضیاء نے وفات پائی۔

نعت

آ گیا دہر میں جینے کا قرینہ مجھ کو
میرے مولا نے دکھایا ہے مدینہ مجھ کو

کسی طوفان کا ڈر تھا نہ بھنور کا ہی خیال
لے چلا جانبِ طیبہ جو سفینہ مجھ کو

چشمِ حیراں کہ تھی محرومِ تماشا کب سے
آپؐ کے در سے ملا دیدۂ بینا مجھ کو

جب تلک روضۂ اقدس کی زیارت نہ ہوئی
زیست بے کیف تھی دشوار تھا جینا مجھ کو

آپؐ کے در پہ تہی دست ہی آیا تھا یہاں
مل گیا رحمتِ باری کا خزینہ مجھ کو

اس لئے تر ہے مرا خامۂ مژگاں کہ ضیا
آ سکے نعت نگاری کا قرینہ مجھ کو

غزل

یاد آتے ہیں بار بار ہمیں
کر گئے ہیں جو بے قرار ہمیں

ہم خزاں کی نہ آرزو کرتے
راس آتی اگر بہار ہمیں

ایک ہلکی جھلک مسرت کی
کر گئی غم سے ہمکنار ہمیں

کھو گئے ہیں نشان منزل کے
تو نے بھٹکا دیا عیار ہمیں

اے ضیا ان کی مہربانی ہے
ہو گیا ہے غموں سے پیار ہمیں

سید نظر حسین نظر زیدی

سید نظر حسین نظر زیدی کے آباؤ اجداد کا تعلق بجنور سے رہا ہے۔ اُن کا سال پیدائش ۱۹۱۷ء ہے۔ ابتدائی تعلیم بجنور سے حاصل کی، اس کے بعد ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ شاعری میں انہیں "تاجور نجیب آبادی" کا شاگرد ہونے پر ناز رہا۔

نظر زیدی کا شمار بلاشبہ اُن لوگوں میں کیا جاسکتا ہے جو زندہ رہنے اور زندگی گزارنے کے لیے اپنی دنیا آپ پیدا کیا کرتے ہیں۔ ۲۸ برس کی عمر میں یہ لاہور وارد ہوئے اور اسی سال ۱۹۴۵ء میں عملی زندگی کا آغاز ہفت روزہ "پارس" کے نائب مدیر کی ملازمت سے کیا۔ ساتھ ہی مشق سخن بھی جاری رکھی۔ جس پیشے کو انہوں نے اختیار کیا، اسی میں عمرِ عزیز کو کھپا دیا۔ دن، مہینے سال گزرتے چلے گئے اور نظر زیدی نے جوانی سے بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ دیے۔ اُن کو دیکھنے والے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ یہ ایک اہلِ قلم ہیں۔ سادگی اُن کے مزاج کا حصہ ہے۔ فی زمانہ نادر بکما ہے جو شخص تمام عمر پڑھنے لکھنے کا شغل یا پیشہ اپنائے اُس کے اندر علمی رعونت نہ پیدا ہو گئی ہو۔ راقم نے کئی اہلِ قلم کا، ادیبوں، شاعروں کا قریب و دور سے مشاہدہ کیا ہے مگر ایسی سادگی کم دیکھنے میں آئی جیسی نظر زیدی کی شخصیت میں ملی۔ ۹ ناولوں کے ساتھ ہی نظر زیدی نے سیرت و سوانح پر تحقیقی انداز میں جو کتابیں پیش کی ہیں، اُن میں "حاجی امداد اللہ مہاجر مکی" (رحمۃ اللہ علیہ) "پاکستان کے نامور فرزند"، "آسمانِ علم کے درخشندہ ستارے"، "اتاترک" اور "امام ابو حنیفہ" نامی تصانیف شامل ہیں۔ جنہیں پڑھنے کے بعد اُن کے ذوقِ تحقیق کو داد دینی پڑتی ہے۔

نظر زیدی بچوں کے لیے بھی نظم ونثر میں لکھتے رہے ہیں۔ بچوں کے لیے ۱۰ رناول، سیرت و سوانح بچوں کے لیے ۵ رکتب، دیگر نصیحت آمیز کہانیاں وغیرہ، ۶۱ رکتابیں لکھ چکے ہیں۔ شاید یہ وجہ بھی ہو اُن میں بچوں کی سی معصومیت وسادگی برقرار رہ گئی۔ مروّجہ طرز وروش کے مطابق نظر زیدی نے تمام ہی اصناف ہائے ادب پر طبع آزمائی کی۔ اُن کی نظموں کے مجموعوں میں ''نوائے خامہ''، ''ہمارا وطن''، ''پھولوں کی بہار''، ''گلستاں گلستاں'' اور ''دیارِ غزل'' شامل ہیں۔ ''نوائے خامہ'' کوئی باقاعدہ نعتیہ مجموعہ نہیں، تاہم اس میں نعتیں بھی شامل ہیں۔ اُنہوں نے نعتوں کو اظہار عقیدت ومحبت کا وسیلہ بنایا۔ موصوف کے نعتیہ مجموعے کا نام ''نور'' علیٰ نُور'' ہے۔ جس میں محبت و عقیدت کی فراوانی کے ساتھ حسنِ ادب بھی موجود ہے۔ جس سے یہ اندازہ لگایا گیا ہے، کہ اُنہوں نے مقامِ نبوت (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو فکر ونظر میں رکھ کر نعت کہنے کی کوشش کی ہے۔

''پاکستان کے اہلِ قلم'' کے صفحہ نمبر ۴۸۸ پر نظر زیدی کا سنِ پیدائش ہی لکھا ہے جب کہ خود اُن کے تعارف پر مبنی ۱۴ رصفحات میں ۱۹۱۵ء لکھا ہے، اس پر اُن کی تصویر بھی ہے۔ میری نظر میں ۱۹۱۵ء ہی درست ہے۔ ''اوجِ نعت نمبر۲'' کے مطابق ''نوائے خامہ'' ۱۹۶۰ء نظر زیدی کا منتخبہ حمد و مناجات کا مجموعہ لاہور سے طبع ہوا۔ (صفحہ ۳۴۳)

نعت

پھولوں سے سج گیا دل خوشبو میں بس گیا دل
توصیفِ مصطفیٰ میں مصروف جب ہوا دل

یہ رحمتوں کی بارش یہ بے حجاب جلوے
کیا طور کی حقیقت ہے عرشِ کبریا دل

اس دل پہ ناز کیجیے جو ہو ریا سے خالی
ہے دو جہاں سے بڑھ کر قیمت میں بے ریا دل

بے چینیوں سے کہہ دو آئیں نہ پاس میرے
اب نعتِ مصطفیٰ میں مصروف ہے مرا دل

اس راستے کے کانٹے ہیں رشکِ صد گلستاں
زخموں سے چور ہو کر لگتا ہے بے بہا دل

میں کون ہوں کہاں ہوں سدھ بدھ نہیں کچھ اسکی
بطحا کی وادیوں میں ہے کھو گیا مرا دل

زیدیؔ اس آئنے میں دیکھا تھا اُن کا جلوہ
اس دن سے بن گیا ہے جامِ جہاں نما دل

غزل

شگفتِ گل کی طرح، نغمۂ سحر کی طرح
رہو چمن میں بہاروں کے نامہ بر کی طرح

یقیں کرو نہ کرو مستعار ہے یہ حیات
سفر ہے یہ تو گزارو اسے سفر کی طرح

گراں بہا سہی، لیکن حباب کی مانند
تُو برگِ گل پہ ہے شبنم کے اک گہر کی طرح

جو صرف اپنے غموں کا شمار کرتا ہے
وہ آدمی تو ہے اک شاخِ بے ثمر کی طرح

جو اشک دامنِ دل پر تھا گوہرِ نایاب
گرا ہے فرشِ زمیں پر تو ہے شرر کی طرح

وطن سے دور غریب الوطن کو یاد آیا
مرا وطن تو ہے جنت کے بام و در کی طرح

سخن وروں میں ہو تیرا شمار کیا زیدیؔ
ہنر وروں میں رہا ہے تو بے ہنر کی طرح

سیماب اکبر آبادی

(۱۸۸۰ء......1951ء)

علامہ عاشق حسین سیماب اکبر آبادی کی جائے ولادت سرزمین آگرہ ہے۔ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباواجداد اورنگزیب عالمگیر کے عہد حکومت میں بخارا سے عازم سفر ہوئے اور ہندوستان آنے کے بعد مستقل رہائش اکبر آباد میں اختیار کی۔ آپ کے والد محمد حسین صدیقی ولد شیخ نبی بخش صدیقی ملازمت پیشہ تھے۔

سیماب اکبر آبادی نے ابتدائی تعلیم جمال الدین سرحدی، رشید احمد گنگوہی، قمر الدین اور عبد الغفور جیسے اساتذہ سے حاصل کی۔ اصول اور منطق کے علوم کی تکمیل کی اور عربی اور فارسی انہی حضرات سے سیکھی۔ شاعری ورثہ میں ملی تھی۔

والد کے انتقال کے بعد ریلوے میں ملازمت اختیار کی۔ اسی زمانے میں حضرت داغ دہلوی سے اکتساب فیض کیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں آپ شاعری کے فنی محاسن و معائب سے آگاہ ہو گئے۔ اور آپ کا کلام قابل اصلاح نہ رہا۔ کانپور کے نظر وارثی کے ہمراہ دیوئی شریف گئے اور حضرت وارث پاک سے وابستہ ہو گئے۔ سیماب اکبر آبادی قادر الکلام اور کہنہ مشق شاعر اور صاحب طرز ادیب تھے۔ آپ کا شمار اپنے وقت کے اساتذہ میں ہوتا تھا۔

جنگ طرابلس کے ایام میں خواجہ الطاف حسین حالی، علامہ اقبال، مولانا شبلی، مولانا ظفر علی خان کی اتباع میں قومی موضوعات پر نظمیں کہیں۔ اور علامہ اقبال کی مشہور زمانہ نظم "شکوہ" کے انداز میں "استغاثہ" کے عنوان سے ایک پُر تاثیر اور پُر جوش نظم کہی۔ جس کی علمی حلقوں میں پذیرائی

ہوئی۔

سیماب اکبر آبادی چالیس سال تک مسلسل لکھتے رہے۔قومی اخلاقی اور اصلاحی نظمیں اور غزلیں برصغیر کے ممتاز جرائد وصحائف میں تواتر کے ساتھ شائع ہوتی رہیں۔انہوں نے آگرہ میں"قصرِ ادب" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تاکہ تصنیفی اور تالیفی کام کو جاری رکھا جائے۔قصرِ ادب نے نوجوانوں کی بھرپور رہنمائی کی۔کثیر تعداد میں ایسے لوگ تیار ہو کر نکلے جو زبان وادب کی خدمت میں پیش پیش رہے۔

۱۹۳۶ء میں سیماب اکبر آبادی وارد لاہور ہوئے۔بارود خانے میں اپنا دفتر قائم کیا اور ماہنامہ"پیمانہ" آگرے سے لاہور لے آئے۔لیکن جب یہاں کی فضاراس نہ آئی تو واپس آگرہ چلے گئے۔۱۹۳۰ء میں آگرہ سے"شاعر" نامی ماہنامے کا اجراء کیا۔جو اصلاحِ زبان اور شعروادب کا معیاری رسالہ تھا۔یہ رسالہ اب بھی بمبئی سے شائع ہو رہا ہے۔علامہ سیماب مختلف ادوار میں بہت سارے ماہناموں اور ہفت روزہ کے ایڈیٹر رہے۔تقریباً تین سو چھوٹی بڑی کتابیں لکھیں۔جن میں"نیستان" "کارِ امروز" "کلیم عجم" "سازو آہنگ" "سدرۃ المنتہیٰ" "عالم آشوب" "سیرت النبی" اور"سازِ حجاز" اہم ہیں۔"وحی منظوم" آپ کا بہت بڑا علمی کارنامہ ہے۔ایسے نایاب زمانہ لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔آپ ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جاملے۔"سازِ حجاز" رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عقیدت ومحبت کا بہترین اظہار ہے۔مزارِ قائدِ اعظم کے اطراف میں ایک پہاڑی ٹیلے پر آپ کا مزار ہے جہاں قائدِ اعظم اکیڈمی کی عمارت تعمیر کی گئی ہے۔

پروفیسر سید یونس شاہ"تذکرہ نعت گویانِ اردو"(جلد دوم صفحہ ۳۲۰) پر لکھتے ہیں کہ:

""آپ نے غزلوں کے علاوہ منظومات جدیدہ میں بھی نام پیدا کیا۔ان میں برصغیر کے جملہ مسائل پر اظہار خیال کیا ہے۔ایک جگہ اپنی شاعری کے نظریے کے بارے میں رقم طراز ہیں:

""اوائل مشقِ سخن تک مجھے قدیم تغزل سے رغبت تھی۔لیکن وقت اور زمانے کے ساتھ ساتھ رنگِ قدیم سے لگاؤ کم ہوتا گیا۔اب شاعری میں بلند خیالات اور بلند انسانی جذبات کی ترجمانی میں اس شاعری کا منکر ہوں۔جس کا موضوع صرف عورت اور اس کے متعلقات ہوں۔میں شاعری

میں فلسفہ اور حقائق و معارف کے نکات پسند کرتا ہوں۔ میری شاعری کا موضوع حسنِ محض اور عشق محض ہے''۔

پروفیسر سید یونس شاہ رقم طراز ہیں کہ:

سیماب کے ان شاعرانہ معتقدات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادب و شعر کی تاریخ سے واقف تھے۔ اور انہیں عصری تقاضوں کا بھی احساس تھا۔ انہیں تصوف سے لگاؤ بھی تھا اور یہ کچھ حاجی سید وارث علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ ان کے ہاتھ پر بیعت بھی کر چکے تھے۔ چنانچہ روحانیت اور سوچ و بچار کے مضامین اسی نسبت کا نتیجہ ہیں۔ اس کے علاوہ جناب وارثی کو حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اور اہلِ بیت سے جیسی محبت تھی وہ وراثی خاندان کے قلم کاروں کی کاوش سے ظاہر ہے۔ نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں اس خاندان نے اور ان کے مریدوں نے جو حصہ لیا ہے وہ اُردو ادب میں بھی قابلِ قدر اضافے کی حیثیت رکھتا ہے''۔

ڈاکٹر عاصی کرنالی ''اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر'' صفحہ ۳۸۷ پر لکھتے ہیں:

''سیماب کے شعری مجموعے ''ساز حجاز'' کے آغاز میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا بصیرت افروز مقدمہ ہے۔ اس سے چند نکات قلمبند کیے جاتے ہیں:

''ان کی نعتیہ شاعری مولانا حالی، مولانا ظفر علی خان اور علامہ اقبال کی نعتیہ شاعری سے مماثل اور نعت گو شعرا کی عام ڈگر سے بہت مختلف ہے۔ سیماب نے نعت کے سلسلے میں صرف حضور اکرم ﷺ کے زلف و لب و رخسار یا عام صفات و معجزات ہی کو سب کچھ نہیں جانا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر آنحضرت ﷺ کے اصل پیغام کی غایت، اثرات اور کردار کی خصوصیات، سیرت اور سیرت کے سماجی اور معاشرتی موثرات اور انسان کی تمدنی زندگی میں ان کے افادات کو پیش نظر رکھا ہے چنانچہ سیماب کی نعتیہ شاعری کا رشتہ اپنے عہد کی قومی و ملی زندگی سے اسی طرح استوار ہے جس طرح ان کی عام غزلوں اور نظموں کا......''

نعت

مجھ سے پوچھو ماجرائے رحمۃ للعلمینؐ
میں ازل سے ہوں گدائے رحمۃ للعلمینؐ

کفر کی تاریکیاں بھی جگمگا اٹھیں تمام
اس طرح پھیلی ضیائے رحمۃ للعلمینؐ

اس جہاں کا حال کیا ہوتا اگر ختمی مآبؐ
اور کچھ ہوتے بجائے رحمۃ للعلمینؐ

سایۂ اغیار میں کیوں جاؤں صبحِ حشر میں
مجھ کو کافی ہے لوائے رحمۃ للعلمینؐ

بندۂ عاصی ترا سیماب ہے کب سے مریض
رحم کر یارب! برائے رحمۃ للعلمینؐ

(نعت کے یہ اشعار علامہ سیماب اکبرآبادی نے وصال سے ایک روز قبل بسترِ مرگ پر کہے تھے۔)

غزل

رہ و رسم آشنا ہوں' سعی میری رائیگاں کیوں ہو
جو منزل سے بھٹک جائے وہ میرا کارواں کیوں ہو

ملو تو ہر جگہ یعنی تعین کی حدیں توڑو
نہیں ہے جب مکاں کی قید' قیدِ لامکاں کیوں ہو

جبیں ہم جس جگہ رکھ دیں گے اک کعبہ بنالیں گے
سلامت ذوقِ سجدہ آپ ہی کا آستاں کیوں ہو

جھکا دے سر اسی پر سامنے آجائے جو ذرہ
کہ جب سجدہ ہی کرنا ہے تو قیدِ آستاں کیوں ہو

شہیدانِ بہار اپنا تصرف گر نہ فرمائیں
تو پھر رنگین اے سیماب صحنِ گلستاں کیوں ہو

شاعر علی شاعرؔ

(۱۹۶۶ء)

شاعر علی شاعرؔ نے ۲۰ جون ۱۹۶۶ء کو ولیوں کے شہر (مدینۃ الاولیاء) ملتان شریف میں فیاض دہلوی کے گھر جنم لیا۔ شاعر علی شاعرؔ کا پیدائشی نام شاعر علی رکھا گیا۔ شاعرؔ نے دوران تعلیم شعر گوئی کا آغاز کیا تو انھوں نے اپنے اُردو کے اُستاد جناب مہرؔ سعید ملتانی کی مشاورت سے میر تقی میرؔ، انشاء اللہ خان انشاؔ اور مومن خان مومنؔ کی طرح اپنا قلمی نام شاعر علی شاعرؔ اپنا لیا۔

شاعر علی شاعرؔ کا تعلیمی ریکارڈ مندرجہ ذیل ہے:

☆ ''پرائمری تعلیم'' ۱۹۷۷ء۔ ملتان شہر...... ☆ ''میٹرک'' ۱۹۸۵ء۔ ملتان شہر...... ☆ ''انٹر'' ۱۹۸۷ء۔ کراچی

☆ ''بی۔اے'' ۱۹۹۰ء۔ کراچی یونیورسٹی...... ☆ ''ایم۔اے'' (اُردو) ۱۹۹۲ء۔ کراچی یونیورسٹی

☆ ''بی۔ایڈ'' (ریگولر) ۱۹۹۳ء۔ کراچی...... ☆ ''ایم۔ایڈ'' (ریگولر) ۱۹۹۵ء۔ کراچی

☆ ''ایم۔اے'' (اسلامیات)۔ کراچی یونیورسٹی

وفاقی گورنمنٹ اُردو آرٹس کالج میں پروفیسر ن م دانش کی مشاورت سے باقاعدہ شعر گوئی کا آغاز کیا، حلقۂ دانش اور مجلسِ احباب ملت، کراچی کے طرحی اور غیر طرحی مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔ وہ غزل، نظم، حمد، نعت، منقبت، سلام کے ساتھ ساتھ بچوں کا ادب بھی تخلیق کرتے رہے۔ ان تمام نگارشات پر انھیں مختلف دورانیوں میں مختلف ادبی تنظیموں کی طرف سے 8 ایوارڈوں سے نوازا گیا جن کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

☆ (۱) حلقۂ دانش، کراچی...... حسنِ کارکردگی ایوارڈ ☆ (۲) قومی تعلیمی تحریک، کراچی۔ اعزازی شیلڈ

☆ (۳) بزم جہان حمد، کراچی...... بیادِ صبا اکبر آبادی ایوارڈ ☆ (۴) بزم شمیم اَدب، کراچی...... اعزازی شیلڈ ☆ (۵) ماہنامہ ساتھی، کراچی...... بچوں کے بہترین شاعر کا ایوارڈ (۲۰۰۳ء)

☆(۶)(۲۰۰۶ء)، ☆(۷)(۲۰۰۷ء)،

☆(۸) انجمن عندلیبانِ ریاضِ رسولؐ پہلا طرحی نعتیہ مشاعرہ (یادگاری شیلڈ) ۲۰۱۴ء شامل ہیں۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد شاعر علی شاعر نے تصنیف و تالیف کی طرف رخ کیا تو بے شمار کارہائے نمایاں سرانجام دے ڈالے۔

فکشن کی کتابیں

☆گہرا زخم (اشاعتِ اول)......رومانی ناول......۲۰۰۹ء ☆چہرہ چہرہ کہانی......افسانے......۲۰۱۰ء ☆پانچ ناولٹ......ناولٹ......۲۰۱۰ء ☆لال کبوتر......افسانے......۲۰۱۱ء جدید افسانے (اشاعتِ اول)......۵۶ افسانے...... ۲۰۱۱ء ☆گہرا زخم (اشاعتِ دوم)' جدید افسانے (اشاعتِ دوم)......افسانوی کلیات ۲۰۱۲ء ☆ کلیات (ناول و ناولٹ)......۲۰۱۲ء

بچوں کے ادب کو مندرجہ ذیل کتابیں دی ہیں

☆جنت کی تلاش......ناول......۲۰۰۶ء ☆کاغذ، قلم، کتاب (اشاعتِ اول)......نظمیں......۲۰۱۰ء ☆مہکتی کلیاں ...... گیت، نظمیں......۲۰۱۲ء ☆کھلتے گلاب......ترانے، نظمیں......۲۰۱۲ء ☆انوکھی کہانیاں ...... کہانیاں ...... ۲۰۱۲ء ☆دلچسپ کہانیاں......کہانیاں......۲۰۱۲ء ☆دادی اماں کہانی سنائیں...... اصلاحی کہانیاں......۲۰۱۲ء ☆پیارا وطن......ملی نغمے......۲۰۱۲ء ☆بچوں کی کہانیاں......۲۵ کہانیاں ......۲۰۱۲ء ☆کاغذ، قلم، کتاب (اشاعتِ دوم)......کلیات......۲۰۱۲ء

نصابی/تعلیمی کتابیں لکھی ہیں ان میں:

☆معلوماتِ علامہ اقبالؒ......سوالاً جواباً......۲۰۰۸ء؛ ☆معلوماتِ عامہ......سوالاً جواباً (مختلف موضوعات پر 10 کتابیں)......۲۰۱۰ء ☆معلومات ہی معلومات......سوالاً جواباً (مختلف موضوعات پر جامع کتاب) ...... ۲۰۱۱ء ☆باغبانِ اردو......اردو لازمی چھٹی جماعت کے لیے......۲۰۱۳ء؛ ☆باغبانِ اردو......اردو لازمی ساتویں جماعت کے لیے......۲۰۱۳ء ☆باغبانِ اردو......اردو لازمی آٹھویں جماعت کے لیے......زیرِ تصنیف ہیں۔

حمد و نعت کے مجموعہ ہائے کلام

☆ارمغانِ حمد ۲۰۰۵ء ☆صاحبِ خیرِ کثیر......نعت......۲۰۰۵ء☆دل ہے یا مدینہ نعت ......۲۰۰۶ء☆انوارِ حرم......نعت......۲۰۰۷ء☆عقیدت......منقبت......۲۰۰۷ء☆الہام کی بارش......نعت......۲۰۰۸ء☆دل کا چمن مدینہ......نعت......۲۰۰۸ء☆ارمغانِ حمد......۲۰۱۲ء☆صاحبِ خیرِ کثیر (اشاعتِ دوم)......نعت......۲۰۱۲ء☆الہام کی بارش (اشاعتِ دوم)......نعت......۲۰۱۲ء☆دل ہے یا مدینہ (اشاعتِ دوم)......نعت......۲۰۱۲ء ☆دل کا چمن مدینہ (اشاعتِ دوم)......نعت......۲۰۱۲ء☆انوارِ حرم (اشاعتِ دوم)...... نعت......۲۰۱۲ء☆عقیدت (اشاعتِ دوم)......منقبت......۲۰۱۲ء☆قادرِ مطلق......حمد...... ۲۰۱۲ء☆قاسمِ دو جہاں......نعت......۲۰۱۲ء اور نور سے نور تک......کلیاتِ حمد و نعت......۲۰۱۲ء میں شامل کر لیا گیا ہے۔ جبکہ مندرجہ ذیل مذہبی کتابیں تحریر کی ہیں:

☆حفاظت النبیؐ......سیرت النبیؐ......۲۰۰۷ء☆محبت کا جائزہ......اصلاحِ معاشرہ......۲۰۰۹ء ☆پہلی نظر سے میلی نظر تک......اصلاحِ معاشرہ......۲۰۰۹ء

شاعر علی شاعر کے سابقہ عہدے:

(۱) فن کدہ اکیڈمی (پاکستان)......اعزازی وائس پرنسپل (۲) روزنامہ دیانت، کراچی......انچارج ادبی صفحہ (۳) مبصر...... ماہ نامہ، دنیائے ادب، کراچی (۴) مبصرِ بیلاگ ......سہ ماہی بیلاگ، کراچی موجودہ عہدے: (۱) بزمِ رنگِ اَدب (پاکستان)......بانی و صدر (۲) کتابی سلسلہ، رنگِ اَدب، کراچی...... مدیر (۳) رنگِ اَدب پبلی کیشنز، کراچی کے مینجنگ ڈائریکٹر کے طور پر ایک پبلشرز کی حیثیت سے رنگِ ادب پبلی کیشنز، میں کتابیں چھاپ رہے ہیں۔ شاعر علی شاعر کی ادارت میں سہ ماہی ادبی رسالہ ''رنگِ ادب'' کے اب تک ۴۲ شمارے شائع ہو چکے ہیں جن میں متعدد خصوصی شمارے بھی شامل ہیں۔ شاعر علی شاعر کی کلیاتِ حمد و نعت ''نور سے نور تک'' سے ایک نعت ملاحظہ کرتے ہیں:

◆◆◆

نعت

سرکار سے اُمیدِ نظر لے کے چلا ہوں
دیکھو تو نیا زادِ سفر لے کے چلا ہوں

اُن کو بھی دکھا دوں دلِ مضطر کی میں حالت
بے تاب ہتھیلی پہ جگر لے کے چلا ہوں

آنکھوں کے کناروں کو چلے توڑ کے آنسو
اُجڑے ہوئے دامن میں گہر لے کے چلا ہوں

اب رحمتِ کونینؐ مجھے اذنِ سفر دیں
اُمید کی آنکھوں میں سحر لے کے چلا ہوں

اُس پیکرِ انوار سے پاتا ہے مجھے فیض
آنکھوں میں کئی شمس و قمر لے کے چلا ہوں

میں صبحِ یقیں ، شامِ یقیں دل میں بسا کر
ہر وہم کی دیوار میں در لے کے چلا ہوں

دیکھوں گا وہاں بارشِ نوری کا تسلسل
شاکرؔ میں ابھی دیدۂ تر لے کے چلا ہوں

غزل

مجھ کو اٹھا کے دوش پہ اکثر لیے پھرا
کیا جنونِ عشق تھا گھر گھر لیے پھرا

لکھا تھا جو نصیب میں اس کے حصول کو
دنیا جہاں میں مجھ کو مقدر لیے پھرا

دنیا کی تیز دھوپ میں سوچو تو دوستو!
میں کس طرح سے موم کا پیکر لیے پھرا

کس کو ہے شوق گردشِ ایام میں پھرے
مجھ کو تو میرے پاؤں کا چکر لیے پھرا

اے یار! دشمنوں کے خیابان تک مجھے
تیری نگاہِ ناز کا منظر لیے پھرا

کوشش کے باوجود ترا گھر نہ آسکا
نامہ کہاں کہاں وہ کبوتر لیے پھرا

اک شخص کی جدائی میں شاعر تمام عمر
آنکھوں میں آنسوؤں کا سمندر لیے پھرا

شاعر لکھنوی

(۱۹۱۷ـ۱۹۸۹)

محمد حسن پاشا 1917ء کو منظور حسین پاشا کے گھر لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ شعر و شاعری کا چسکا ان کو پہلے ہی لگ چکا تھا۔ 1950ء میں کراچی آئے زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے مقدور بھر کوشش کی اور کئی ادوار سے انہیں گزرنا پڑا، تاہم پائے ثبات میں لرزش و لغزش نہیں آنے دی۔

حسن پاشا ایک ایسے شخص کا نام ہے جس نے اپنی دنیا آپ پیدا کی، کراچی کی ادبی دنیا میں اپنی انفرادی شناخت آپ منوائی، اُن کا مجموعہ غزل "زخم ہنر" ادب شناس حلقوں میں پہنچا تو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ حسن پاشا کو ادبی دنیا میں شاعر لکھنوی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

شاعر لکھنوی خوش قسمت انسان تھے اپنے پیچھے علم و ادب سے شغف رکھنے والی اولاد چھوڑ گئے۔ جس نے ان کے دینی ادب سے لگاؤ کو دیکھتے ہوئے نعتیہ مجموعہ "نکہت و نور" کو طباعت کے زیور سے مزین کیا، آج نعتیہ ادب سے تعلق رکھنے والے احباب اس سے اپنی بساط کے مطابق استفادہ کر رہے ہیں۔

شاعر لکھنوی ایک حادثہ کا شکار ہو کر 23 دسمبر 1989ء کو کراچی میں سپردِ خاک ہوئے۔

نعت

عجب ہے کیف عجب ہے خمار آنکھوں میں
بسا ہوا ہے نبیؐ کا دیار آنکھوں میں

جو آئی یادِ مدینہ تو آنسوؤں کی طرح
چھپا لیا ہے اُسے بے قرار آنکھوں میں

کھڑے ہوئے ہیں ترے در پہ سارے دیوانے
وفا کی نذر لئے اشک بار آنکھوں میں

قسم خدا کی مدینہ جنہوں نے دیکھا ہے
میں ڈھونڈ لوں گا وہ آنکھیں ہزار آنکھوں میں

تصورات میں طیبہ کے روبرو شاعر
رچی ہوئی مجسم بہار آنکھوں میں

غزل

اپنی طلب کا نام ڈبونے کیوں جائیں میخانے تک
تشنہ لبی کا اک دریا ہے شیشے سے پیمانے تک

حسن و عشق کا سوز تعلق سمتوں کا پابند نہیں
اکثر تو خود شمع کا شعلہ بڑھ کے گیا پروانے تک

ساقی کو یہ خوش فہمی تھی ہم تک موج نہ آئے گی
پیاس کا جب پیمانہ چھلکا ڈوب گئے میخانے تک

مٹی سے جب پھول کھلائے کار جنوں کی محنت نے
شہر کچھ اس انداز سے پھیلے آپہنچے ویرانے تک

زخم ہنر کا رنگ سلامت سب کو خبر ہو جائے گی
کتنے چہرے ہم نے تراشے ہاتھ قلم ہو جانے تک

اس غربت کی دھوپ میں شاعر اپنوں کا سایہ بھی نہ تھا
جس غربت کی دھوپ میں ہم کو یاد آئے بیگانے تک

سید شاکر القادری چشتی نظامی

"سید ابرار حسین شاکر القادری یکم اگست ۱۹۶۰ء محلہ شاہ آباد (چشت نگر) اٹک شہر (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ لائبریری سائنس میں گریجویشن کیا اور ضلع کونسل اٹک میں کتاب دار کے عہدے پر فائز ہیں۔ ان کا تعلق گیلانی (عزیزی) سادات کے ایک علمی اور روحانی خانوادے سے ہے جو پچھلی صدی کے اوائل میں کوئٹہ (بلوچستان) سے ۱۹۳۵ء کے ہولناک زلزلے کے بعد نقل مکانی کر کے پشاور پہنچا کچھ لوگ وہاں جاگزیں ہو گئے اور کچھ لاہور، انبالہ اور دہلی گیٹ کی طرف نکل گئے۔ ایک شاخ اٹک آ گئی اور شہر کے جنوب میں اقامت گزیں ہو گئی۔ ایک پشت قبل اس خاندان کے گھروں میں بولی جانے والی زبانیں پشتو اور فارسی تھیں جو بطور آوردان ان کے ساتھ آئیں۔ شاکر القادری کے دادا سید محمد رحیم شاہ گریجویٹ تھے اور انبالہ ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہے انہوں نے چار انگریزی جاسوسی ناولوں کا ترجمہ کیا جو دستبرد زمانہ کی نذر ہو گیا تایا سید محمد عبدالرشید پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے ایل او تھے اور طبیہ کالج دہلی سے حکیم حاذق کی سند رکھتے تھے اور والد بزرگوار سید سلیمان شاہ منشی فاضل اور ادیب فاضل تھے خطاطی مصوری نقاشی اور آئینہ سازی کو انہوں نے ذریعہ معاش بنایا ہوا تھا ان کا زیادہ رجحان درویشی اور خلوت گزینی کی جانب تھا کوہستان گندھ گڑھ میں چلہ کشی کے بعد وہ مرشد کے ایما پر ملتان اور وہاں سے فیصل آباد آ گئے جو ان دنوں لائل پور کہلاتا تھا اور زندگی کا خاصا حصہ وہاں تبلیغ و ارشاد میں گزار دیا شاکر نے چشتی

نظامی نسبت کو انہی سے حاصل کیا اور وفات کے بعد ان کے مسند نشین ٹھہرے۔

شاکر نے فنون لطیفہ کا ذوق اپنے والد سے ورثہ میں پایا اور اپنی جدت پسندی سے ان میں نئی روح پھونکی وہ شاعری موسیقی اور خطاطی کے دلدادہ ہیں کتاب دوستی ان کی شخصیت کا نمایاں پہلو ہے نشر و اشاعت کے معاملات میں بھی ذوق سلیم کے مالک ہیں۔ موسیقی کے مزاج شناس بھی ہیں اور سر تال کا اچھا خاصہ گیان رکھتے ہیں۔ کتاب دوستی شاکر کی شخصیت کا دوسرا نمایاں پہلو ہے جو انہیں ضلع کونسل کی لائبریری میں لے گیا۔ جہاں انہوں نے بطور کتاب دار ۳۲ سال خدمات انجام دیں، کمپیوٹر سنبھالا، نشر و اشاعت کو فروغ دیا، کونسل کے مجلہ فیسٹیول کی ادارت کی اور بڑے مفید اور یادگار نمبر نکالے۔

شاکر القادر اردو فارسی میں شعر کہتے ہیں نعت گوئی ان کا نمایاں میدان ہے انہوں نے اپنے شعری سفر کا آغاز امام زین العابدین کے قصیدہ میمیہ کی اردو تضمین سے کیا جس پر مولانا انوار الحق کی داد و تحسین نے مہمیز کا کام کیا اگلے مراحل میں انہوں نے اساتذہ کے کلاموں پر تضامین لکھیں۔ احادیث رسولؐ کے منظوم تراجم کیے الغرض ادب کی مختلف جہتوں میں اپنی تخلیقی تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا حال ہی میں ان کا نعتیہ مجموعہ ''چراغ'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔

نعت اور فروغ نعت کے سلسلے میں ان کی خدمات بھی قابل قدر ہیں ان کی ادبی زندگی کا بیشتر حصہ فروغ نعت کا مقدس فریضہ انجام دیتے گزرا۔ اٹک میں نعت گوئی اور نعت خوانی دونوں کے سلسلے میں ان کی کوششیں قابل قدر ہیں مدنی میلاد پارٹی، بزم چراغ مصطفیؐ، اٹک اور دیگر میلاد پارٹیوں کے پلیٹ فارم پر نوجوانوں کو نعت گوئی اور نعت خوانی کی طرف مائل کرنا ہو یا ضلع کونسل کے سالانہ جشن بہاراں کی تقریبات میں نعتیہ مقابلوں کی طرح ڈالنا انہوں نے ہر جگہ اور ہر مقام پر فروغ نعت کے لیے اپنا بھرپور کردار ادا کیا اور اب فروغ نعت کے نام سے نعتیہ سہ ماہی مجلہ نکال رہے ہیں۔ جس کی مسلسل سترہ اشاعتیں مکمل ہو چکی ہیں فروغ نعت نے اپنی چند اشاعتوں میں ہی متقدر علمی و ادبی حلقوں میں اہم مقام بنالیا فروغ نعت کی ہر اشاعت کو خاص اشاعت قرار دیا جا سکتا ہے نعت گوئی کی تاریخ ہو یا فن نعت پر تنقید و تحقیق کے موضوعات ہوں نئے نعت گو شعرا کو متعارف کرانے کی خدمات ہوں یا نعتیہ تقاریب کی روداد تو یہی فروغ نعت کسی بھی معاملے میں

پیچھے نہیں رہا فروغ نعت کی ہر اشاعت "نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول" کے مصداق دن بہ دن بہتری کی طرف گامزن ہے اور برصغیر پاک و ہند میں یکساں مقبول ہو رہا ہے اسکے علاوہ جہاں جہاں اردو بولنے والے موجود ہیں فروغ نعت کی طلب موجود ہے۔

شاکر القادری کی علمی و ادبی خدمات: جوامع الکلم (۴۰ احادیث مبارکہ کا منظوم اردو ترجمہ) مطبوعہ عکس رخ یار (رباعیات عمر خیام کا منظوم ترجمہ) مطبوعہ اٹک سے سہ ماہی فروغ نعت کا اجرا (مطبوعہ) برق بے تاب ڈاکٹر غلام جیلانی برق کے شعری کلام کی تلاش، تدوین اور ترتیب (مطبوعہ)، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی کتاب "سر الشہادتین" کی فارسی شرح "تحریر الشہادتین" کا اردو ترجمہ (مطبوعہ)، مبادیات اسلام کے نام سے پرائمری کے بچوں کے لیے اسلامی عقائد و معلومات کا نصاب مرتب کیا (مطبوعہ)، چشمہ فیض (سلسلہ چشت کا منظوم شجرہ) مطبوعہ، چراغ (نعتیہ مجموعہ) مطبوعہ، شرف آل رسول (غیر مطبوعہ)، تضمین سلام رضا (سلام رضا پر اولین فارسی تضمین) غیر مطبوعہ، حمد و نعت، سلام، مناقب منظوم تراجم (غیر مطبوعہ) مطالعات نعت (غیر مطبوعہ) مقالات نعت (غیر مطبوعہ)"

نعت

خیالِ نعت کی چوکھٹ پہ سر بہ خم آیا
کمالِ سدرۂ فن تک مرا قلم آیا

کھلے ہیں دشتِ تمنا میں مشک بو نافے
حریمِ جاں میں کوئی آہوئے حرم آیا

چراغ بر سرِ مژگاں جلا لیے میں نے
خوشا سلیقۂ تزئینِ شامِ غم آیا

یہ ذوقِ نعت قلم کو کہاں میسر تھا
صریرِ خامۂ جبریل سے بہم آیا

زمینِ شعر کو زرخیزیاں عطا کرنے
عرب سے ابرِ الٰہ کر سوئے عجم آیا

نہالِ جان سے پھوٹی گداز کی کونپل
مچل کے آنکھ کے صحرا میں ایک یم آیا

پھرا ہوں کاسۂ جاں لے کے در بدر شاکر
زرِ مراد یہیں سے مگر بہم آیا

غزل

اک لطف ناتمام بڑی دیر تک رہا
وہ مجھ سے ہمکلام بڑی دیر تک رہا

میں تشنۂ وصال تھا پیتا چلا گیا
گردش میں آج جام بڑی دیر تک رہا

تا دیر میکدے میں رہی ہے مری نماز
ساقی مرا امام بڑی دیر تک رہا

کل بارگاہ حسن تقدس مآب میں
دل محو احترام بڑی دیر تک رہا

الجھا رہا وہ زلف پریشاں میں دیر تک
آئینہ زیر دام بڑی دیر تک رہا

کل رات اس کا قرب تھا صہبا تھی جام تھا
شاکر یہ اہتمام بڑی دیر تک رہا

شاہد الوری

بھارت کی ریاست الور میں نذیر محمد انصاری مورخہ ۲۶ رومبر ۱۹۲۳ء کو پیدا ہوئے۔ ادبی دنیا میں شاہد الوری کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھے۔ موصوف نے حضرت ارمان اجمیری اور راغب مرادآبادی سے اکتساب فیض کیا۔ ان کے علاوہ بھی کئی اور شعراء سے مشورہ سخن کرتے رہے مثلاً شبنم رومانی، خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی، مولوی عبدالسمیع کانپوری، وقار صدیقی، بیتاب نظیری، مہر پیلی بھیتی اور رفیق عزیز وغیرہ۔ آپ کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ رائٹرز گلڈ کے رکن تھے۔ کئی ادبی اداروں کے نگراں اور سرپرست بھی تھے۔ تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ ''حمد و ثناء'' شاہد الوری کا نعتیہ مجموعۂ کلام ہے۔ موصوف کی رہائش کورنگی، کراچی میں تھی۔

◆◆◆

نعت

غلامِ شہِ دوسرا ہو گئے ہم
حقیقت میں حق آشنا ہو گئے ہم

ملی سرورِ دیںؐ کی حلقہ بگوشی
تو مقبولِ ربِّ علی ہو گئے ہم

یہ احسان ہے آپؐ کا کملی والے
سزاوارِ لطفِ خدا ہو گئے ہم

بنی نوعِ انساں کے اے شاہِ بطحاؐ
طفیل آپؐ کے رہنما ہو گئے ہم

نگاہِ شہِ دیںؐ کا یہ معجزہ ہے
گنہ گار تھے، پارسا ہو گئے ہم

مگر یہ تو تحدیثِ نعمت ہے شاہدؔ
کہے جایئے، کیا سے کیا ہو گئے ہم

غزل

آشیاں بھی ہے، قفس بھی ہے، خوشی بھی غم بھی ہے
زندگی بھی، موت بھی، واضح بھی ہے، مبہم بھی ہے

دو جہاں کا غم ہے دل میں، بیش بھی ہے کم بھی ہے
آشیاں کا غم بھی مجھ کو ہے، چمن کا غم بھی ہے

چشمِ ساقی سے پیا کرتے تھے اب ہیں تشنہ کام
ایک عالم وہ بھی تھا اور ایک یہ عالم بھی ہے

اے چمن والو خبر بھی ہے کچھ اپنے حال کی
باغباں بدظن بھی ہے، بیزار بھی برہم بھی ہے

پوچھتا ہوں آج میں چارہ گرانِ قوم سے
کیا جہاں میں قوم کے ناسور کا مرہم بھی ہے

دوستی کا حق جتانے کو تو سب تیار ہیں
اس ہوس کے دور میں کوئی شریکِ غم بھی ہے

بیچ دو پاٹوں کے شاہد پس رہا ہوں آج کل
گردشِ تقدیر بھی ہے گردشِ عالم بھی ہے

شاکر کنڈان

شاکر کنڈان کے نام سے عالمی سطح پر شہرت پانے والے ادیب و شاعر اور ناقد کا خاندانی نام عطا رسول ہے۔ ۲۰ رجون ۱۹۵۱ء کو کنڈان ضلع سرگودھا میں حاجی محمد حسین کے گھر پیدا ہوئے۔ اسی شہر سے ان کا تعلیمی سلسلہ شروع ہوا، اور تا حال جاری ہے۔ شاید شاکر کنڈان حضور اکرم نور مجسم کی اس حدیث پر عمل کر رہے ہیں کہ ''مہد سے لے کر لحد تک علم حاصل کرو۔'' وہ آج کل ایم فل کے بعد پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں۔ مروّج تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملازمت کے طور پر فوج سے وابستہ ہوگئے۔ سپاہی سے ترقی پا کر لیفٹیننٹ ہوئے اور پھر کیپٹن ہو کر پاکستان آرمی سے سبک دوش ہوئے۔

تعلیم اور ملازمت کے دوران انہوں نے کئی کتابیں لکھیں، جو زیور طباعت سے آراستہ ہو کر نہ صرف منظر عام پر آئیں بلکہ قارئینِ شعر و سخن، ناقدینِ فن و ہنر اور مشاہیرانِ اُردو ادب سے داد و تحسین بھی وصول کر چکی ہیں:

شعری کتابیں:

آشوبِ زیست (۱۹۸۴)' رفاقتوں کی فصلیں (۱۹۸۸)' ہتھیلی پہ سورج (۲۰۰۲) ریاضت (۲۰۱۱)' جلتے صحراؤں میں۔ اردو ماہیا (۲۰۰۱ء)

تحقیقی کتابیں:

اردو ادب اور عساکر پاکستان' جلد اوّل (۱۹۹۷ء)، اردو ادب اور عساکر پاکستان جلد دوم (۱۹۹۷ء) ببرک نامہ' تحقیق و تدوین (۲۰۰۲)، افضل تحسین کی حمد و نعت نگاری۔ تحقیق

و ترتیب (۲۰۰۸)، سرگودھا کا دبستان شاعری (۲۰۱۲) سرگودھا کا دبستان شاعری جلد دوم (۲۰۱۴)

نعتیہ تذکرہ نگاری:

کراچی کے نعت گو شعرا (۱۹۹۹)، اسلام آباد کے نعت گو شعرا (۲۰۰۲)، نعت گویان سرگودھا (۲۰۰۶)، نعت رسول اور سرگودھا کے شعرا (۱۹۹۸) سندھ کے نعت گو شعرا۔ تحقیق (۲۰۰۰) راولپنڈی کے نعت گو شعرا (۲۰۰۱)،

نثری کتابیں:

وجدان کی آنکھ (۲۰۰۴)، عکس سرستان، شخصی مضامین (۲۰۱۳) نغمۂ محمدی سے نکلی ہوئی آب جو مضامین سیرت و نعت (۲۰۱۶) جادہ شوق و محبت، سفر نامہ (۱۹۹۹) بجاں، گلیاں، بجریاں راہواں سفر نامہ پنجابی (۲۰۰۴) وجدان کی دوسری آنکھ (۲۰۰۷) تحسین زبان و ادب (۲۰۱۳)، مقالات نو (۲۰۱۶)

''خلعتِ توقیر'' شاکر کنڈان کی نعتوں کا مجموعہ ہے۔ جس کی نعتوں سے ان کی حضور اکرم نورِ مجسمؐ سے وابستگی، عقیدت اور اس لگاؤ کا اظہار سامنے آتا ہے۔ وہ سچے عاشق رسول ہیں جنھوں نے تعلیمی، معاشی، ادبی، اقتصادی، سماجی اور معاشرتی و گھریلو مصروفیات کے باوجود تعریفِ محبوب ربانی کو اظہار کا وسیلہ بنایا یہاں تک کہ ان کا مجموعہ نعت ترتیب پا گیا۔ اس کے علاوہ ان کا تدوینِ نعت کا کام اپنی جگہ اہمیت و افادیت کا حامل ہے۔ رب العزت سے دعا ہے کہ وہ ان کی عمر، زورِ قلم میں اضافہ فرمائے اور ان کو وسیع وسائل عطا فرمائے تا کہ شاکر کنڈان اسی طرح ادب بلکہ نعتیہ ادب کی خدمات سرانجام دیتے رہیں۔

شاکر کنڈان خوش نصیب انسان ہیں کہ ان کے فکر و فن پہ مختلف زاویہ نگاہ سے اب تک کام جاری ہے۔

''سورج ڈوبا نہیں کرتے'' (شخصیت اور فن) از: سلیمان جاذب

''شاکر کنڈان کی غزل کا فنی و فکری جائزہ'' مقالہ برائے ایم اے اردو نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگو یجز اسلام آباد

''سرگودھا میں سفرنامہ نگاری کی روایت کا تجزیہ'' (جادہ شوق ومحبت) مقالہ برائے ایم اے اردو یونیورسٹی آف سرگودھا ۲۰۰۷ء

''شاکر کنڈان کی شعری خدمات'' مقالہ برائے ایم فل گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین سمن آباد فیصل آباد ۲۰۱۶

''شاکر کنڈان کی تبصرہ نگاری'' مقالہ برائے ایم اے اردو یونیورسٹی آف سرگودھا ۲۰۱۶ء

''شاکر کنڈان بحیثیت تذکرہ نگار۔'' تحقیقی وتنقیدی مطالعہ ایم فل خواتین یونیورسٹی سیالکوٹ

نعت

آرزو جینے کی دی تشنہ لبی نے مجھ کو
حوصلہ بخشا سدا ذکرِ نبیؐ نے مجھ کو

نام پلکوں پہ اتر آیا ہے موتی بن کر
حسن کیا خوب دیا جذبۂ دلی نے مجھ کو

دیکھ کر جب نبیؐ کی ہرے چہرے پہ چمک
"درِ فردوس پہ روکا نہ کسی نے مجھ کو"

گھر کو چھوڑا تو بڑی نعمتیں پائیں میں نے
طیبہ دکھلا دیا اس در بدری نے مجھ کو

چوم کر گنبدِ خضرا کو جو روز آئی ہیں
انھی کرنوں نے سکھائے ہیں قرینے مجھ کو

جب بھی دربارِ رسالت میں طلب ہوتی ہے
لے کے جاتے ہیں خیالوں کے سفینے مجھ کو

جب لگی زیست میں ٹھوکر کوئی شاکر کنڈان
بڑھ کے پھر تھام لیا یادِ نبیؐ نے مجھ کو

غزل

وجودِ صبر کا جب بھی گمان ٹوٹے گا
مجھے خبر ہے کوئی آسمان ٹوٹے گا

ہوا کے زور سے اس سمت رخ اگر موڑا
مکین بچ بھی گئے تو مکان ٹوٹے گا

شجر کے نیچے میں بیٹھا ہوں آلتی مارے
صدا نہ دے مرے صدیوں کا گیان ٹوٹے گا

مرے حضور کچھ ان دیکھی طاقتیں ہیں ابھی
کھلے گی آنکھ تو کیا کیا گمان ٹوٹے گا

بس ایک قطرۂ پیہم مگر بہ عزمِ صمیم
تو دیکھنا کہ غرورِ چٹان ٹوٹے گا

کبھی تو زندگی خود اپنی پرتیں کھولے گی
کبھی تو خوفِ سرِ امتحان ٹوٹے گا

شبنم رومانی

(۱۹۲۸ء......۲۰۰۹ء)

شاہجہاں پور کے مرزا اظہر احمد بیگ چغتائی کے ہاں ۳۰/ دسمبر ۱۹۲۸ء کو پیدا ہونے والے مرزا عظیم احمد بیگ چغتائی کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور بعد ازاں شاہجہاں پور کے ہی ایک ہائی اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ حسن اتفاق سے میٹرک کرنے سے پہلے ہی ہائی اسکول کو انٹر کالج کا درجہ دے دیا گیا، چنانچہ مرزا عظیم نے انٹر بھی یہاں سے کامرس کے مضامین میں کیا، بسلسلہ ملازمت ان کے والد بریلی پہنچے تو انہوں نے بریلی کالج سے کامرس میں بیچلر کی ڈگری لی، قیام پاکستان سے قبل چند ایک عارضی ملازمتیں کیں تاہم ۱۹۵۰ء میں ہجرت کر کے کراچی آگئے اور پاکستان کے سرکاری بینک میں ملازم رکھ لیے گئے۔ حکومت پاکستان کو اپنے مختلف اداروں کے لیے عملے کی ضرورت پڑی تو انہیں بھی وزارت دفاع میں اکاؤنٹنٹ کے طور پر طلب کیا گیا جہاں سے ۱۹۸۹ء میں یہ ریٹائر ہوئے، ہر چند کہ مرزا اظہر کے گھرانے میں کوئی شاعر نہیں تھا مگر مرزا عظیم کو شعر و شاعری کا بچپن سے شوق تھا جس کی تکمیل انہوں نے شبنم رومانی بن کے کرلی۔ مثنوی ''سیر کراچی'' (طنز و مزاح) ان کی طویل نظم ہے جس میں کراچی کے عوام کی صورت حال اور مسائل کو چھوٹی بحر میں نظم کیا گیا۔ ان کا ایک شعری مجموعہ ''جزیرہ'' اور غزلوں کا مجموعہ ''تہمت'' بھی شائع ہوئے۔

شبنم رومانی کراچی سے ایک مجلّہ ''اقدار'' بھی نکالتے رہے، ان کا اپنا اشاعتی ادارہ ہے، ''ارمغان مجنوں گورکھپوری'' کے معاون مدیر رہے، جسے ''افکار'' کے صہبا لکھنوی نے دو جلدوں میں شائع کیا۔ شبنم رومانی نے شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی، ہائیکو مشاعروں میں باقاعدہ شامل کیے گئے اور ساتھ ہی حلقۂ رحمانیہ میں داخل ہو کر تصوف کی راہ اپنالی۔ منقبت، حمد، نعت کو غزل اور نظم پر ترجیح دی اور اپنا نعتیہ مجموعہ بھی چھپوالیا۔ مارچ ۲۰۰۹ء میں وفات تک شبنم رومانی کا مستقل قیام کراچی میں ہی رہا۔

نعت

ورد کرتا ہوں میں صبح و شام آپؐ کا
واقعی اسمِ اعظم ہے نام آپؐ کا

آپؐ احمد بھی ہیں اور محمدؐ بھی ہیں
حمد ہے لازمی جز و نام آپؐ کا

کر گئے بادشاہی غلام آپؐ کے
بادشاہوں کو دیکھا غلام آپؐ کا

آسماں کے صحیفے زمیں کے لئے
آسماں کو زمیں سے پیام آپؐ کا

عدل سے بھی سوا منصفی آپؐ کی
انتہائے کرام ، انتقام آپؐ کا

دفعِ شر ، اور دفاعِ بشر کے لئے
نام کافی ہے خیرالانام آپؐ کا

غزل

تمام عمر کی آوارگی پہ بھاری ہے
وہ ایک شب جو تری یاد میں گزاری ہے

خفا نہ ہو تو ہم دکھلادیں آئینہ تم کو
ہمیں قبول کہ ساری خطا ہماری ہے

سنا رہا ہوں بڑی سادگی سے پیار کے گیت
مگر یہاں تو عبادت بھی کاروباری ہے

مجھے یہ زعم کہ میں حُسن کا مصور ہوں
انہیں یہ ناز کہ تصویر تو ہماری ہے

میں اس کے قرب کا خواہاں تو ہوں مگر جعفر
حیا بھی دل کی نزاکت پہ ضرب کاری ہے

شفیق احمد شفیق

شفیق احمد شفیق ۶ رجولائی ۱۹۴۹ء کو کلکتے میں پیدا ہوئے اور جناب کی تعلیم و تربیت تمام کی تمام سابقہ مشرقی پاکستان میں ہوئی۔ ان میں ادب سے لگاؤ اسکول کے زمانے ہی سے پیدا ہو گیا تھا اور جیسے جیسے وہ اپنے تعلیمی مدارج طے کرتے ہوئے آگے بڑھتے گئے، ان میں جذبۂ تخلیق نمو پاتا رہا اور پھر ایک وقت ایسا آیا جب مشرقی پاکستان کے شعری اور ادبی حلقوں میں ان کا نام نمایاں ہونے لگا۔

شفیق احمد شفیق نظریاتی طور پر ترقی پسند ہیں۔ انھوں نے ہر صنف ادب میں اپنے نظریے کو برتنے کی کوشش کی ہے۔ آپ ان کی تحریروں کا مطالعہ کریں تو یہ محسوس کریں گے کہ ان کے دائرۂ تحریر میں ان کی روشن خیالی یا ترقی پسندی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ "ادراک" کے نام سے ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا جس پر ساہتیہ کار سنشد، بھارت نے "فراق گورکھپوری اعلیٰ ایوارڈ" دیا۔ ایک شعری مجموعہ "پس لفظ آئینہ" ۱۹۹۸ء میں طبع ہوا۔ انتقادی مضامین کا مجموعہ "جدیدیت سے مابعد جدیدیت تک" (فکریات و تناظرات) ۲۰۰۵ء میں منظر عام پر آیا۔ فیض احمد فیض پر ایک کتاب "فیض ایک عہد ساز شخصیت" کے نام سے ۲۰۱۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب پر نیوز میڈیا انٹرنیٹ (News Media Internet) نے "فیض امن انعام" (Faiz Peace Award) سے نوازا ہے۔ نعتوں کا ایک مجموعہ "مدحت خیر الوریٰ" اور تنقیدی مقالوں کا مجموعہ "چند ہمعصر ترقی پسند افسانہ نگار" ۲۰۱۶ء میں شائع ہوئے۔ ایک تصنیف جو اصناف ادب کے حوالے سے شائع ہونے والی کتابوں کے تجزیاتی مطالعات پر مبنی ہے "نقد و تجزیہ" کے نام سے سال رواں (۲۰۱۷ء) میں منصۂ شہود پر آئی۔ جبکہ سوکھا ساون (افسانوی

مجموعہ) اور آئینہ دار (رباعیات) ۲۰۱۷ء میں شائع ہوئیں۔

شفیق احمد شفیق ان دنوں ماہنامہ "Interaction" کراچی میں مستقل عنوان "My Views On Reviews" کے تحت کتابوں پر تبصرے بھی کر رہے ہیں۔

انھوں نے حسب ذیل پانچ کتابوں کی ترتیب و تدوین بھی کی ہے:

(۱) ''فکر و فن کے محرکات'': پروفیسر اظہر قادری کے تنقیدی مقالات کا مجموعہ۔(۲)'' آہنگ نو'': حلقہء آہنگ نو کی نشستوں میں پڑھی جانے والی تخلیقات کا انتخاب۔(۳)'' صبا اکبر آبادی کی غزل نگاری'': صبا اکبر آبادی کی غزل گوئی پر مشاہیر کے لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ، صبا صاحب کی غزلیات کے انتخاب کے ساتھ۔

(۴) عشرت رومانی کی کتاب ''مقصدی شاعری: ایک جائزہ'' پر ایک تنقیدی، تحقیقی اور تجزیاتی کتاب ''مقصدی شاعری: ایک جائزہ کا ناقدانہ تجزیہ'' لکھی۔ (۵) احمد زین الدین (مدیر ''روشنائی'' کراچی) کے فن و شخصیت کے حوالے سے مشاہیر کے لکھے ہوئے مضامین کا مجموعہ مشتاق اعظمی کے اشتراک سے مرتب کیا جو ۲۰۱۳ء میں منظر عام پر آیا۔

ان کی درج ذیل کتابیں منتظر اشاعت ہیں:

شعری مجموعے۔ مجموعۂ نعت ۔ ایک افسانہ ایک تجزیہ۔ تفہیم و تعبیر۔ غیر ممالک میں اردو بستیوں کے قلمکار، ایک افسانہ نگار: تین افسانے ۔ یاد و خراج (اہم شخصیات پر نظمیں)۔ یاد عہد خونچکاں (مشرقی پاکستان کے پس منظر میں نظمیں)، ایک نگاہ منٹو پر (منٹو کی زندگی اور فن پر کتاب)۔ عقیل احمد فضا اعظمی: طویل موضوعاتی نظم کا واحد اور منفرد شاعر، جدید اردو افسانہ: کل اور آج، مشرقی پاکستان:: اردو کا ایک دبستان ۔ چند ہمعصر ترقی پسند شعراء۔ احتساب و اکتساب، چند ہمعصر ترقی پسند نقد نگار۔ انگریزی کی دو کتابیں

۱) Litterateurs:

۲) Myviews on reviews

نعت

چاہت کی بات ہے یہ محبت کی بات ہے
مدح رسول پاک عقیدت کی بات ہے

وہ فتح مکہ اور وہ اعلان عفو عام
اک بے مثال شخص کی عظمت کی بات ہے

جی بھر کے ان کو دیکھیں گے دیدار جو ہوا
اس باب میں فضول قناعت کی بات ہے

ہر پھول ہر شجر میں وہی ایک نور ہے
اس کثرت نمو میں بھی وحدت کی بات ہے

آئینہ ہیں رسول پس آئینہ خدا
یارو یہ لفظ و معنی کی قراءت کی بات ہے

محفل میں کیوں نہ رات کی رانی مہک اٹھے
زلف نبیؐ کی نکہت و رنگت کی بات ہے

نعت شفیق عشق نبیؐ کا ہے آئینہ
ہر شعر میں عقیدت و الفت کی بات ہے

غزل

دونوں ہاتھوں میں مرے لکھی ہیں تحریریں بہت
اور ہر تحریر کی نکلی ہیں تعبیریں بہت

دینا ہے تو بس اسی اک شخص کی تصویر دے
کیا کروں گا اے مصور لے کے تصویریں بہت

میرے اک سر کے لئے کافی ہے اک شمشیر ہی
کیوں میانوں سے نکل آئی ہیں شمشیریں بہت

کچھ عمل کی روشنی بھی کیجیے ہم کو عطا
یوں تو لکھے ہیں مقالے، کی ہیں تقریریں بہت

روشنی کہتے ہیں جس کو آج بھی عنقا ہے وہ
یوں تو مہر و ماہ کی پھیلی ہیں تنویریں بہت

جانے کس کس پر عذابِ جسم و جاں ہونے کو ہے
حکم ہے آہن گراں کو ڈھالیں زنجیریں بہت

بس یہی دو چار ہی رہ جاتی ہیں زندہ شفیقؔ
یوں تو لکھنے کو لکھی جاتی ہیں تحریریں بہت

پروفیسر ڈاکٹر شوکت اللہ خاں جوہر

قصائد کی بات جب آئی ہے تو لگے ہاتھوں پروفیسر شوکت اللہ خاں جوہر کا ذکر بھی ہو جائے جو ۴ نومبر ۱۹۴۵ء میں شاہ جہاں پور برصغیر میں رفیع اللہ خان کے گھرانے میں پیدا ہوئے۔ روہیلہ پٹھان خاندان ۱۹۵۰ء میں قیام پاکستان کے بعد بنوں صوبہ سرحد پہنچا۔ لکی مروت ہائی اسکول سے مڈل پاس کیا پھر ان کے والد میرپور خاص آ گئے جہاں سے میٹرک و بی اے تک تعلیم پانے کے بعد تدریس شروع کر دی اور جامعہ سندھ سے اردو میں ایم اے کر لیا۔ ایجوکیشن کی ڈگری کے حامل پروفیسر جن کو مظہر فصاحت ابو المعانی اور آفتاب سخن کے خطابات دیے گئے۔ اسلامیہ کالج کراچی میں اُردو کے پروفیسر سادہ زندگی، سادہ لباس، دنیاداری اور دنیاداروں سے الگ اپنی دنیا بسائے گلستانِ اُردو کی خدمت میں معروف پروفیسر شوکت اللہ جوہر دنیائے شعر و ادب کے ایک سینئر شہری ہیں۔ اُن کا باقاعدہ نعت کا مجموعہ تو منظرِ عام پر نہیں آیا لیکن صنفِ قصیدہ میں اُنہوں نے اس کی کو پورا کیا ہے۔ ۱۹۹۲ء میں آپ کو ڈاکٹریٹ کی سند جامعہ کراچی سے تفویض کی گئی تھی۔ ڈاکٹر محمد حنیف فوق کی نگرانی میں ۱۹۹۲ء میں جوہر نے تحقیقی مقالہ بہ عنوان ''اُردو شاعری میں ظرافت نگاری'' مکمل کیا تھا جسے ۲۰۱۶ء میں معروف افسانہ نگار ناول نویس اے خیام کے مکتبہ میڈیا گرافکس ناظم آباد کراچی نے اشاعت سے ہمکنار کیا۔ غزلوں کا پہلا مجموعہ ''پرواز ہما'' لاہور سے ۱۹۶۷ء میں طبع ہوا تھا۔ عائشہ باوانی کالج کے پرنسپل کے طور پر ملازمت سے سبک دوشی ہوئی اور لکھنے لکھانے کے لیے فرصتیں میسر آتی گئیں۔ ذاتی کاروبار اور گلشن ادب کا نکھار دونوں میں توازن رکھا ہوا ہے۔ مشاعروں میں پیرانہ سالی کے باوصف شریک ہوتے ہیں۔

''لوحِ عقیدت'' کے عنوان سے پہلا نعتیہ قصیدہ لکھا اور ۱۹۸۲ء میں شائع کروا کے تقسیم کر دیا پھر ''متاعِ خواب'' کے عنوان سے غزلوں کا مجموعہ شائع کروایا۔ ۱۹۹۳ء میں ایک ''طاق دو چراغ'' کے عنوان سے نعتیہ قصائد کی کتاب منظرِ عام پر لائے۔ ازاں بعد غزلوں پر کم توجہ رہی اور نعتیہ قصائد، حمد و نعت و مناقب پر ان کی طبع رواں رہی۔ رنگ ادب پبلی کیشنز کراچی کے مالک شاعر علی شاعر نے ان کی دو کتابیں ''خوشبو کے داغ'' (غزلوں کا مجموعہ) اور ''شہرِ مدحت'' (نعتیہ قصائد کا مجموعہ) شائع کیے ہیں۔ شہرِ مدحت میں دس قصائدِ نعت ہیں ہر قصیدہ ۱۲۳ اشعار پر مبنی ہے۔

◆◆◆

نعت

یوں برستا ہے آج ابرِ کرم
جیسے پھولوں پہ بارشِ شبنم

دامنِ دل ہوا بہت شفاف
دھل گئے جس قدر تھے داغِ الم

عام رنگوں کے ہو گئے جلوے
خوشبوؤں کا ہجوم ہے پیہم

اسی عالم اسی بہاراں میں
ڈھونڈتا ہوں میں اُن کے نقشِ قدم

شخصیت جن کی نازشِ کونین
جن کی آمد ہے عاصیوں کا بھرم

اُن کی مدحت کا سوچتا ہوں میں
حق ادا کیا کرے گا میرا قلم

جتنی بھی میری استطاعت ہے
مدح اُن کی کروں گا میں پیہم

غزل

شیشے کا آدمی ہوں نہ دے اتنا بارِ غم
اک پل میں ٹوٹ جاؤں گا پتھر نہیں ہوں میں

گر تو مری رسائی کے اندر نہیں تو کیا
خود اپنی دسترس سے تو باہر نہیں ہوں میں

جاتا نہیں ہے دل سے سرِ شہرِ آگہی
یہ غم کے اپنے قد کے برابر نہیں ہوں میں

اندر سے ٹوٹتا ہوں کسی کو خبر نہیں
پھر بھی کمال یہ ہے کہ مضطر نہیں ہوں میں

دردِ فراقِ یار گوارا نہیں مجھے
اس بحرِ عاشقی کا شناور نہیں ہوں میں

اے یار دل سے داغِ کدورت نکال دے
دشمن کی آستین کا خنجر نہیں ہوں میں

جوہر مرا قیام تو میرے بدن میں ہے
خانہ بدوش ہو کے بھی بے گھر نہیں ہوں میں

صبا اکبر آبادی

(۱۹۰۸ـ۱۹۹۰)

شعر و ادب کی دنیا میں ۱۴ر اگست کی کوئی اہمیت ہو یا نہ ہو مگر قیام پاکستان اور یوم آزادی کی مناسبت سے ہمارے لیے یہ دن فخر و خوشی کا باعث ضرور ہے۔ خواجہ محمد امیر آگرہ میں ۱۴ر اگست ۱۹۰۸ء کو پیدا ہوئے۔ اُن کے والد کا نام ڈاکٹر خواجہ علی محمد تھا۔ بارہویں واسطے سے اُن کا شجرہ یا سلسلہ نسب حضرت خواجہ بہاء الدین نقش بندی (رحمۃ اللہ علیہ) تک پہنچتا ہے۔

خواجہ محمد امیر کو ادبی دنیا میں صباؔ اکبر آبادی کے نام سے پہچانا گیا۔ یہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے۔ صباؔ تخلص اختیار کرنے سے پہلے ۱۲ر سال کی عمر میں مولانا حسرتؔ موہانی کی صدارت میں جوشؔ ملیح آبادی کی موجودگی میں غیورؔ اکبر آبادی کے نام سے پہلا مشاعرہ پڑھا۔ ۱۹۲۷ء میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے میٹرک کا امتحان امتیازی پوزیشن کے ساتھ پاس کیا۔ ۱۹۳۰ء میں محکمۂ تعلیم میں ملازم ہوئے۔ ۱۹۳۳ء میں والد کے انتقال کے بعد گھریلو ذمے داریاں اُنھیں بنگال لے گئیں۔ ۱۹۳۴ء میں محکمۂ نسواں میں ہیڈ کلرک ہو گئے۔ ۱۹۴۰ء میں ملازمت ترک کر دی اور ذاتی کاروبار کرنے لگے۔ معروف شاعر رعناؔ اکبر آبادی کی صاحب زادی سے شادی کی۔ اُن کے صاحب زادے افسانہ نگار سلطان جمیل نسیم بھی ۱۴ر اگست ۱۹۳۵ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ۱۹۵۸ء میں کاروبار ختم کر دیا اور ۱۹۶۰ء میں محترمہ فاطمہ جناح کے پرائیویٹ سیکریٹری بن کر تین سال یہ فریضہ

نبھاتے رہے۔ آگرہ سے صبا اکبر آبادی نے ماہنامہ ''آزاد'' نکالا تھا۔ ستمبر ۱۹۳۰ء میں ملازمت ملنے پر اُسے بند کر دیا۔ رعنا اکبر آبادی کے ماہنامہ ''مشورہ'' اور ''شبابِ اُردو'' آگرہ، نیز ''انجمن اسلامیہ'' کی ملازمت (۱۹۶۳ء تا ۱۹۷۳ء) کے دوران اِس کے ترجمان ماہنامہ ''انجمن'' کراچی سے بھی بہ طور مدیر وابستہ رہے۔

صبا اکبر آبادی کا پہلا مجموعۂ غزلیات ''اوراقِ گل'' ۱۹۷۰ء میں دوسرا ''چراغِ بہار'' ۱۹۸۳ء میں اور تیسرا مجموعہ پہلی بار ۱۹۸۷ء اور دوسری بار ۱۹۹۱ء میں ''ثبات'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ مراثی کے مجموعے ''خوں ناب'' ۱۹۸۴ء میں ''چھوڑ کر قرطاسِ الم'' ۱۹۹۶ء اور ''سربلند'' مرتبہ تاجدار عادل ابنِ صبا اکبر آبادی ۲۰۰۱ء میں (بعد از مرگ) شائع ہوئے۔ پاکستان آنے سے قبل ۱۹۳۸ء میں ''ذکر و فکر'' (بار دوم کراچی ۲۰۰۰ء) پھر دو مجموعہ ہائے مراثی مزید ''سربکف'' اور ''شہادت'' (مرتبہ مشفق خواجہ) شائع ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد حیدر آباد سندھ میں مقیم ہوئے۔ جہاں اُردو، فارسی، سندھی مشاعرے کروائے۔ پھر کراچی چلے آئے۔ ''رباعیاتِ خیام'' انگریزی ترجمے کے روبہ رو اُردو منظوم ترجمہ ''دستِ زرفشاں'' (۱۹۸۳ء) غالب کی فارسی رباعیات کا ترجمہ ۱۹۸۶ء بھی کیا۔ امیر حمزہ شنواری کی ۳۰ غزلوں کو پشتو سے اُردو میں ڈھالا۔ جب کہ شنواری نے صبا صاحب کی ۵۰ غزلوں کا پشتو میں ترجمہ کیا تھا۔ قومی اور ملی نظموں کا مجموعہ ''زمزمۂ پاکستان'' ۱۹۴۵ء دوسرا حصہ ۱۹۳۶ء اور ۱۹۹۷ء میں پاکستان سے نیا ایڈیشن چھاپا گیا۔

''دستِ دعا'' صبا اکبر آبادی کا حمدیہ نعتیہ کلام ۲۰۰۳ء میں کراچی سے شائع کیا گیا تھا۔ اس مجموعے میں خطابت یا بلند آہنگی جسے مرثیہ پڑھتے وقت بروئے کار لایا جاتا ہے، نمایاں نظر آتی ہے۔ تصوف کے لوازمے اُن کی نعتیہ شاعری میں بھرپور انداز میں جلوہ گر ہیں۔ صبا اکبر آبادی کا انتقال اسلام آباد میں ۳۰ راکتوبر ۱۹۹۰ء کو ہوا۔

◆◆◆

نعت

دیارِ پاکِ رسالت مآبؐ دیکھا ہے
مدینہ دیکھا ہے ہم نے کہ خواب دیکھا ہے

عجیب پھول ملے گلشنِ مدینہ میں
جو رنگ دیکھا ہے وہ لاجواب دیکھا ہے

کہیں بھی بند نہیں بارشِ کرم اُن کی
کسی زمین نے ایسا سحاب دیکھا ہے

ہمیشہ ہم نے سکونِ دل و نظر کے لیے
سوئے مدینہ بصد اضطراب دیکھا ہے

نگاہِ اہلِ زمانہ نے ایک اُمّی کو
جہاں میں صاحبِ اُمّ الکتاب دیکھا ہے

صؔبا مدینے میں ہے جلوۂ رسولؐ خدا
وہاں کے ذرّوں کو بھی آفتاب دیکھا ہے

غزل

جائزہ جو لے ذرا غور سے انساں اپنا
اپنے رخ سے نہ ہٹائے کبھی داماں اپنا

آئینۂ عشق میں ہے دیدۂ حیراں اپنا
آج نہ دیکھ رہی ہے شبِ ہجراں اپنا

منع وحشت نہ کرو سوئے بہاراں دیکھو
پھول سیتے ہیں کہیں چاک گریباں اپنا

ہے کسی اور کا محتاج مداوا یہ بھی
چارہ گر خود نہیں کرتا کوئی درماں اپنا

حیرتِ عشق بتا سامنے کون آیا ہے
کام کیوں بھول گئی جنبشِ مژگاں اپنا

ذات کی بھول بھلیوں میں ہوا ہوں گم راہ
کتنا پر پیچ ہے یہ جادہ عرفاں اپنا

صدیق فتح پوری

محمد صدیق فتح پوری یکم نومبر ۱۹۳۶ء کو سرزمین گوتم بدھ، ضلع گیا، بہار میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیم ابتدائی جماعت تک ہے۔ لیکن خداداد صلاحیت اور ادبی ماحول نے آپ کی فطری صلاحیتوں کو نکھارنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ سقوطِ مشرقی پاکستان کے بعد کراچی آ گئے۔ کراچی میں جمیل عظیم آبادی، قاری حبیب اللہ اور مشہور شاعر و ادیب اقمر ماہ پوری کی معاونت نے ان کی صلاحیتوں کو جلا بخشی۔ ان کی ایک نظم "خواب" کے دو بند دیکھیے

ہمیشہ خواب آنکھیں دیکھتی ہیں
قرارِ جاں دلِ بیتاب آنکھیں دیکھتی ہیں
خزاں دیدہ، گلِ شاداب آنکھیں دیکھتی ہیں
ہمیشہ خواب آنکھیں دیکھتی ہیں

نہ تھکتی ہیں کبھی بیداریوں سے
نہ گھبراتی ہیں یہ بیماریوں سے
نمٹتی رہتی ہیں دشواریوں سے
ہمیشہ خواب آنکھیں دیکھتی ہیں

"اظہار عقیدت" (نعت) ۱۹۸۷ء، لمحوں کی دھوپ: (غزل) ۱۹۹۳ء، سجدہ گاہ دل (نعت) ۱۹۹۷ء، سائے سائے دھوپ (غزل) ۱۹۹۹ء اور صدا کیسی ہے (غزل) ۲۰۰۶ء میں شائع ہوئے۔ اظہارِ عقیدت صدیق فتح پوری کا نذرانۂ عقیدت ہے، موصوف پابندِ صوم و صلوٰۃ، دیانت دار اور خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار ہیں۔ آپ سے ملنے کے بعد دوبارہ ملنے کو جی چاہتا ہے۔ تجارت پیشہ ہیں۔ ایک مسلم تاجر کی خوبیاں آپ کے اندر پائی جاتی ہیں۔ کراچی میں آباد ہیں۔

◆◆◆

نعت

مہرباں مجھ پہ ربِ العلیٰ ہو گیا
ذاتِ اقدسؐ سے جب سلسلہ ہو گیا

زندگی کے سفر میں ہر اک موڑ پر
آپؐ کا نقشِ پا رہنما ہو گیا

مٹ گئیں دہر سے کفر کی ظلمتیں
نورِ احمد جو جلوہ نما ہو گیا

شمعِ وحدت کے آگے وہ نہ جل سکا
سرد فارس کا آتش کدہ ہو گیا

چاند ٹکڑے ہوا، کنکری بول اٹھی
اک اشارے سے کیا معجزہ ہو گیا

بابِ رحمت سے صدیقؓ مانگوں میں کیا
خود ہی وقفِ رسولِ خداؐ ہو گیا

غزل

خار ہیں خس ہیں دھول ہیں ہم لوگ
پھر بھی انمول پھول ہیں ہم لوگ

اس لیے ہیں عتاب میں شاید
ماورائے اصول ہیں ہم لوگ

شجر سایہ دار ہیں لیکن
ان کا کہنا ببول ہیں ہم لوگ

کھلتے ہیں موسم خزاں میں بھی
ایسے الفت کے پھول ہیں ہم لوگ

رسم دنیا کو دیکھ کر صدیقی
انتہائی ملول ہیں ہم لوگ

صوفی غلام مصطفےٰ تبسم

(۱۹۰۰ء۔۱۹۷۸ء)

غلام محمد مصطفیٰ نے بیس ویں صدی کے آغاز (۱۹۰۰ء) میں امرتسر کے ایک کشمیری گھرانے میں جنم لیا تھا۔ ابتدائی تعلیم امرتسر کے ایک ہائی اسکول میں حاصل کرنے کے بعد خالصہ کالج سے انٹر (ایف اے) کا امتحان پاس کیا اور لاہور چلے آئے۔ جہاں ایف سی کالج سے گریجویشن کیا۔ پھر اسلامیہ کالج سے جسے یونی ورسٹی کا درجہ حاصل تھا، ایم اے (فارسی) کرنے کے بعد سینٹرل ٹریننگ کالج لاہور سے منسلک ہوگئے، ان کے شاگردوں میں اپنے زمانے کے اہم شاعر، ادیب، ڈراما نگار اشفاق احمد، ناصر کاظمی وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

مدت ملازمت پوری ہونے پر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے ۱۹۵۵ء میں ایرانی کلچر سینٹر قائم کیا۔ ۱۹۷۰ء میں معروف ہفت روزہ "لیل و نہار" کے ایڈیٹر ہوگئے۔ اس جریدے سے فیض، احمد ندیم قاسمی، سبط حسن، حمید اختر، ابراہیم جلیس وغیرہ کا بھی تعلق رہا ہے۔ حکومت کا عتاب نازل ہونے پر یہ رسالہ بند ہوگیا۔ صوفی صاحب ریڈیو پاکستان کے اسکرپٹ ایڈوائزر مقرر کیے گے۔ اُردو اور فارسی میں شاعری کرنے کے ساتھ ہی بچوں کے لیے ٹوٹ بٹوٹ جیسی دل کش اور بے مثال نظمیں بھی لکھیں، بچوں کے ادب میں اُن کا نام نمایاں حیثیت کا حامل رہا ہے۔

صوفی تبسم اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، اُن کی غزلوں کا مجموعہ بھی "انجمن" کے نام سے مرتب کیا گیا تھا۔ سادہ منش، صوفی تبسم نے کبھی سرکاری مراعات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ ہر ایک سے پیار کرتے اور سب کے دُکھ درد کو محسوس کرتے تھے۔ "انتخابِ کلامِ اقبالؔ" اور "نقشِ اقبالؔ" اُن کے اہم تحقیقی کارنامے ہیں۔

حکومتِ پاکستان نے ۱۹۶۳ء میں اُنھیں صدارتی ایوارڈ برائے حسن کارکردگی سے نوازا جب کہ بھارت جنگ ۱۹۶۵ء میں اُن کے ترانے میریا ڈھول سپاہیا، تینوں رب دیاں رکھاں اور میرا ماہی چھیل چھبیلا ئے، ہائے کرنیل نی جرنیل نی (ملکہ ترنم کی آواز میں) کی پاک بھارت میں بے حد پذیرائی ہوئی۔ ۱۹۶۷ء میں اُن کو "ستارۂ امتیاز دیا گیا جب کہ فارسی زبان و تعلیم کے لیے اُن کی خدمات کو سراہتے ہوئے حکومتِ ایران نے بھی صوفی صاحب کو "نشانِ فضیلت" دیا۔ "سرشکِ تبسم" اگرچہ باقاعدہ نعتیہ مجموعہ نہیں ہے۔ تاہم بہت سے نعتیہ مجموعوں سے بہتر نعتیں اس میں موجود ہیں۔

یکم جولائی ۱۹۷۸ء کو علم و ادب کی شان صوفی تبسم اپنے بے شمار چاہنے والوں کو سوگ وار چھوڑ کر لاہور میں آسودۂ خاک ہوگئے۔

نعت

سمایا ہے نگاہوں میں رُخِ انور پیمبرؐ کا
اُٹھا دو جامِ جم، لے جاؤ آئینہ سکندر کا

وہ جس کے دم قدم سے عظمتِ انسانیت اُبھری
چمک اُٹھا ستارہ نوعِ انساں کے مقدر کا

وہ قدموں کے نشاں میں جسکے تابش کہکشاں کی سی
غبارِ رہ میں تھا جس کے سماں جنت کے منظر کا

یہ حُسنِ خلق، یہ لطفِ نظر، یہ عفو، یہ بخشش
خراماں جس طرح کیفِ رواں تسنیم و کوثر کا

وہ اک آنسو جو اس کی یاد میں آنکھوں سے ٹپکا ہے
وہی آنسو ستارہ ہے مرے حُسنِ مقدر کا

تبسم مجھ سے عاصی کا یہی بس اک سہارا ہے
کہ میں ادنیٰ گدا ہوں سرورِ کونینؐ کے در کا

غزل

سو بار چمن مہکا سو بار بہار آئی
دنیا کی وہی رونق دل کی وہی تنہائی

اک لحظہ بہے آنسو اک لحظہ ہنسی آئی
سیکھے ہیں نئے دل نے انداز شکیبائی

جلووں کے تمنائی جلووں کو ترستے ہیں
تسکین کو روئیں گے جلووں کے تمنائی

دیکھے ہیں بہت ہم نے ہنگامے محبت کے
آغاز بھی رسوائی انجام بھی رسوائی

یہ بزم محبت ہے اس بزم محبت میں
دیوانے بھی شیدائی فرزانے بھی شیدائی

صہبا اختر

(۱۹۳۲ء......۱۹۹۶ء)

فلم ''سمندر'' کے نغمہ نگار، کورنگی لانڈھی سے نکل کر قومی شہرت حاصل کرنے والے اختر علی رحمت ''صہبا اختر'' کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ آپ واحد پاکستانی شاعر ہیں جنہوں نے اہم عالمی واقعات وحادثات اور اہم یادگار شخصیات پر بکثرت نظمیں لکھیں۔ اس سے آپ کے منفرد انداز فکر کی غمازی ہوتی ہے۔ حریت میں ہر ہفتہ نظم اور مشرق میں برسوں قطعات لکھتے رہے۔

صہبا اختر محکمہ خوراک سے وابستہ رہے۔ کئی کتابیں آپ کے قلم سے تحریر میں آئیں۔ ''سر کشیدہ'' آپ کا پہلا مجموعہ کلام ہے طویل نظم مثنوی، داستان اور تمثیل کا مجموعہ ''سمندر'' ہے جسے ادبی حلقوں میں سراہا گیا۔ اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔

صہبا اختر کا نعتیہ مجموعہ ''اقرأ'' منفرد انداز بیان کا حامل ہے۔ جس میں روایتی نعت گوئی کی ڈگر سے ہٹ کر حقیقی اسلوب بیان کو اپنایا گیا ہے۔ ایسے مجموعے نعتیہ شاعری میں کم ہی نظر آتے ہیں۔ ۱۹ر فروری ۱۹۹۶ء کو آپ کا انتقال ہوا اور خاک کراچی میں پنہاں ہو گئے۔

گلشن اقبال ۱۳۔ڈی میں ایک شارع اور ناظم آباد تھانے کے عقب میں بلدیہ کراچی کی صہبا اختر لائبریری کراچی کے شاعر کو خراج عقیدت پیش کرتی رہتی ہے۔

''اردو حمد ونعت پر فارسی شعری روایت کا اثر'' میں ڈاکٹر عاصی کرنالی مرحوم تحریر فرماتے ہیں کہ:

''عہد حاضر کی ایک توانا آواز صہبا اختر ہیں۔ رفعت خیال، شکوہ لفظی اور لہجے کی بلند آہنگی

کے سبب ان کی اپنی پہچان ہے۔ دوسری اصناف شعری میں بھی قدرتِ کلام کا لوہا منوایا۔ ان کی قومی اور ملی منظومات جس میں ملتِ اسلامیہ کے جلال و جمال، فتح و ظفر مندی کی آرزو جھلکتی ہے"۔

دو معاصرین میں سے ایک نے تو یہ لکھا اور ڈاکٹر شہزاد احمد نے "اردو نعت پاکستان میں" اسی شہر کے بلند پایا شاعر کی طرف توجہ مبذول کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ حالانکہ یہ شاعر اسی شہر کراچی کا باسی ہے۔ اگرچہ شہزاد احمد کی کتابیات میں صہبا اختر کا مجموعۂ نعت "اقرا" شاملِ فہرست ہے۔

"ہمارے اہلِ قلم" میں صہبا اختر کی تاریخ ولادت ۳۰ر ستمبر ۱۹۳۲ء، دبستانوں کا دبستان کراچی جلد اول میں ۳۰ر ستمبر ۱۹۳۲ء، حریم نعت، رئیس احمد میں ۳۰ر دسمبر ۱۹۳۲ء جبکہ وفیات نعت گویانِ پاکستان ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ میں ۳۰ر ستمبر ۱۹۳۱ء تحریر ہے۔ جائے پیدائش "جموں" پر سب متفق ہیں۔

نعت

وہ محمدؐ جس کی خاطر دو جہاں پیدا ہوئے
جسؐ کے صدقے میں زمین و آسماں پیدا ہوئے

وہ محمدؐ نور تھا جس کا سراپائے یقیں
خلقتِ آدم تھی جس دم، درمیانِ ما و طیں

وہ محمدؐ جس کے خد و خال کی آیات سے
وہ محمدؐ جس کے نورِ پاک کی برکات سے

آب کو ٹھنڈک ملی تو برق کو حدت ملی
اس ہوا کو پر ملے اس خاک کو صورت ملی

بے یقیں تظلمِ مظاہر میں تیقن آ گیا
اس کی رحمت سے عناصر میں توازن آ گیا

نکتۂ آغاز بھی اور ارتقا بھی تھا وہیؐ
انتہا بن کر جو آیا، ابتدا بھی تھا وہیؐ

غزل

مجھے ملا وہ بہاروں کی سرخوشی کے ساتھ
گل و سمن سے زیادہ شگفتگی کے ساتھ

وہ رات چشمۂ ظلمات پر گزاری تھی
وہ جب طلوع ہوا مجھ پہ روشنی کے ساتھ

اگر شعور نہ ہو تو بہشت ہے دنیا
بڑے عذاب میں گزری ہے آگہی کے ساتھ

یہ اتفاق ہیں سب راہ کی مسافت کے
چلے کسی کے لیے جا ملے، کسی کے ساتھ

بُرا نہیں ہے مگر حسبِ تشنگی بھی کہاں
سلوک شہد لباں، میری تشنگی کے ساتھ

فضا میں رقص ہے مہتاب حسیں پرندوں کا
مجھے بھی حسرت پرواز ہے کسی کے ساتھ

ضیاء الحسن ضیاء

پاکستان کے نعت گو شعراء حصہ دوم کے لیے مرتب نے جب ضیا محمد ضیا کا انتخاب کیا تو کیا یک کراچی کے معروف نونہال نظم نگار ضیا الحسن ضیا کا خیال آیا جن کی نونہال ادب کے لیے خدمات کو ۴۰ برس کا عرصہ ہونے کو آیا۔ جولائی ۲۰۰۲ء میں منظر عام پر آنے والے نعتیہ مجموعے "ضیائے مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)" اور اس کے شاعر کو ہم اس حصے میں شامل کر رہے ہیں۔

۲۲ راکتوبر ۱۹۵۰ء کو پیدا ہونے والے ضیاء الحسن ضیاء کے والد مظہر جلال آبادی کے نام سے افسانے لکھا کرتے تھے۔ اُن کے افسانوں کا مجموعہ "رومانِ صحرا" لاہور سے چھپا تھا۔ ڈراما نگار آغا حشر سے اُن کی دوستی تھی۔ کئی اسٹیج ڈراموں میں اُنہوں نے حشر کے ساتھ اداکاری بھی کی۔ بعد میں قیامِ پاکستان سے قبل مظہر شاہ جہاں پوری کے نام سے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "دلہن" بھی لاہور میں قیام کے دوران شائع کروایا اور وطن واپس چلے گئے۔

۱۹۵۰ء میں ضیاء الحسن ضیاء کی پیدائش لاہور میں ہوئی۔ ضیاء اپنے والدین کے ساتھ کراچی آئے تو اُن کی عمر محض چندرہ ماہ تھی۔ ضیاء الحسن ضیاء نے ایم اے، بی ایڈ تک تعلیم حاصل کی۔ ایک اسکول میں مدرس کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے بچوں کے لیے نظمیں اور مشاعروں کے لیے غزلیں لکھتے رہے۔ قمر کانپوری سے تلمذ حاصل کیا۔ ۱۹۶۴ء سے تاحال اخبارات کے صفحات معروف ادبی و نونہال پرچوں میں اُن کی غزلیں اور نظمیں چھپ رہی ہیں۔ حمد اور نعت کا مجموعہ "ضیائے مصطفیٰ" (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) ۲۰۰۲ء سے پہلے غزلوں کا مجموعہ "روشنی سفر میں ہے" ۲۰۰۱ء میں شائع ہوا تھا۔ ضیا کا قیام لانڈھی میں ہے۔ جہاں قمر ہاشمی اور جوہر سعیدی وغیرہ کے ساتھ اُنہوں نے مشاعرے پڑھے۔ ضیا الحسن ضیاء سادہ طبع، منکسر المزاج انسان ہیں۔ اُن کی شاعری میں بھی سادگی ہے۔ نعت کے اظہار میں خدائے واحد کی قدرتِ کاملہ کا بیان اور رسولِ اکرم (صلی اللہ

علیہ وآلہٖ وسلم) سے اپنی والہانہ عقیدت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ضیاؔء نے سیدھا اور سچا راستہ اختیار کیا ہے۔ اُن کے کلام میں تصنع یا بناوٹ نہیں ہے۔ مستقل مزاجی کے ساتھ شعر و ادب سے پیوست رہنا ضیاالحسن ضیاؔء نے اپنا شعار بنالیا ہے:

◆◆◆

نعت

ہم کس زباں سے مدحتِ خیرالبشر کریں
یکجا کہاں سے اپنی خبر اور نظر کریں

ہم اُمتی ہیں آپؐ کے یا شاہِ دوسرا
نازاں ہیں کیوں نہ فخر ہم اس بات پر کریں

تنویرِ صبحِ گنبدِ خضرا نظر میں ہو
جو لوگ آرزوئے طلوعِ سحر کریں

آقا سے التماس کی ہے آرزو اگر
اپنی زبانِ فکر کو شائستہ تر کریں

تعلیمِ مصطفیٰؐ کا تقاضا ہے اے ضیاؔ
روشن چراغِ خانۂ علم و ہنر کریں

غزل

نقش و نگارِ گردشِ ایام رہ گئے
لکھے ہوئے درختوں پہ کچھ نام رہ گئے

پل بھر میں گھر کو چھوڑ دیا جب مکین نے
حیرت سے اس کو تکتے در و بام رہ گئے

خوشیاں امیرِ شہر کی تقدیر بن گئیں
باقی غریبِ شہر کو آلام رہ گئے

دن کی بساط لوٹ دی سورج نے ڈوب کر
پھر بھی حسین عکسِ سرِ شام رہ گئے

فنکار اپنی بھوک کا چارہ نہ کر سکا
سب شیلف میں سجے ہوئے انعام رہ گئے

پو پھٹتے ہی پرندے کسی سمت اڑ گئے
ترکش کے سارے تیر ہی ناکام رہ گئے

شاید ضیائے بزم کا مفہوم ہو یہی
حرفوں کی شکل میں ترے پیغام رہ گئے

ظفر اکبر آبادی

سرزمینِ آگرہ ایک روحانی کشش رکھنے والا خطہ سرزمین ہے، خصوصی طور پر دلِ عشاق کا مرکز ہے، غالب، تاج محل، یہ وہ مرکزِ خیال ہیں جو عہد بہ عہد ادب، افسانہ نویسی، مصوری اور شاعری کے لئے خام مال فراہم کرتے ہیں، اسی سرزمین میں سید ابو ظفر جعفری ۱۹۳۴ء میں محلہ شاہ گنج اکبر آباد میں پیدا ہوئے۔

خوش قسمت انسان واقع ہوئے کہ ان کے بھائی مضطر اکبر آبادی پہلے ہی سے شعر و ادب کی دنیا میں شہرت کے حامل رہے۔ ریڈیو راولپنڈی میں بحیثیت ڈرامہ آرٹسٹ کے کام کرتے رہے، روزنامہ ''ڈان'' راولپنڈی سے بھی آپ کا تعلق رہا ہے۔

ظفر اکبر آبادی نے پہلے غزل گو شاعر کے طور پر اپنی شناخت پیدا کی اور اس میں خاصے کامیاب رہے۔ تاہم نعتیہ شاعری کی طرف اپنے رہوارِ قلم کو موڑا۔ ''رحمت مآب'' (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کا پہلا نعتیہ مجموعہ ہے جو شائع ہو کر دینی ادب کے قارئین تک پہنچا۔

نعت

نہیں اور کوئی بھی آرزو فقط آرزوئے رسولؐ ہے
کسی اور کی نہیں جستجو مجھے جستجوئے رسولؐ ہے

نہ جہاں سے ہے کوئی واسطہ نہ غرض ہے اہلِ جہاں سے کچھ
میں ہوں گم بس ایک ہی سوچ میں مرا دھیان سوئے رسولؐ ہے

وہی کیفیت وہی محویت وہی جذب و شوق کا سلسلہ
وہی جوش ہے وہی ولولہ وہی طوف کوئے رسولؐ ہے

اسی نور کی ہیں تجلیاں جو ہیں عکس ریز یہاں وہاں
جسے عکسِ نورِ خدا کہیں وہ جمالِ روئے رسولؐ ہے

یہی وِرد شام سے تا سحر یہی اپنا شغل ہے اب ظفرؔ
کبھی ذکرِ آلِ رسولؐ ہے کبھی گفتگوئے رسولؐ ہے

غزل

دوست بھی دشمن ہیں، دنیا کے ستم بھی کم نہیں
میں وہاں ہوں اب جہاں کوئی شریکِ غم نہیں

کیا ہوا ہے دم بدم کیوں بڑھ رہے ہیں فاصلے
کیوں نگاہ و دل میں آخر رابطہ باہم نہیں

آتی جاتی ہیں بہاروں اور خزاؤں کی رتیں
جو نہ ہو تبدیل ایسا تو کوئی موسم نہیں

درمیاں سے ٹوٹتا رہتا ہے اکثر سلسلہ
التفاتِ دوست ہے مجھ پر مگر پیہم نہیں

ہے اگر کچھ دکھ تو صرف اپنوں کی بے مہری کا ہے
دوسروں کی کج ادائی کا ذرا بھی غم نہیں

دل کو روگ ایسا لگا ہے کچھ نہیں جس کا علاج
زخم وہ کھایا ہے جس کا کوئی بھی مرہم نہیں

لائقِ تعظیم ہے وہ سر حقیقت میں ظفر
جو کسی ظالم، کسی جابر کے آگے خم نہیں

عارف اکبرآبادی

(۱۹۳۲ء۔۱۹۸۷ء)

استاد الشعراء عارف اکبرآبادی کا اصل نام محمد یوسف خان ولد محمد اسماعیل خان تھا۔ تخلص عارف اختیار کیا تو اسی نام سے مشہور ہو گئے، آپ کی پیدائش ۲۱/اکتوبر ۱۹۳۹ء تحصیل جلیسر ضلع ایٹہ میں ہوئی، بعد ازاں آپ کے خاندان نے اکبرآباد آگرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی، اسی نسبت سے اپنے آپ کو اکبرآبادی کہتے تھے، آپ کا گھرانہ مذہبی ہونے کے ساتھ علم و عمل کے زیور سے مرصع تھا۔ آگرہ میں مولانا محمد نعمان سے باضابطہ عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی، قرآن کریم حفظ کیا، نیز حدیث و فقہ اسلامی کا گہری توجہ کے ساتھ درس سماعت کیا ساتھ ہی ساتھ علم الحکمت پر بھی عبور حاصل کیا۔ ۱۹/دسمبر ۱۹۴۸ء کو جناب سید سخاوت علی جعفری المتخلص شوخ اکبرآبادی جانشین مرزا خادم حسین رئیس اکبرآبادی کو اپنا استاد بنایا۔

نابینا ہونے کے باوجود کسی کے دستِ نگر نہ رہے۔ اپنے معاشی مسائل پر قابو پانے کے لیے آگرہ میں موم بتی بنانے کا کارخانہ کھولا اور خوب ترقی کی، پاکستان آنے کے بعد ایک پارٹنر کے ساتھ مل کر ہاتھی دانت کی تجارت شروع کی، لیکن آپ کا پارٹنر آپ کو دھوکہ دے کر اور ساری رقم لے کر بھاگ گیا، پھر بڑی جانفشانی کے بعد آپ نے شاہ فیصل کالونی ایک نمبر میں ایک پرچون کی دکان کھولی۔ یہیں سے حکمت بھی جاری رکھی، تا آنکہ آپ پر فالج کا حملہ ہوا، بغرض علاج حیدرآباد

تشریف لے گئے اور اپنے ایک شاگرد راحت عارفی مرحوم کے ہاں مقیم ہوئے۔ علاج سے افاقہ نہ ہوسکا یہاں تک کہ وقتِ اجل آپہنچا، ۱۷ اگست ۱۹۸۷ء کو دار فانی سے کوچ کر گئے، آپ کی تدفین ٹنڈو یوسف (اسلام آباد حیدرآباد) کے قبرستان میں ہوئی۔

زندگی میں آپ کا کوئی مجموعہ کلام شائع نہ ہوسکا۔ ۱۷ اگست ۱۹۸۱ء کو انتقال کے بعد کراچی اور حیدر آباد کے چند شاگردوں نے مل کر (باہتمام بزمِ جمیل اور حرا فاؤنڈیشن پاکستان) آپ کی نعتوں کا ایک مجموعہ ''فردوسِ آرزو'' کے نام سے ستمبر ۱۹۹۰ء میں شائع کرایا جبکہ آپ کی تمام مذہبی شاعری حمد، نعت، منقبت، سلام، رباعیات وقطعات اور مراثی ''عرفانیاتِ عارف'' کے نام سے ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی۔

نعت

طوافِ گنبدِ خضریٰ جو راس آیا مدینے میں
نظر نے اک سرورِ جاوداں پایا مدینے میں

یہاں سب کچھ بقدرِ وسعتِ امید ملتا ہے
سوالی بن کے جس نے ہاتھ پھیلایا مدینے میں

بہر لمحہ بہر لحظہ بہر جلوہ بہر عنواں
زمیں پر خلد کا عالم نظر آیا مدینے میں

وہی جلووں کی تابانی وہی رنگوں کی ارزانی
کسی کو کب خیالِ بیش و کم آیا مدینے میں

متاعِ زندگی کی قدر و قیمت پوچھئے اُن سے
لٹا آئے جو اپنی جاں کا سرمایہ مدینے میں

بڑھا دی عرش کی رفعت سے رفعت خاکِ طیبہ کی
رسولِ پاکؐ نے آرام فرمایا مدینے میں

کسی کو یاد بھی آئی نہ عارف گرمیٔ محشر
سروں پر تھا پرِ جبریلؑ کا سایہ مدینے میں

غزل

ہر خیالِ زندگی دار و رسن تک رہ گیا
تیرا دیوانہ بھی بس دیوانہ پن تک گیا

بھول جائیں گی بہاریں بھی مذاقِ رنگ و بو
شوقِ آرائش اگر صحنِ چمن تک رہ گیا

پھر محبت تیرے عارض کی پھبن میں کھوگئی
پھر زمانہ تیرے گیسو کی شکن تک رہ گیا

خاکِ پروانہ تپاں رہتی تو بنتی کوئی بات
انجمن کا راز آخر انجمن تک رہ گیا

شامِ وحشت آخرش میرا مقدر بن گئی
ہر سویرا بڑھ کے سورج کی کرن تک رہ گیا

کانٹے تھے اور بھی کوہِ گرانِ راہِ شوق
زورِ دست کوہ کن نہر لبن تک رہ گیا

جل اٹھیں گے ایک دن عارف کی عظمت کے چراغ
یہ اگر زندہ فروغِ اہلِ فن تک رہ گیا

پروفیسر ڈاکٹر عاصیؔ کرنالی

(۱۹۲۷ء......۲۰۱۱ء)

نام شریف احمد تخلص عاصیؔ ہے۔ پیدائش ۲ جنوری ۱۹۲۷ء کرنال (انڈیا) ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سے سکونت ملتان میں رہی۔ موصوف ایم اے اُردو، ایم اے فارسی ہیں۔ معلمی کے پیشے سے وابستہ رہے۔ ملازمت کالج کی پروفیسری سے شروع ہوئی اور پرنسپل کے عہدے تک پہنچے۔ سرکاری ملازمت کا یہ سفر ۱۹۸۹ء میں اختتام پذیر ہوا۔ بہاؤ الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان میں بہ طور وزیٹنگ پروفیسر وابستہ رہے۔ علمی میدان میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ آپ کا دائرۂ تحریر بہت وسیع ہے۔ نثر و نظم کی مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی۔ اُن کی تصانیف حسب ذیل ہیں:

"رگِ جاں"، "جنبشِ خزاں"، "چمن"، "نظم وغزل کے اور "مدحت"، "نعتوں کے گلاب"، "جاوداں" نعتوں کے مجموعے ہیں۔ "نعتوں کے گلاب" پر پہلا صدارتی ایوارڈ بھی ۱۹۸۶ء میں آپ کو ملا۔ حرف شیریں (۱۹۹۳ء) تمام و ناتمام (۱۹۹۴ء) آواز دل (۲۰۰۶) اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر ۲۰۰۱ء) پی ایچ ڈی کا مقالہ۔

عبدالمجید سالک فرماتے ہیں" عاصی ازسرتا پا ایک مسلمان شاعر ہے۔ حمد و نعت کو چھوڑ یئے۔ باقی کلام بھی اسلامی ہے، عاصیؔ کے کلام میں عمل انگیز اور حیات افروز خیالات کی افراط ہے"

ماہرالقادری کا ارشاد ہے:" عاصی کرنالی ان ممتاز شعراء میں بلند مقام رکھتے ہیں جنہوں نے معاشرے کو پاکیزہ، شعروادب کو حسین اسلوب اور زبان کو ندرت وروانی دی ہے۔ عاصی کے کلام میں متوازن فکر، مقصدیت اور عمل و حرکت کی قوت پائی جاتی ہے۔" ان کی وفات ۲۰ جنوری ۲۰۱۱ء کو ملتان میں ہوئی۔ ملتان میں ہی آسودۂ خاک ہیں۔

◆◆◆

نعت

فصیلِ زیست پہ بجھتا ہوا دیا ہوں میں
منارِ نور ! ترا عکس چاہتا ہوں میں

میں خاکِ محض، میں انبارِ گل، مَیں مشتِ غبار
تریؐ نگاہ جو پڑ جائے کیمیا ہوں میں

بس ایک عکس کیا جس نے عمر بھر میں قبول
تراؐ جمال سلامت وہ آئینہ ہوں میں

میرے حبیبؐ! مری حسرتِ نگاہ تو دیکھ
مدینہ دیکھنے والوں کو دیکھتا ہوں میں

مرے کریم! تریؐ بارشِ کرم کو سلام
کہ نارسائی کے شعلوں میں جل رہا ہوں میں

میں کون؟ ذرۂ خاکِ درِ نبیؐ، عاصی
ستارے عرشِ معلیٰ سے توڑتا ہوں میں

غزل

آدمی تنہا سہی اتنی بھی تنہائی نہ ہو
دل میں جو رہتا ہو اس سے بھی شناسائی نہ ہو

بس اسے اپنا بنالو بس اسی کے ہو رہو
ایک ہی در پر جھکو در در جبیں سائی نہ ہو

ایک موج تند رو کا رخ ہے بستی کی طرف
غافلو جاگو کہ یہ دریا کی انگڑائی نہ ہو

ہو گئی ہو دیر شاید بند کمرے میں مجھے
چاندنی پھولوں کے آنگن میں اتر آئی نہ ہو

دیکھنے کی کوئی تو تہذیب ہونی چاہیے
آدمی ہر بام، ہر در کا تماشائی نہ ہو

اس کے چہرے پر تغزل کی ہیں ساری ندرتیں
یہ غزل خود شاعر فطرت نے فرمائی نہ ہو

اس کو کیا دیکھو گے عاشق اپنی آنکھیں جائیں گی
سامنے سورج ہو اور نقصان بینائی نہ ہو

عبدالعلیم کے طالبؔ

عبدالعلیم کے طالبؔ، سہیل غازی پوری، ڈاکٹر جمیل عظیم آبادی، صدیق فتح پوری وغیرہ شعرائے کراچی کے ہم عصر تھے۔ ان کے نام کے ساتھ "کے" غالباً خان کا مخفف ہے۔ وکالت کے پیشے سے وابستہ تھے۔ ان کا شعری مجموعہ "بساطِ گفتگو" کے نام سے شائع ہوا۔ نعتیہ مجموعہ "یا اللہ یارسول" (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نام سے ۱۹۹۳ء میں منظرِ عام پر آیا۔ کراچی کے ایک معروف شاعر و نقاد جناب جاذب قریشی نے عبدالعلیم کے طالب کے نعتیہ مجموعے "یا اللہ یارسول اللہ" (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایک تجزیاتی مضمون رقم کیا جو جاذب قریشی کی کتاب "نعت کے جدید رنگ" میں شامل ہے۔ سادہ زبان اور سادہ مضامین کے پیراہن میں ان کی نعتیں پُر اثر اور دلچسپ ہیں۔ تاہم علمیت کا فقدان نظر آتا ہے، اگرچہ "پاکستانی تصوف" سے عبدالعلیم کے طالب کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ غالباً ۲۰۰۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔

نعت

نہیں مجھ کو مرے آقاؐ کی نسبت سے
خدا تک بھی رسائی ہے مری اُن کی وساطت سے

خدائے پاک کا نازل شدہ قرآن وہ خود ہیں
مرا رشتہ نہ ٹوٹے گا کبھی اُنؐ کی شریعت سے

عمل کے ایک اِک گوشے میں وہ ہی کارفرما ہیں
ہر اک پر استفادہ فرض ہے صرف اُن کی سنّت سے

حواس و ہوش پر چھائے ہوئے ہیں نور کی صورت
کبھی دامن نہ خالی ہوگا میرا اُن کی رحمت سے

خدا نے خود شفیع المذنبیں اُن کو بنایا ہے
کوئی مایوس ہو پھر کس طرح اُن کی شفاعت سے

نہیں تابِ زیارت آپ کی لیکن مرے آقاؐ
مجھے محروم رکھیے مت مدینے کی زیارت سے

نہیں تھا میرے بس میں خود بخود لفظ و بیاں ہونا
مرے نطق و بیاں میں رس بھرا ہے اُن کی مدحت سے

غزل

شوق دستار فضیلت ہے تو سر غائب ہے
مجمع اہل ہنر ہے تو ہنر غائب ہے

راہ مسدود ہے امکانِ مفر غائب ہے
خوب دیوار سلامت ہے کہ در غائب ہے

دشت میں دیکھ کے وہ روز بلاتا تھا مجھے
اب جو بستی میں ہوں موجود اثر غائب ہے

آبیاری نے بڑے ناز اٹھائے ہیں مگر
پھر بھی شاخوں کے مقدر سے ثمر غائب ہے

یوں تو کہنے کو سبھی اہلِ نظر ہیں طالبؔ
سب کی آنکھوں سے مگر حسنِ نظر غائب ہے

عبدالعزیز خالدؔ

عبدالعزیز خالدؔ ۱۹۲۷ء میں شاہ محمد کے گھر بر چیاں کلاں تحصیل نکودر ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ ایم اے اقتصادیات میں کیا۔ انکم ٹیکس افسر رہے۔ ریٹائرڈ ہو کر لاہور میں مقیم ہیں۔

خالد ایک پُر گو اور قادرالکلام شاعر ہیں۔ اُنہوں نے تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ خالد نعتیہ شاعری میں بھی ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔ قوسِ قزح کے رنگ اُن کے دامنِ نعت میں موجود ہیں۔ اگر چہ عام قاری کی رسائی اُن کی نعتوں تک نہیں ہے۔ سرکار مدینہ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم) کی ذاتِ گرامی اتنی بلند و اعلیٰ و ارفع ہے کہ اُس کی مناسبت سے الفاظ کی تلاش میں نکلے تو دنیائے ادب کی تمام زبانوں سے وہ استعارے اور کنائے ڈھونڈ لائے جو آپ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم) کی شان کا احاطہ کرتے ہوں۔ اگر دورِ جدید کے نعت گو شعراء خالدؔ کی پیروی کریں تو الفاظ کے اعادہ سے قاری اُن الفاظ سے مانوس ہو جائے گا جن سے نعتیہ شاعری کا دامن اب تک خالی ہے اور بہت ممکن ہے کہ قاری کا مذاقِ سخن بدل جائے۔ خالدؔ مشکل پسند واقع ہوئے ہیں اور اُن کے یہاں الفاظ کا بحرِ بیکراں دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خالدؔ کی نعتیہ شاعری روایت سے الگ تھلگ ہے۔ عربی، فارسی، عبرانی، ترکی اور کئی قدیم السنہ الفاظ کی اُن کی شاعری میں بہتات ہے۔

خالد کے نعتیہ مجموعے ''فارقلیط''، ''منحمنا''، ''ماذ ماذ''، ''طاب طاب''، ''عبدہٗ'' اہلِ علم حضرات کو دعوتِ فکر دیتے ہیں۔

ڈاکٹر عزیز احسن عبدالعزیز خالد کے بارے میں لکھتے ہیں:

''عبدالعزیز خالد نے مضامینِ نعت کو وسعت دی اور اپنی قادرالکلامی، ندرتِ بیان، لہجے کی انفرادیت اور زبان دانی کی وجہ سے بہت جلد وہ مقام حاصل کر لیا جو اس سے پہلے اردو نعت گوئی کی تاریخ میں کسی کو نہیں ملا تھا۔ ان کی شاعری میں عالمی ادب کی فکری بوقلمونی عکس ریز ہے۔ اردو نعت

گوئی کی تاریخ میں قدیم وجدید علوم اور السنہ سے ماہرانہ آگاہی رکھنے والا اس قدر اعلیٰ تخلیقی صلاحیتوں کا حامل عبدالعزیز خالد کے علاوہ شاید ہی کوئی اور شاعر ہو۔ خالد کا طویل نعتیہ قصیدہ "فارقلیط" ۱۹۶۴ء میں کتابی صورت میں آیا تھا بعد میں ان کی کتابیں منحمنا "حمطایا" ماذ ماذ، طاب طاب اور عبدہ کے نام سے شائع ہوئیں۔

عبدالعزیز خالد وہ خوش نصیب نعت نگار ہیں جن کے فن کی مہک ان کے عین حیات نہ صرف پھیلی بلکہ اس کی پذیرائی بھی ہوئی۔ نعتیہ ادب کو ثقہ روایات، اعلیٰ فنی اقدار زبان وبیان کے مسلمہ معیارات اور اسلوب کی متانت سے روشناس کروانے والے اور کثیر اللسانی تجربات سے نعتیہ شاعری کو باثروت کرنے والے شعراء کی صف اوّل میں عبدالعزیز خالد ہی نظر آتے ہیں"
(ادبیات نعت نمبر ۲۴۳۶)

ڈاکٹر عاصی کرنالی مرحوم اور ڈاکٹر ریاض مجید نے ان کے فکر وفن پر اپنے مقالوں میں بحث کی ہے۔ جب آپ شہزاد احمد کا مقالہ "اردو نعت پاکستان میں" دیکھیں گے تو عبدالعزیز خالد کا خانہ ذکر سے خالی نظر آئے گا۔ بادی النظر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب ادبی شخصیت حواریوں میں گھر جائے تو اس سے ایسی ہی فاش غلطیاں سرزد ہو جاتی ہیں جس کا ازالہ تاریخ میں ممکن نہیں ہوتا۔ شہزاد احمد اپنی ذات کے اسیر ہیں اور اسی دائرے میں وہ تمام عمر سرگرداں رہیں گے۔

ڈاکٹر عاصی کرنالی "اردو حمد ونعت پر فارسی شعری روایت کا اثر" صفحہ ۳۹۷ پر رقم طراز ہیں:

> "ان تمام مجموعوں میں ایک فنی جمال تو یہ ہے کہ اوزان وبحور اور ردیف وقوافی کے استعمال میں اپنی جدت طبع کے جوہر دکھا کر خالد نے ان کو جہاں اپنے اسلوب کی انفرادیت کا ایک خوبصورت ثبوت فراہم کیا ہے وہیں قاری اور سامع کے غنائی ذوق اور احساس نغمگی کی آسودگی کا سامان بھی پیدا کیا ہے دوسری خوبی یہ کہ اس تنوع کاری نے اہل مطالعہ کو یکسانیت کی فضا سے بے لطف نہیں ہونے دیا۔"

نعت

اللہ ھو اور عبدہٗ کی وہ ملاقات بہم
دو قوس کا تھا فاصلہ یا غالباً اس سے بھی کم

چرچا تھا اس آمد کا کب سے آنسوئے عرش بریں
کب سے سجا تھا خیر مقدم کے لیے کاخ قدم

جبریل کو بھیجا گیا تھا ہمرکابی کی لیے
نازاں تھا اپنی خوش نصیبی پر براق تازہ دم

سرعت میں بڑھ کر برق طامع سے نگہ سے تیز تر
طاقت پر پرواز کی ہوتی تھی افزوں دم بدم

دیکھا کسی نے ام ہانی کا نہ در کھلتے ہوئے
آہٹ تو سنتا کوئی بھی نیند والا کم سے کم

مدہوش ان کو کردیا جس نے چلی ایسی ہوا
بیدا و شنوندہ بنے شب بھر کو امی ، و اصم

ہر آگہی سیراب جس کے چشمہ فیضان سے
لہرائے ہر کاشانہ ادراک پر جس کا علم

صیقل شب یلدائے دوراں جس کی آب وتاب سے
دنیائے دوں جس کے فروغ لم یزل سے مغتنم

کس سے بیاں ہو شان اس کی جس عظیم الشان کے
صدیقی و فاروقی و عثمانی وعلوی خدم

جس کے در بذل و سخا پر ازدحام خلق میں
کاسہ بدست ایستادہ افریدون و ذوالقرنین وجم

کایا پلٹ دے اس کی جس کو آنکھ بھر کر دیکھ لے
دامن بھرے نادار کا بے دام و دینار و درم

اپنے پرائے پر ہے یکساں جس کی چشم التفات
برتر کسی سے کوئی اس کی بزم عرفاں میں نہ کم

ہر آنے والے سے جو آئے خندہ پیشانی سے پیش
ہے سراپا الفت و عفو و مدارات و کرم

سنت کرے زندہ جو ابراہیم زندہ رود کی
جس کے طفیل اک بتکدہ پھر سے بنا بیت حرم

اس کی حدیثیں اس کی تعلیمات کا جن میں نچوڑ
ہیں اک مجوبہ مخزن اذکار و امثال وحکم

گو کرچکا پردہ مگر وہ زندہ دائم وجود
ہے رہتی دنیا تک رفیق و رہبرِ و اہل ہم

سب یک زباں اس کی ثنا میں باوجود اس کے کہ ہیں
الناس اشباہ و اخیاف و شتّٰی فی الشیم

یہ میری اندک مائگی یہ میری کوتہ پائگی
کرتا ہوں مدحت جو رقم تو یہ خدا کا ہے کرم

"مصرف یہی تیرے سخن کا ہے کہ ہو صرف ثنا
خالدا سمجھ اس مہلت عمر رواں کو مغتنم

طول امل سے بچ نظر رکھ حاضر و موجود پر
پیماں نہ باندھ اس سے ہیں بودے وقت کے قول وقسم

غزل

تاکید کرو زمزمہ سنجانِ چمن کو
بے چین ہوں دل جن سے وہ نغمے نہ الاپو

اے اہلِ وطن ! کھاؤ پیو شوق سے لیکن
کھیلو نہ کبھی سر سے کبھی منہ سے نہ بولو

ہر طائرِ پرواز کے پر و بال کرو قینچ
ہر بندۂ آزاد کو شیشے میں اتارو

بن جائے روایت نہ کہیں حلقۂ زنجیر
ہر رفتہ کو موجود کی میزان پہ تولو

ہم تو ہیں فقط دل زدۂ ذوقِ تماشا
رم ہم سے عبث کرتے ہو اے زہرہ لگا ہو

ہم چشمِ سحر ، دیدۂ شب ، دستِ صبا ہیں
پردہ تو ہے نامحرموں سے لالہ عذارو

وہ قوم کہ نام اس کا مسلمان ہے خالد
کیا یاد ہے شرط انتم الاعلون کی اس کو

عبداللطیف عارف

(۱۸۹۵.....۱۹۷۱)

ممتاز صحافی، پنجابی زبان کے مشہور شاعر، طبیب، مبلغ، مصنف، مترجم تحریک آزادی کے سر گرم کارکن، سید عطا اللہ شاہ بخاری سلفی، بانی و مدیر ہفت روزہ ''القصاص'' و ترجمان گجراتی ''مدرسۃ المبلغات کملی والا'' گجرات، و دارالمبلغین گجرات، اتنے حوالوں سے یاد کی جانے والی شخصیت کا نام عبداللطیف عارف ہے، عبداللطیف عارف کی ولادت ۱۸۹۶ء کو تخشہ متصل گھڑتل ضلع سیالکوٹ میں ہوئی، والد کا نام شیر محمد عرف میاں بلھے شاہ تھا۔

عبداللطیف عارف کی کئی تصانیف منظر عام پر آئیں جن میں نعتیہ مجموعہ ''خیر البشر'' (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) (۱۳۴۳ھ) دوسرا ایڈیشن، ''شانِ حضور'' (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) (۱۳۶۵ھ) ''حیات خیر النساء'' (شان بتول رضی اللہ عنہا) ''شانِ ابو بکر صدیق'' اور ''شانِ عمر'' (رضی اللہ عنہما) قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے مسدس حالی کا پنجابی زبان میں ترجمہ بھی کیا جس کا نام ''تصویر امت'' ہے عبد اللطیف عارف کی وفات یکم اکتوبر ۱۹۷۱ء کو گجرات میں ہوئی، تدفین جھنگی قبرستان محلہ شاہ قاسم پورہ شہر گجرات میں ہوئی:

نعت

آئینہ بن کے ہمیں عکس دکھایا تُو نے
نسل در نسل ہمیں خود سے ملایا تُو نے

سارا عالم تریؐ خوشبو سے مہک اٹھا ہے
عود کی طرح سدا خود کو جلایا تُو نے

تیریؐ عظمت سے ہمیں وسعتِ کردار ملی
ہم کہ قطرہ تھے ہمیں بحر بنایا تُو نے

زیست تھی کارگہِ شیشہ گراں تیرے لیے
رنجِ محنت کو نزاکت سے اٹھایا تُو نے

ہم بجرا کرتے ہیں صد رنگ حقیقت جس میں
جاگتی آنکھوں سے وہ خواب دکھایا تُو نے

فقر کو رفعتِ مفہوم ترےؐ گھر سے ملی
اپنے دروازے پہ شاہوں کو جھکایا تُو نے

غزل

تتلیاں رنگوں کا محشر ہیں کبھی سوچا نہ تھا
ان کو چھونے پر کھلا وہ راز جو کھلتا نہ تھا

تُو وہ آئینہ ہے جس کو دیکھ کر روشن ہوا
میں نے اپنے آپ کو سمجھا کہاں دیکھا نہ تھا

چاند بن کر تو مرے آنگن میں اترا ہے ضرور
نور اتنا بام و در پر آج تک بکھرا نہ تھا

کون سے عالم میں میں نے آج دیکھا ہے تجھے
تُو دھنک بن کر مرے دل میں کبھی اترا نہ تھا

سخت جانی سے مرا دل بچ گیا ورنہ یہاں
کون سا پتھر تھا اس شیشے پہ جو برسا نہ تھا

اس جہانِ رنگ و بو کو میں نے سمجھا تھا سراب
اک حقیقت تھا یہ عارفؔ آنکھ کا دھوکا نہ تھا

عبدالوحید تاجؔ

تاجؔ تخلص اختیار کرنے والے نعت گو شاعر کا خاندانی نام عبدالوحید ہے، والد محترم کا نام عبد الرحیم عرف چاند ہے، عبدالوحید تاج کی پیدائش ناگ پور (سی پی بھارت) میں ۱۹۴۲ء کو ہوئی، پاکستان بننے کے بعد آپ نے پہلی ہجرت اہل خانہ کے ساتھ سابق مشرقی پاکستان کی طرف کی اور سید پور میں مقیم رہے، دوسری ہجرت سابق مشرقی پاکستان سے ۱۹۷۳ء میں پاکستان کی طرف کی اور کراچی اپنا مسکن بنایا۔لہذا جناب اعجاز رحمانی نے اپنے مضمون و تبصرے میں تاج صاحب کو دو ہجرتوں کا شاعر کہا ہے۔تاج صاحب کے ذوق شاعری کی ابتدا جب سے ہوئی اسی وقت سے آپ بے شمار ادبی انجمنوں سے وابستہ رہے جن کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔ بزم ادب ڈھاکہ، بزم حافظ ڈھاکہ، دبستان تاج گجرانوالہ اور کراچی میں شعری دائرہ، بزم عبرت، دبستان آرزو، روح ادب، ادارہ احباب نارتھ کراچی، بزم قمر، مدینۃ الادب، بزم ولی، بزم دانش، بزم شمیم ادب اور سفیران ادب سرفہرست ہیں۔

عبدالوحید تاج کے اب تک ۱۰ مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں اور اب موصوف گیارہویں مجموعے کی تیاری میں مصروف ہیں جس کا نام ''تیسری ہجرت نہیں کریں گے'' ہے۔آپ کے اب تک جو مجموعے قاری اور اہل قلم کے ہاتھوں میں ہیں ان میں حمد، نعت، مناقب اور غزلیات کے

مجموعے شامل ہیں۔

ہاشمی گلاب (نعتیہ مجموعہ) ۲۰۰۷ء، صاحب ام الکتاب، خیالِ شگفتہ (مجموعۂ غزل) سخن طراز (مجموعۂ غزل) "عریضہ" (مجموعۂ منقبت وسلام) "تراشے" (مجموعۂ قطعات ومتفرق اشعار) خندۂ گل، تاج سخنوراں، لمحوں کے آبگینے میں، آئینۂ انتخاب (منتخب مجموعہ کلام)

عبدالوحید تاجؔ کی نعت گوئی بھی کیا خوب ہے۔ عشقِ نبی کریمؐ میں ڈوبی ہوئی شاعری ہے اور حدِ ادب کا لحاظ بھی ملحوظ ہے۔ الفاظ کا چناؤ حدادب میں ہے۔ تاجؔ کی نعتیہ شاعری میں عشقِ نبی کریم کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور ساتھ میں صحابۂ کرام خصوصاً خلفائے راشدینؓ، آئمہ کرام، اہل بیت اطہار و اولیاء اور بزرگانِ دین سے بھی عشق ومحبت اور عقیدت نمایاں ہے جو یقیناً آپ کی بخشش کا ذریعہ بنے گی۔ تاجؔ کے ہی ایک نعتیہ شعر پر اپنی تحریر ختم کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

میرے مولا تو میرے رزق کے بدلے مجھ کو
میرے آقا نے جو باندھا تھا وہ پتھر دے دے

نعت

''تیرگی کا رخ موڑو نعت کے حوالے سے
روشنی کا در کھولو نعت کے حوالے سے

اور کوئی چاہت کی کیا کروں طلب جب کہ
مل گیا خدا مجھ کو نعت کے حوالے سے

درس دے رہی ہے یہ سیرتِ نبی پیہم
متحد کرو سب کو نعت کے حوالے سے

ذکرِ بانیٔ دیں سے شمع دین روشن ہے
دین کو ضیا بخشو نعت کے حوالے سے

آتی جاتی سانسوں میں نعت کی رہے خوشبو
یوں سنوارو ہستی کو نعت کے حوالے سے

بالیقیں عطا ہوگا شہر علم کے در سے
بھیک علم کی مانگو نعت کے حوالے سے

لے کے حرف قرآں سے اپنی فکر کو تم بھی
حق کا تاج پہناؤ نعت کے حوالے سے''

غزل

زد میں گرداب کی گھبرا کے صدا مت دینا
خود کو دنیا کی نگاہوں میں گرا مت دینا

کسی اعزاز کی خواہش ہی نہیں ہے مجھ کو
تم مجھے میری محبت کا صلہ مت دینا

میں ابھی وسعتِ افلاک میں گم ہوں لوگو
لوٹ آنے کی مجھے کوئی صدا مت دینا

خودکشی کے لیے تیار ہیں دیوانے تیرے
اب حجابِ لب و رخسار اٹھا مت دینا

دھوپ میں جلنا تو اندازِ جنوں ہے میرا
تم ابھی مجھ کو تسلی کی ردا مت دینا

خون سے جن کے ہے رنگیں گلستانِ وطن
ان شہیدوں کی وفاؤں کو بھلا مت دینا

اس کی رسوائی میں کچھ اور اضافہ ہوگا
تاج اپنی یہ غزل اس کو سنا مت دینا

عثمان رمزؔ

کراچی کے شعری محفلوں کے شریک شاعر پروفیسر محمد عثمان رمزؔ ۲۶ جولائی ۱۹۲۹ء الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان کے دار الحکومت ڈھاکہ ۱۹۵۱ء میں آئے اور یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم اے کیا۔ امیر جماعتِ اسلامی رہے۔ سقوطِ ڈھاکہ سے قبل کراچی آگئے۔ ۷ مئی ۱۹۹۸ء کو کراچی میں وفات ہوئی اور سخی حسن قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

۱۹۵۱ء سے ۱۹۶۶ء تک پاک و ہند کے رسائل و جرائد میں مضامین لکھے۔ اکثر غزل بھی شائع ہوتی۔ اردو کے ساتھ بنگلہ زبان میں بھی تقریر کر لیتے۔ ۱۹۷۱ء میں ذاتی کتب خانہ لوٹ لیا گیا۔ "زخمِ تنہائی" (۱۹۹۷ء) شعری مجموعے کے شاعر قومی اسمبلی کے رکن (۱۹۸۵ء) تا رتھ

کراچی میں ان کی شعر و ادب کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اس سلسلے میں انہوں نے "دبستانِ حرا" کے نام سے ایک علمی و ادبی ادارے کی بنیاد رکھی اور اس ادارے کے تحت اپنی عمر کے آخری حصے تک شعر و ادب کی خدمات انجام دیتے رہے۔ علاوہ ازیں سقوطِ ڈھاکہ کے بعد جو لوگ اورنگی ٹاؤن میں آباد ہوئے ان کی آبادکاری میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ یہاں کے لوگ اپنے اس محسن کو ہمیشہ اپنے دلوں میں یاد اور ۔۔ں میں آباد رکھیں گے۔

◆◆◆

نعت

توجہ آپ کی جب کاشفِ اسرار ہوتی ہے
تو ہر خفتہ حقیقت زیست کی بیدار ہوتی ہے

ندامت کا پسینہ خشک ہو جاتا ہے طیبہ میں
یہاں کی دھوپ بھی اِس درجہ سایہ دار ہوتی ہے

دفینے کروٹیں لیتے ہیں صحرا کے سرابوں میں
ہماری آنکھ جب روضے پہ گوہر بار ہوتی ہے

پہنچ جاتا ہوں میں اِک جست میں شہرِ مدینہ تک
اگرچہ سر زمینِ خواب ناہموار ہوتی ہے

انا کے دور میں خُلقِ شہِ طیبہ کی سچائی
سوادِ تیرہ میں والشمس کا اظہار ہوتی ہے

جنابِ رمزؔ کے زخموں کی رنگت شہرِ طیبہ میں
کبھی گل رنگ ہوتی ہے کبھی گلنار ہوتی ہے

غزل

دل سلگنے کا نشاں رکھتے ہیں
قریۂ جاں میں دھواں رکھتے ہیں

غم کو وابستۂ جاں رکھتے ہیں
زندگی زیرِ اماں رکھتے ہیں

ہم نے رخ پھیرے ہیں سیلابوں کے
ہم ترائی میں مکاں رکھتے ہیں

خونِ حسرت سے جو لکھتے ہیں غزل
شعر میں زورِ بیاں رکھتے ہیں

رمزِ زخموں کی بدولت دل میں
موسمِ گل کا سماں رکھتے ہیں

عثمان قیصر

۱۴ اگست ۱۹۴۶ میں عثمان قیصر مظفر پور صوبہ بہار میں پیدا ہوئے۔ مظفر پور کی لیچی اپنی مٹھاس اور رس کی وجہ سے پورے برصغیر میں مشہور ہے اسی طرح عثمان قیصر کی شاعری بھی فکر سے تر و تازہ ہے۔ عثمان قیصر نے ۱۹۹۰ء میں حج اور عمرے کی سعادت حاصل کی ایران ترکی شام اردن وغیرہ بھی گئے اس کی وجہ سے ان کی شاعری میں عالم اسلام میں بپا کرب کی جھلک موجود ہے۔

خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی تحریر فرماتے ہیں:

"عثمان قیصر اپنی حمد و نعت میں دل دھڑکتا ہوا محسوس کرا دیتے ہیں یہ بات ایک اچھا شاعر ہونے کی گواہی دیتی ہے شاعر موصوف ۴۵ برس سے میدان سخن گوئی میں ہیں اور مشق و ریاضت سے گزر رہے ہیں ان کی حمد و نعت کے اشعار اس کے خود شاہد ہیں کہ وہ کمزور شاعر نہیں ان کے کلام میں زندگی ہے وہ شعریت کے حامل ہیں۔ حمد کے اشعار سے امثلہ دیکھیے:

سنتا ہے سب کی آہ و فغاں رب کائنات
شہ رگ سے بھی قریں ہے نہاں رب کائنات
ہیں شہر بے اماں کے در و بام ملتجی
کر دے بحال امن و اماں رب کائنات

ڈاکٹرعزیزاحسن تحریرفرماتے ہیں:

"تخلیقی سطح پر اس صنف لطیف میں کچھ تنوع پیدا ہوا وہ یوں کہ قمر وارثی اوران کے رفقائے کار کے ذریعے ایک ردیفی تحریک شروع کی گئی ردیف کا مفرد لفظ یا مرکب الفاظ ردیف کے طور پر شعراء کو دے کر نعت تخلیق کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے اور ہر ماہ پاکستان کے کسی ایک شہر یا جدہ میں نعتیہ محفل کا انعقاد کر کے شعراء کو اپنی طرف سے حضور نبی کریمؐ کی جناب میں تازہ بہ تازہ نذرانہ عقیدت پیش کرنے کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ ردیفی مشاعروں میں باقاعدگی سے شریک ہونے والے شعراء میں ایک اہم نام عثمان قیصر کا ہے جن کی ایک کتاب "جلال سے جمال تک" کے نام سے پہلے شائع ہو چکی ہے اور اب "ثنائے جلال و جمال" کے نام سے دوسرا نعتیہ مجموعہ منصۂ شہود پر آیا ہے۔"

راقم کے خیال میں ان کے مجموعوں کو نعتیہ ادب کے حوالے سے قارئین کو ضرور پڑھنا چاہیے۔

نعت

بہشتِ جہاں ہے مقامِ مدینہ
مبارک تمہیں خاص و عامِ مدینہ

کرم فیضِ رحمت کی بارش مُسلسل
یہ ہے باعثِ احتشامِ مدینہ

فرشتوں کا مسکن ہے حوروں کی وادی
الگ ہے جہاں سے مقامِ مدینہ

حبیبِ خدا کی ہے جائے سکونت
ہے لازم جبھی احترامِ مدینہ

نہیں کوئی برتر بجز مصطفیٰ کے
امامِ رُسل ہیں امامِ مدینہ

کہیں ڈوب جائے نہ نبضِ مُسلسل
دکھادے خدا صبح و شامِ مدینہ

تمنا ہے قیصرؔ یہی آخر دم
کہیں سب ہی مجھ کو غلامِ مدینہ

غزل

مبتلائے حرص ہے اور کی خواہش میں ہے
دہر میں جو جس قدر آرام و آسائش میں ہے

کاہلی نے ہے رائیگانی اور پشیمانی کی جڑ
سربلندی سرفرازی مستقل کاوش میں ہے

ریت کا ٹیلہ سمجھ کر روزِ اوّل سے مجھے
نقش میرا وہ مٹانے کی عبث کوشش میں ہے

دین و دنیا کے تقاضوں سے ہمہ دم بے نیاز
ہر کس و ناکس مگن تزئین و آرائش میں ہے

کہتے ہیں اہلِ فلک بھی دیکھ کر میری اڑان
بیکراں وسعت زمیں زاوے تری دانش میں ہے

کیوں گریزاں آپ ہیں آزادیٔ اظہار سے
مہرلب پر ہے نہ ہی نوکِ قلم بندش میں ہے

لہلہا اٹھتے ہیں قیصرا نیم جاں برگ و شجر
مامتا ماؤں کی جیسی قطرۂ بارش میں ہے

عرشؔ صدیقی

(۱۹۲۷ـ۱۹۹۷)

ارشاد الرحمٰن صدیقی ۲۱/ جنوری ۱۹۲۷ء ضلع گورداسپور میں پیدا ہوئے، قلمی نام عرش صدیقی اپنایا، قیام پاکستان کے وقت ان کی عمر کوئی بیس (۲۰) سال کے قریب تھی مروجہ تعلیم ایم اے انگریزی ہے۔ادبی دنیا کے عرش صدیقی درس و تدریس کے مقدس پیشے سے وابستہ رہے، گورنمنٹ کالج مظفر نگر اور گورنمنٹ کالج ملتان میں بطور رجسٹرار خدمات انجام دیں۔

عرش صدیقی اردو، انگریزی، فارسی، ہندی، پنجابی ان تمام زبانوں میں لکھنے پڑھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ادب کے تمام شعبوں میں کام کیا ہے، مرزا ادیب کے بہترین افسانے "انتخاب"، "دیدہ یعقوب" (۱۹۶۶ء)، "سب رنگ"، "سونا آنگن"، "محبت لطف میرا تھا" (۱۹۸۳ء)، "باہر کفن سے پاؤں"، افسانے، "ارقا" تنقیدی مضامین (۱۹۸۵ء) "ہر موج ہوتیز" (غزلوں کا مجموعہ) عرش صدیقی کے افسانوں کی کتاب "باہر کفن سے پاؤں" پر آدم جی انعام دیا گیا۔عرش صدیقی کو نعت رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے شعوری طور پر لگاؤ ہے۔نعتیہ مجموعہ "کملی میں بارات" کو پڑھنے سے ذہن میں خرد افروزی کا تاثر ابھرتا ہے، یہ بات غور طلب ہے کہ شعرائے نعت عقیدت ومحبت کے ساتھ ساتھ نعتِ رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے ذریعے ان باتوں کو قاری تک پہنچانے کی شعوری کوشش کر رہے ہیں جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے بحیثیت اللہ کے نبی اقوامِ عالم کو عطا فرمائی ہیں۔ "کملی میں بارات" میں یہ خوبیاں موجود ہیں۔ ۸/ اپریل ۱۹۹۷ء کو مدینۃ اولیاء ملتان میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔اللہ تعالیٰ ان کی لحد پر اپنے کرم کی بارش برسائے۔

◆◆◆

نعتیہ نظم

سلگ رہا ہے لبوں پر عذاب گویائی
یہ حق پرست ہیں ان کو صلیب پر کھینچو
کہاں سے بات چلائیں کہاں سے لفظ چنیں
یہ پاسبانِ حرم ہیں انہیں شہید کرو
کریں اشاروں میں بھی بات ہم تو اہلِ جفا
نہ کوئی جائے اقامت نہ کوئی راہِ سفر
فقیہِ شہر کو چاہیں تو محتسب دشمن
کسے رفیق کہیں کس سے دوستی نہ کریں
جو محتسب سے بنائیں تو اہلِ دل نالاں
نہیں ہے جاں سے گزرنے کا حوصلہ جو یہاں
گلی گلی یہی عف عف مکاں مکاں یہی شور
زباں پہ قفل بنی ہے مہیب خاموشی
سلگ رہا ہے لبوں پہ عذاب گویائی
اس ابتلا سے نکال اے محمد عربی

غزل

حیراں ہوں کہ یہ کون سا دستور وفا ہے
تو مثلِ رگِ جاں ہے تو کیوں مجھ سے جدا ہے

تو اہلِ نظر ہے تو نہیں تجھ کو خبر کیوں
پہلو میں ترے کوئی زمانے سے کھڑا ہے

شکوہ نہیں مجھ کو کہ ہوں محرومِ تمنّا
غم ہے تو فقط اتنا کہ تُو دیکھ رہا ہے

اُٹھتی ہیں جو پہلو سے مرے درد کی لہریں
بے تاب سمندر کوئی سینے میں دبا ہے

ٹھہرائے اُسے عرش کوئی کیسے جفا کیش
جو مجھ سے الگ رہ کے بھی ہمراہ چلا ہے

ڈاکٹر عزیز احسن

عزیز احسن کے قلمی نام سے شہرت پانے والے معروف شاعر و ادیب اور ناقدِ نعت کا خاندانی نام عبدالعزیز خان ہے۔ ان کی وجہ شہرت نعت پر تنقید ہے۔ ویسے ادبی دنیا میں ان کی حمد و نعت گوئی اور غزل سرائی کی دھاک بھی بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ 31/اگست 1947ء کو جے پور میں جناب عبدالحمید خان کے گھر پیدا ہوئے۔ ہجرت کر کے پاکستان آئے اور روشنیوں کے شہر کراچی کو اپنا مسکن بنایا۔ تعلیمی سلسلہ یہیں پر جاری ہوا، اور انہوں نے پی ایچ ڈی کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور ڈاکٹر کہلائے۔ کبھی وہ خود کو عزیز جے پوری اور عزیز صابری بھی لکھتے رہے ہیں مگر اب ڈاکٹر عزیز احسن کے نام سے ایک دنیا ان سے واقف ہے۔ روزگار کے سلسلے میں OGDC سے وابستہ ہوئے اور اسلام آباد میں اپنے فرائضِ منصبی ادا کرتے رہے۔ وہ اس ادارے سے 2009ء کے وسط میں آفیسر گریڈ میں ریٹائر ہونے کے بعد مکمل طور پر تصنیف و تالیف سے وابستہ ہو گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک ان کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں:

اُردو نعت اور جدید اسالیب، جواہر النعت (انتخاب)، تیرے ہی خواب میں رہنا، خوابوں میں سنہری جالیاں، نعت کی تخلیقی سچائیاں، ہنر نازک ہے، نعت کے تنقیدی آفاق، مثنوی رموزِ بے خودی کا فنی و فکری جائزہ، اُردو نعتیہ ادب کے انتقادی سرمائے کا تحقیقی مطالعہ (مقالہ برائے ڈاکٹریٹ)، پاکستان میں اُردو نعت کا ادبی سفر، تعلق بالرسول کے تقاضے اور ہم، نعتیہ ادب کے تنقیدی زاویئے، کرم و نجات کا سلسلہ (شعری مجموعہ)، شہپرِ توفیق (شعری مجموعہ)، اُمید طیبہ رسی (مجموعہ کلام)

ڈاکٹر عزیز احسن بیدار مغز ناقد ہیں۔ ان کے لکھے ہوئے تنقیدی مقالے اپنی مثال آپ ہیں۔

عزیز کی نعتیہ شاعری ہو یا غزلیہ شاعری ان دونوں میں تقدس کا احساس موجزن رہتا ہے۔ میری اس رائے کو قارئین تذکرہ پڑھ کر اندازہ لگالیں۔ ان کی نعت بھی موجود ہے اور غزل بھی۔

وہ ادبی رسائل و جرائد سے بھی وابستہ ہیں اور انہیں 2014ء میں اعتراف خدمات ایوارڈ سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ انہوں نے ریڈیو اور ٹی وی پر بھی اسی میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں۔ وہ گاہے بہ گاہے اپنے گھر میں محافلِ حمد و نعت کا انعقاد بھی کرتے رہتے ہیں یوں خود کو ہمہ وقت ادبی سرگرمیوں میں مصروف رکھتے ہیں۔ ان کا درِ علم و ادب کے پیاسوں کے لیے ہمیشہ وا رہتا ہے۔

نعت

نویدِ طیبہ رسی جب کبھی نہیں آئی
گلِ مُراد پہ بھی تازگی نہیں آئی

جو بخشے خوابوں کو انوار سیّد الکونین ﷺ
ہنوز آنکھوں میں وہ نیند ہی نہیں آئی

بشر تو اب بھی بھٹکتا ہے ظلمتوں میں یونہی
نبیؐ کے دیں کی جہاں روشنی نہیں آئی

قریب منبر و محراب دل پکار اٹھا
"چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی"

خوشا مدینے پہنچنے کی آرزو ہے جواں
خوشا کہ دل کی تڑپ میں کمی نہیں آئی

عزیز! دعویٰ عشقِ رسولؐ جھوٹا ہے
اگر عمل میں ہی شائستگی نہیں آئی

غزل

نظر میں رکھتا ہوں یوں بھی تری مثالوں کو
ترا ہی عکس سمجھتا ہوں میں اجالوں کو

یہ کیا ہوا کہ فقط تذکروں میں ملتے ہیں
نگاہ ڈھونڈتی پھرتی ہے باکمالوں کو

کوئی تو کرتا ہے تشہیر آبلہ پائی
کوئی چھپاتا ہے اپنی نظر سے چھالوں کو

یہ ننگے پاؤں ، یہ تپتی سڑک ، یہ دھوپ کڑی
بڑے عذاب میں ڈالا ہے نونہالوں کو

سجا رکھا ہے بڑی احتیاط سے احسنؔ
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں سوالوں کو

غالب عرفانؔ

پورا نام محمد غالب شریف ہے۔ ۵/ مارچ ۱۹۳۸ء کو پیدا ہوئے۔ اُن کا پہلا مجموعہ "آ گہی سزا ہوئی" کے عنوان سے ۱۹۹۳ء میں شائع ہوا تھا، اِس کے بعد اُن کا نعتیہ کلام "م" (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے عنوان سے منصۂ شہود پر آیا، اور نظموں، غزلوں کا دوسرا مجموعہ "روشنی جلتی ہوئی" نومبر ۲۰۰۲ء میں بزمِ تخلیق ادب، پاکستان، کراچی نے شائع کیا۔ غالب عرفانؔ کی مروجہ تعلیم بی اے ہے اور معاشی تعلق ٹیکسٹائل انڈسٹری سے رہا ہے۔

غالب عرفانؔ اپنی قلبی وابستگی کے اظہار میں رسولِ اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے حضور نعتیہ شاعری پیش کرتے ہوئے اپنی عجز بیانی کا اعتراف برملا کرتے ہیں، فن کی پختگی اور عقیدت کا اظہار مل کر اُن کے کلام کو اِس درجے پر لے آئے ہیں جہاں پڑھنے والے اور سننے والے دونوں ہی اپنے ذوق اور معیار کے مطابق پسندیدگی کی مہر لگا دیا کرتے ہیں۔

"ان پر ایک مبسوط تنقیدی مضمون محسن اعظم محسن ملیح آبادی نے لکھا ہے جو عالمی رنگ ادب میں شائع ہوا جس سے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ ان پر دیگر مشاہیر نے بھی مضامین لکھے ہیں۔"

نعت

فلک سے اس زمیں تک نور برساتی ہوئی آئی
رسولوں کے تسلسل میں جو صورت آخری آئی

ضرورت وقت کی تھی اور فطرت کا تقاضا تھا
حرا کے غار میں قرآن لے کے جب وحی آئی

محمدؐ نام ہے اس کائناتی راہ کا جس سے
ازل کا نور پھیلا اور ابد تک روشنی آئی

محمدؐ نام ہے اس عظمتِ شرحِ شریعت کا
جو ناداروں میں وحسن والوں کی دولت بانٹتی آئی

محمدؐ نام ہے اس ایک خوشبوئے مسلسل کا
جو مہکی تو ہمارے جسم و جاں میں زندگی آئی

وہ کیا آئے کہ ہستی میں مکمل انقلاب آیا
رخِ بے نور میں عرفانِ حق کی روشنی آئی

غزل

الفاظ بے صدا کی امکان آئینے میں
دیکھا ہے میں نے اکثر بے جان آئینے میں

کمرے میں رقص کرتی چلتی ہیں جب ہوائیں
کچھ عکس بولتے ہیں ہر آن آئینے میں

ہوگا کسی کا چہرہ پہچان کی لگن میں
ہوں گی کسی کی آنکھیں حیران آئینے میں

تہذیب کا تسلط ہے آئینے سے باہر
تاریخ کے سفر کا وجدان آئینے میں

رنگوں کی بارشوں سے دھندلا گیا ہے منظر
آیا ہوا ہے کوئی طوفان آئینے میں

زندہ حقیقتوں کی ہوتی ہے پردہ پوشی
پلتی ہے جب رعونت نادان آئینے میں

ہو روشنی کہ ظلمت صحرا ہو یا سمندر
ہوتا ہے زندگی کا عرفان آئینے میں

فرحت عباس شاہ

دنیائے غزل میں فرحت عباس شاہ کسی اضافی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ وہ نوجوان نسل کے نمائندہ اور مقبول ترین شاعر پکارے اور لکھے جاتے ہیں۔

باقی احمد پوری نے "ہمارے شاعر" میں فرحت عباس شاہ کا جو تعارف پیش کیا ہے ہمارے الفاظ میں یہ ہے:

> "نام فرحت عباس شاہ ولدیت سید امیر حسین شاہ۔ فرحت ۱۵/نومبر ۱۹۶۴ء کو جھنگ صدر میں پیدا ہوئے۔ ایم ایس سی نفسیات (بنیادی) تک تعلیم حاصل کی۔ صحافت (الیکٹرانک میڈیا، مائکرو فنانس) کے شعبے سے بھی متعلق رہے۔ براڈکاسٹنگ، کالم نگاری، ٹی وی پروڈکشن اور کمپیئرنگ میں خصوصیت سے کام کیا اور نام کمایا، اُردو اور پنجابی شاعری، انتخاب اور تنقید و تجزیے پر مشتمل ان کی ۶۷ کتب طبع ہو چکی ہیں۔"

۱۳۹ صفحات پر مشتمل ان کا نعتیہ مجموعہ "تاجدارِ حرم" کے نام سے نعتیہ ادب میں موجود ہے اور رسولِ اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے ان کی والہانہ عقیدت و محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ نعتیہ مجموعہ ۲۰۰۲ء میں لاہور سے شائع ہوا۔

◆◆◆

نعت

اے دلِ مضطرب یہ کام سنبھال
میرے آقاؐ کا احترام سنبھال

اس میں کنجی ہے دو جہانوں کی
گر لیا تو نے اُن کا نام سنبھال

خدمتِ اقدسِ حضورؐ میں رکھ
اے فرشتے مرا سلام سنبھال

بیٹھ جا! جا کے پاؤں میں اُن کے
اور دنیا کا انتظام سنبھال

میرے آقاؐ کی راہ اپنا لے
ابتدا اور اختتام سنبھال

غزل

سرد سا ہاتھ ملانے والا
تو وہی ہے نہ زمانے والا

دکھ کی مزدوری مجھے کرنا ہے
ہے کوئی ہاتھ بٹانے والا

رات بھی آگے نہ جانے والی
ہجر بھی شور مچانے والا

شاید اک غم ہی فقط ہوتا ہے
عمر بھر ساتھ نبھانے والا

اب زمانہ ہی نہیں ہے فرحت
دیپ سے دیپ جلانے والا

فرقانؔ ادریسی

محمد فرقان ملک کا قلمی نام فرقان ادریسی ہے۔ فرقان ادریسی ضلع گیا (بہار انڈیا) میں حافظ محمد ادریس کے گھر 8 راگست 1943ء کو پیدا ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد انڈیا سے ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور کراچی کو اپنا جائے سکونت بنایا۔ تعلیم کا سلسلہ شروع کیا تو BA کرنے پر ختم ہوا۔ فرقان ادریسی نے فارغ التحصیل ہونے کے بعد ملازمت و تجارت کی اور پھر درس و تدریس سے وابستہ ہوئے۔

یکم ستمبر 1947ء میں والدین کے ہمراہ سابقہ مشرقی پاکستان پہلی ہجرت کر گئے اور مشرقی پاکستان کے معروف شہر سید پور کو جائے مسکن بنایا۔ سید پور کی شعری فضا بہت سازگار تھی جس میں بے شمار ادیب و شاعر سانس لے رہے تھے۔ سید پور کے مسلم ہائی اسکول سے میٹرک پاس کرنے کے بعد فرقان ادریسی قائداعظم کالج میں زیرِ تعلیم ہوئے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب ان کے والد اس دارِفانی کو خیرباد کہہ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ 1959ء میں فرقان ادریسی ڈھاکا آ گئے جس کی وجہ سے فی الحال شاعری اور تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا مگر ڈھاکا میں یہ سلسلہ پھر سے شروع ہوا تو BA کا امتحان پاس کر لیا۔

1966ء سے دوبارہ ڈھاکا کی ادبی محفلوں میں شرکت کرنے لگے اور حافظ دہلوی کی شاگردی میں قدم رکھا اور حلقۂ فکر و دانش میں شامل ہو گئے۔ سقوطِ ڈھاکا میں سب کچھ ختم ہو گیا اور فرقان ادریسی کو قید کر لیا گیا، رہائی ملی اور زندگی بحال ہوئی تو دوبارہ سرگرمیوں کا آغاز کیا اور ایک

شعری مجموعہ بنام "نجم و شرر" زیورِ طباعت سے آراستہ کر دیا، اس کے بعد دوسری ہجرت کا کرب سہہ کر فرقان ادریسی پاکستان آ گئے اور کراچی کو اپنا مسکن بنایا۔ یہاں فرقان ادریسی کا نعتیہ مجموعۂ کلام "نعمتِ عظمیٰ" 2013ء میں زیرِ اہتمام حلقۂ فکر و دانش کراچی سے شائع ہوا جس کا ہدیہ 200 روپے ہے۔

فرقان ادریسی لطیف نگر ناظم آباد کراچی میں رہائش پذیر ہیں۔ اُن کی ایک نعت نعمتِ عظمیٰ سے ملاحظہ ہو:

نعت

مہر و مہ میں ہے تہ تو وہ کہکشاں میں روشنی
جو ہے چشمِ نورِ حق، رحمت فشاں میں روشنی

دیدہ و دل نور سے معمور یکسر ہو گئے
آپ آئے تو در آئی حسنِ جاں میں روشنی

آپ ہیں بدرِ مدینہ، مہرِ مکہ، نورِ حق
آپ ہی کے دم سے ہے کون و مکاں میں روشنی

سبز گنبد رات دن چشمِ تصور میں رہے
تاکہ دیکھیں عمر بھر گلزارِ جاں میں روشنی

ساقیٔ کوثر کی چشمِ فیض کا کیا پوچھنا
جب بھی چاہا بھر دی جامِ ارغواں میں روشنی

کاش وابستہ وہ ہو جائے مری تقدیر سے
جو ہے رشکِ دو جہاں کے کشتگاں میں روشنی

روزِ محشر تک اسے فرقانؔ دنیا دیکھے گی
آپ نے بخشی ہے جو عمرِ رواں میں روشنی

غزل

شوق سے جاں واردوں اس پر جو خوش اخلاق ہے
جس کے طرزِ مہر کی کرتا ثنا آفاق ہے

زلزلے کا ہے نہ تو طوفان کا خدشہ کوئی
جانے پھر کیوں درد و غم میں قوم استغراق ہے

تہمت و غیبت برتنا دین و ایماں کا ہے قتل
اہلِ دل اہلِ نظر کو یہ گزرتا شاق ہے

عہد کرتے ہو کرو ایفا کا بھی لیکن ہو غم
عظمتِ انسانیت ہے خوبیٔ میثاق ہے

ہاتھ ملتے آئے دن وہ شخص ہے دیکھا گیا
طیش میں آ کر کیا اولاد کو جو عاق ہے

عزم استقلال محنت سعی پیہم کے بغیر
عمر بھر کوئی نہیں فرقان ہوتا طاق ہے

قتیل شفائی

(۱۹۱۹ء۔۲۰۰۰ء)

اورنگ زیب خان کا قلمی نام قتیل شفائی ہے۔ آپ کی ولادت ہری پور ہزارہ صوبہ سرحد میں ۲۴ردسمبر ۱۹۱۹ء کو ہوئی۔ فلمی نغمہ نگار کی حیثیت سے اُن کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ انھوں نے فلموں کے لیے سینکڑوں نغمے لکھے۔ ماہنامہ ''ادبِ لطیف'' لاہور کے مدیر رہے۔ ماہنامہ ''سنگِ میل'' پشاور سے منسلک رہے۔ ''رائٹرز گلڈز'' مغربی پاکستان کے سیکرٹری تھے۔

۱۹۹۴ء میں اُنھیں صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی سے نوازا گیا۔ اُن کی مطبوعہ شعری کتب ''ہریالی جگر''، ''جلترنگ''، ''روزن''، ''گھنگھرو''، ''جھومر''، ''مطربہ''، ''گفتگو''، ''سمندر میں سیڑھی'' ہیں۔ اُن کے نعتیہ مجموعے کا نام ''نذرانہ'' ہے۔ جسے صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس مجموعے میں جو نعتیں ہیں اُنھوں نے انتہائی محبت وعقیدت کے ساتھ دورانِ علالت جب کہ وہ خود لکھنے سے قاصر تھے اپنی صاحب زادی کو املا لکھواتے رہے۔ اس مجموعے میں وہ ساری فکری باتیں آگئیں، جب انسان کسی منزل کی طرف رواں دواں ہوتا ہے اور فکر واحساس پر گزرنے والے حالات وواقعات کو شعری قالب میں چابک دستی سے ڈھالتا چلا جاتا ہے۔ شاعر محبت وعقیدت کے ایک ایسے ہالے میں گھر جاتا ہے، جیسے دل کے آبگینے چھلک پڑے ہوں اور قاری اس کے فکرو احساس کے ساتھ سفر کرنے لگتا ہے۔ قتیل شفائی کا انتقال ۱۱رجولائی ۲۰۰۰ء لاہور میں ہوا۔ کریم بلاک علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ ہماری تمام نیک دعائیں اُن کے ساتھ ہیں۔ اللہ اُن پر فضل وکرم کے دروازوں کو کشادہ فرمادے اور اس نعتیہ مجموعے کو اُن کے لیے ذریعۂ مغفرت بنادے۔ آمین

◆◆◆

نعت

رشک سے کیوں نہ تکے رفعتِ افلاک مجھے
لوگ کہتے ہیں غلامِ شہِ لولاکؐ مجھے

لب کشائی کی بھلا مجھ میں کہاں تھی جرأت
کر دیا ان کی عنایات نے بے باک مجھے

میرے ہر آئینۂ اشک میں ہے عکسِ نبیؐ
پیار پھر کیوں نہ کرے دیدۂ نم ناک مجھے

میں جو زندہ ہوں تو اس واسطے پیارے بطحا
اک نہ اک دن تو بلائے گی تری خاک مجھے

میں تو ہر رنگ میں آلودۂ عصیاں تھا قتیلؔ
بارشِ اشکِ ندامت نے کیا پاک مجھے

غزل

کیا عشق تھا، جو باعثِ رسوائی بن گیا
یارو تمام شہر تماشائی بن گیا

بن مانگے مل گئے مری آنکھوں کو رت جگے
میں جب سے ایک چاند کا شیدائی بن گیا

دیکھا جو اس کا دستِ حنائی قریب سے
احساس گونجتی ہوئی شہنائی بن گیا

برہم ہوا تھا میری کسی بات پر کوئی
وہ حادثہ ہی وجہِ شناسائی بن گیا

پایا نہ جب کسی میں بھی آوارگی کا شوق
صحرا سمٹ کے گوشۂ تنہائی بن گیا

کرتا رہا جو روز مجھے اس سے بد گماں
وہ شخص بھی اب اس کا تمنائی بن گیا

وہ تیری بھی تو پہلی محبت نہ تھی قتیلؔ
پھر کیا ہوا اگر کوئی ہرجائی بن گیا

قصرؔی کانپوری

(۱۹۱۳ء۔۱۹۹۱ء)

مطلوب حسین ۱۹۱۶ء میں کانپور میں پیدا ہوئے۔ سرکاری اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ ہائی اسکول کا امتحان ۱۹۳۶ء میں پاس کرنے کے بعد اُس زمانے کی ضرورت کے مطابق فوج میں بھرتی ہوگئے۔ کانپور میں احاطہ کمال خاں میں مولانا فضل الحسن حسرتؔ موہانی اور ابوالعلاء، ناطقؔ لکھنوی کے ہمسایہ رہے۔ جن کی وجہ سے یہاں شعر و ادب کی محفلیں جما کرتی تھیں۔ قصرؔی کانپوری نے اس ماحول سے شعوری طور پر اکتساب کیا۔ فکرِ شعر گوئی نے اُن کو ناطقؔ لکھنوی کی شاگردی اختیار کرنے پر مجبور کردیا۔

''قصرؔی تخلص اور کانپور کی نسبت سے لاحقہ کانپوری رہا۔ قصری کانپوری پاکستان میں وقار صدیقی، انور دہلوی کو بھی کلام دکھاتے رہے تھے۔ گاہ گاہ خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی سے بھی مشورہ سخن کرتے تھے بقول محسن اعظم ملیح آبادی قصری کانپوری نے شاعری میں بڑی محنت کی اور ایک اعلیٰ درجے کے شاعر بنے۔ ان کے کئی شاگرد خاصے مشہور ہیں جن میں ضیاالحسن ضیا بھی ہیں۔''

۱۹۵۰ء میں پاکستان ہجرت کی اور لیاقت آباد کراچی کو اپنا مستقر بنالیا۔ یہاں کئی شعراء قیام پذیر تھے اور آئے دن شعری نشستیں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ تاہم معاشی جدوجہد بھی اُس کی راہ میں حائل ہوجایا کرتی تھی۔ بہ قول حسرتؔ موہانی مشقِ سخن کے ساتھ چکی کی مشقت یعنی وسائلِ روزگار پر بھی انحصار کرنا پڑا اور گاہے گاہے شعر و ادب کی محفلوں میں شرکت ہوتی رہی۔ ۱۹۷۱ء میں قصرؔی

کے سو، اشعار کا ایک انتخاب شائع ہوا۔ جس میں جوشؔ ملیح آبادی (ترقی اردو بورڈ کے مشیر)، پروفیسر ممتاز حسین استاد اُردو کالج، ماہ نامہ "نقش" کراچی کے مدیر جناب شمس زبیری کے تعارفی کلمات اور آراء بھی تھیں۔ قطعات و رباعیات کا ایک مجموعہ "نصف النہار" بھی ۱۹۷۱ء میں طبع ہوا۔

۱۹۷۸ء میں اُن کا پہلا شعری مجموعہ "آبشارِ فکر" منظرِ عام پر آیا۔ ۱۹۸۱ء میں نعتوں کا مجموعہ "نورازل" کے نام سے شائع ہو کر مقبولیت حاصل کرتا رہا۔ ۱۹۸۶ء میں رباعیات و قطعات کا دوسرا مجموعہ "عناصر" بھی شائع ہو گیا۔ "آبگینۂ احساس" کے عنوان سے ۱۹۸۸ء میں اُن کے دوسرے شعری اور تیسرے مجموعے "کارِ جنوں" کی ۱۹۹۱ء میں کراچی میں اشاعت ہوئی۔

قیصرؔ کانپور کا انتقال ۹ر جنوری ۱۹۹۱ء کو کراچی میں ہوا۔ "نورازل" نعتوں کے مجموعے کے تین ایڈیشن شائع ہوئے۔ اُن کی نعتوں میں نغمگی کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔

نعت

شعورِ فن جو دیا ہے تو یہ کمال بھی دے
کہ نعت لکھوں تو لفظوں کو خدوخال بھی دے

جو اُنؐ کی ذات سے وابستگی مسلّم ہے
تو اُن کی شان کے شایاں کوئی خیال بھی دے

کوئی خریدنا چاہے تو اے مرے معبود
مرے ضمیر کو انکار کی مجال بھی دے

اگر گدائی مدینے کی ہے مقدر میں
تو میرے ہاتھ میں اک کاسۂ سوال بھی دے

جو لمحے یادِ رسالت مآبؐ میں گزریں
اُنھیں پھر عہدِ رسالت کے ماہ و سال بھی دے

ابھی یہ گوشۂ مدحت ہے تشنۂ اظہار
جو اُنؐ کی عظمتیں سمجھے، وہی مثال بھی دے

دیا گیا ہے جو قیصرؔ کو منصبِ مدحت
تو اے خدا اُسے اسلوبِ عرضِ حال بھی دے

غزل

آپ کی نیچی نظر داد وفا ہو جیسے
میرا غم آپ نے محسوس کیا ہو جیسے

آج اک شخص نے یوں غور سے دیکھا مجھ کو
آئینے میں کوئی منہ دیکھ رہا ہو جیسے

اس قدر سہمی ہوئی ہے مرے دل کی بستی
اس علاقے میں کوئی قتل ہوا ہو جیسے

یہ رعونت ، یہ تکبر ، یہ نگاہیں ، یہ مزاج
میرے ماحول میں ہر شخص خدا ہو جیسے

اس طرح دیکھ رہے ہیں مجھے دنیا والے
واقعی میں نے کوئی جرم کیا ہو جیسے

اس قدر آبلہ پا اتنا فسردہ قصرتی
دھوپ ہی دھوپ میں اک عمر چلا ہو جیسے

اُستاد قمؔر جلالوی

(۱۸۸۷ء.....۱۹۸۶ء)

مریضِ غم پہ اک ایسی بھی شام آتی ہے
کہ چارہ گر کو اُمیدِ سحر نہیں رہتی

اُن کی طرف سے ترکِ ملاقات ہوگئی
ہم جس سے ڈر رہے تھے وہی بات ہوگئی

دبا کے قبر میں سب چل دیے دُعا نہ سلام
ذرا سی دیر میں کیا ہو گیا زمانے کو

ڈاکٹر قمر عباس نے لکھا ہے کہ ''غیاث الدین بلبن کے دور میں جلال الدین خلجی نے ایک چھوٹا سا قصبہ آباد کیا تو اس کا نام جلالی پڑ گیا۔ یوپی (بھارت) کے ضلع علی گڑھ میں واقع اس قدیم علاقے کی نمایاں شناخت ایک جامع مسجد ہے.....الخ''۔

قصبے کا نام ''جلالی'' نہیں بلکہ ''جلال'' ہے۔ اس کے رہنے والے ''جلالی'' کہلائے۔

۱۸۸۷ء میں غلام حسین سید کے گھر میں سید محمد حسین قمر جلالوی ضلع علی گڑھ کے قصبہ جلال میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد زمین دار تھے۔ قمر جلالوی نے عربی اور فارسی کی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ قصبہ جلال کا لاحقہ ان کے نام کا جزو بن گیا۔ اسی مناسبت سے انہیں قمر جلالوی کہا جاتا

تھا۔ قمر جلالوی بنیادی طور پر غزل کے شاعر تھے۔ ابتدا میں علی گڑھ کے مشاعروں میں شریک ہوتے رہے۔ حضرت امیر مینائی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ ۱۹۰۱ء جس وقت امیر مینائی کا سانحہ ارتحال ہوا قمر جلالوی کی عمر ۱۴ سال کے قریب تھی۔ یعنی انہیں اپنے استاد کے آخری دور کا شاگرد ہونے کا اعزاز ملا۔

> ''مگر خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی نے امیر مینائی سے تلمذ کی تردید اپنے ایک مضمون میں کی ہے جو رسالہ عالمی رنگ ادب میں شائع ہوا ہے۔ وہ مضمون مزید معلومات فراہم کرتا ہے اور قمر صاحب کے کلام پر نقد و نظر ہے اور لکھا کہ وہ سہل ممتنع کے بڑے شاعر تھے روایتی انداز فکر تھا ان کا اسلوب زبان کی شائستگی ہے۔''

قمر جلالوی کراچی میں استاد قمر جلالوی کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ کراچی میں ان کی زندگی کا بڑا حصہ گزرا۔ سادہ طرز حیات، خوش مزاجی، ان کے رکھ رکھاؤ اور طبیعت کا حصہ تھی۔ ان کے دور میں عوام کے ساتھ سرکاری طور پر بھی حقیقی شاعروں اور فن کاروں کی سرپرستی کی جاتی تھی۔ اس لیے ان کے لیے حکومت پاکستان نے باقاعدہ وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔ جس کے باعث انہیں ملازمت کے بکھیڑے میں پڑنا نہیں پڑا۔ اور ان کی شاعری سے لوگ استفادہ کرتے رہے۔ ''رشکِ قمر'' ''اوجِ قمر'' ''تجلیاتِ قمر'' وغیرہ ان کے شعری مجموعے ہیں۔ جبکہ ''غمِ جاوداں'' اور ''عقیدتِ جاوداں'' دو مجموعوں میں مذہبی شاعری اور نعتیہ کلام طبع ہوا۔ ان کی نعتوں میں عقیدت و محبت کی دنیا دیکھنے میں آتی ہے۔ ۲۴ر اکتوبر ۱۹۶۸ء کو کراچی کی ادبی انجمنوں کو سوگوار کر گئے۔ قمر جلالوی کی وفات پر شعر و ادب کے شیدائی افسردہ تھے۔ کراچی میں ان کے نمایاں شاگردوں میں اعجاز رحمانی، پُرنم الٰہ آبادی، قضا جلالوی، عطاء اللہ بخار (علیگ)، اور علیم محشر چھتاروی شامل ہیں۔

ڈاکٹر شہزاد احمد اپنے مضمون ''نعتیہ کلیات کی روایت۔ ایک مطالعاتی جائزہ'' (مطبوعہ نعت رنگ پچیسواں شمارہ صفحہ ۳۶۵) میں تذکرہ شعرائے امروہہ کے مرتب نقوش نقوی کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

"نقوش نقوی کا مرتب کردہ تذکرہ "شعرائے امروہہ" (مطبوعہ رائٹرز بک فاؤنڈیشن امروہہ سوسائٹی کراچی ۲۰۰۸ء) ۱۳۵۲ صفحات پر شائع ہوا۔ اس تذکرے میں تذکرہ نگار نے اپنے عقیدے سے تعلق رکھنے والے اور اپنے واقف کاروں کا دل کھول کر تذکرہ لکھا ہے۔ دیگر حضرات کے تعارف میں وسعتِ قلبی اور معلومات کا فقدان ہے......"۔

ڈاکٹر شہزاد احمد نے یہ بات "رؤف امروہوی" کے حوالے سے لکھی ہے کہ نقوش نقوی نے دوسروں کے مقابلے میں "رؤف امروہوی" کا تذکرہ مختصر اور نامکمل لکھا ہے۔ اور یہ کام جان بوجھ کر کیا۔ اس قسم کی باتیں لکھنے کی نہیں ہوتیں۔ اور ایک طرح مذہبی منافرت کو ہوا دینے کے زمرے میں آتی ہیں۔ لیکن اس سے زیادہ بڑا جرم یہ ہے کہ ایک محقق "اردو نعت پاکستان میں" کے موضوع پر مقالہ لکھ رہا ہو اور قمر جلالوی جیسے صفِ اوّل کے استاد شاعر کو اس میں تکلفاً بھی شامل نہ کرے۔

شہر کراچی میں جو بھی کام دینی ادب کے حوالے سے ہو، یا نعتیہ ادب کے حوالے سے، یا اردو ادب کے حوالے سے یا رثائی ادب کے حوالے سے ہو، ان میں اگر استاد قمر جلالوی کی شمولیت نہیں ہے تو وہ کام تحقیقی، علمی اور ادبی حوالے سے مکمل تصور نہیں کیا جائے گا۔

نعت

مطمئن بیٹھے ہوئے ہیں حشر کے انجام پر
بخش دے گا بخشنے والا تمہارے نام پر

اور کیا لو گے سند پیغمبری کے کام پر
ختم کروالی نبوت تم نے اپنے نام پر

پوچھتا تھا حضرت آدم تمہیں پڑھنے کے بعد
عرش پر یہ نام ہے یا عرش ہے اس نام پر

نظم پیغمبر تو دیکھو حشر تک کا انتظام
اک نہ اک موجود وقت آئے اگر اسلام پر

میرے ساغر کی تو اے ساقی الگ پہچان ہے
بادہ خوار مصطفیؐ لکھا ہوا ہے جام پر

کفر کی ظلمت مٹی یوں مصطفیؐ سے اے قمر
چاند غالب آ گیا جیسے سواد شام پر

غزل

مریضِ محبت انہیں کا فسانہ سناتا رہا دم نکلتے نکلتے
مگر ذکر شامِ الم کا جب آیا چراغِ سحر بجھ گیا جلتے جلتے

انہیں خط میں لکھا تھا دل مضطرب ہے جواب ان کا آیا محبت نہ کرتے
تمہیں دل لگانے کو کس نے کہا تھا بہل جائے گا دل بہلتے بہلتے

مجھے اپنے دل کی تو پروا نہیں ہے مگر ڈر رہا ہوں کہ بچپن کی ضد ہے
کہیں پائے نازک میں موچ آ نہ جائے دلِ سخت جاں کو مسلتے مسلتے

بھلا کوئی وعدہ خلافی کی حد ہے حساب اپنے دل میں لگا کر تو سوچو
قیامت کا دن آ گیا رفتہ رفتہ ملاقات کا دن بدلتے بدلتے

ارادہ تھا ترکِ محبت کا لیکن فریبِ تبسم میں پھر آ گئے ہم
ابھی کھا کے ٹھوکر سنبھلنے نہ پائے کہ پھر کھائی ٹھوکر سنبھلتے سنبھلتے

بس اب صبر کر رہروِ راہِ الفت کہ تیرے مقدر میں منزل نہیں ہے
ادھر سامنے سر پہ شام آ رہی ہے ادھر پاؤں تھک جائیں گے چلتے چلتے

وہ مہمان میرے ہوئے بھی تو کب تک ہوئی شمع گل اور نہ ڈوبے ستارے
قمرؔ اس قدر ان کو جلدی تھی گھر کی کہ گھر چل دیے چاندنی ڈھلتے ڈھلتے

قمر وارثی

مقام فرخ آباد پیدا ہوئے۔ اُن کے اہلِ خانہ اٹاوہ کے میاں حاجی محمود شاہ صاحب وارثی
ے نسبت رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے وارثی کہلائے۔ قمر وارثی کی عمر دو سال تھی جب وہ پاکستان
آئے تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں والد محترم نے سکھر میں سکونت اختیار کی۔ ۱۹۶۶ء میں فاران
ہائی اسکول، سکھر سے قمر نے میٹرک پاس کیا اور ۱۹۶۸ء میں سکھر کے اسلامیہ کالج سے انٹر، بی اے،
اور ایم اے، کراچی یونیورسٹی سے پاس کیا۔

۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں ہماری قومی اور ملی یک جہتی سامنے آئی اور اسی تاریخی
موقع پر قمر وارثی کی زندگی میں بھی ایک انقلاب آیا۔ ان کا ذہن شعر گوئی کی طرف مائل ہوا۔

قمر وارثی کی نعتوں میں عصری مسائل کا ذکر ملتا ہے اور ایک خاص اثر پایا جاتا ہے۔ ''شمس
الضحیٰ'' ان کا مجموعۂ نعت ہے۔ آپ کی غزل کا مجموعہ ''میم تحریک'' اور سید ظہور احمد شاہ کی منقبتوں پر
مشتمل ایک کتاب ''عطائے ظہور'' بھی شائع ہو چکی ہے۔ آپ کا شمار کراچی کے معروف شعراء
میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر عزیز احسن قمر وارثی کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

'' قمر وارثی نے شمس الضحیٰ (۱۹۸۶ء)، کہف الوریٰ (۱۹۹۵ء) اور 'حرم سے حرم تک'
(۲۰۰۸) میں نعتیہ شاعری کا انوکھا تجربہ کیا ہے۔ انہوں نے طویل ردیفوں کو جزوِ ہنر بنایا ہے اور

اس خوبی کے ساتھ کہ نعت کا آہنگ مدح خیر الوریٰ کے شعری اور شرعی تقاضوں سے ہمکناری رہا:

نہیں رکھتے سرور و کیف کی حد مل کے آپس میں
کہ لب جس وقت کہتے ہیں محمد مل کے آپس میں

طویل ردیفوں کو جدید شعری منظر نامے کا حصہ بنانے کی جو کوشش عام شاعری کے دلدادہ شعرائے کرام نے کی اور جس خوبصورتی سے طویل ردیفوں کے استعمال کو عصری تقاضوں اور ادبی دھاروں سے ملایا اس کی مثالیں ہمیں احمد فراز کے یہاں بھی ملتی ہیں اور چند دیگر شعراء نے بھی اس ضمن میں جمال فن دکھایا ہے۔ قمر وارثی کی یہ کوشش ایک جداگانہ اور انتہائی درجہ مقدس صنف سخن' نعت' کے ضمن میں ہوئی ہے۔ کیا زمیں کیا آسماں میں اور چراغ جل کے آپس میں، چاندنی چاندنی کی کہکشاں کہکشاں' قلب وجاں کے دیئے کے دروازے کھلے وغیرہ ردیفوں کو ہنرمندی کے ساتھ نبھانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔''

(ادبیات اسلام آباد ص ۲۷۶)

شہزاد احمد کی کتاب ''ایک سو ایک پاکستانی نعت گو شعراء'' تذکرے میں قمر وارثی کا ذکر موجود نہیں ہے۔ ہر وہ شاعر جس کا نعتیہ ادب میں کوئی بڑا کردار ہے اور فروغ نعت کے لیے اس کی ذات ایک انجمن ہو ایسے لوگ شہزاد احمد کو ایک آنکھ نہیں بھاتے کیونکہ وہ نہیں چاہتے کہ میرے علاوہ کسی اور کا نام بلند ہو حالانکہ جو لوگ بھی اللہ کی رحمت کا ادراک رکھتے ہیں وہ اس کے حبیب کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور حبیبؐ کے ذکر کو بلند کرنے میں صبح شام لگے ہوئے ہیں۔ قمر وارثی ایسے ہی لوگوں میں ہیں جن کی ماہانہ نعتیہ محافل اور شعراء کا اجتماع ایک ایسی تاریخ رقم کر رہا ہے جس کے حوالے سے آئندہ ہماری نسلوں کو آگاہی ملے گی اور اس شہر کے ادبی نقوش کو واضح کرنے میں مدد ملے گی۔ اللہ قمر وارثی کی عمر میں برکت نصیب فرمائے اور ان کی سعی کو قبول فرمائے۔ خاکسار کے لیے ان کی ذات ہمیشہ ہی محبت وشفقت کی علامت رہی ہے۔

قمر وارثی نعتیہ شعر وادب میں اپنی شاعری کے علاوہ اپنی تنظیم ''دبستان وارثیہ'' کے زیر اہتمام ردیفی مشاعروں کے ذریعہ بھی خدمات کا ایک وقیع سلسلہ رکھتے ہیں۔ جس کی ایک جھلک جناب صبیح رحمانی کے نعت رنگ کے شمارہ ۲۵ میں اس طرح نظر آتی ہے:

''بیس سال میں شائع شدہ ردیفی حمدیہ اور نعتیہ کتب کی تفصیل ایک نظر میں:۔
مالکِ ارض وسما (حمد) ۱۹۹۹ء' ربِ خیر البشر (حمد) ۲۰۰۴ء' قادر و قیوم ذات (حمد) ۲۰۰۹ء' عرفان رب کائنات (حمد) ۲۰۱۴ء' خوشبو سے آسمان تک (نعت) ۱۹۹۵ء، جلوے حیات آراستہ (نعت) ۱۹۹۶ء' آب و تاب رنگ و نور (نعت) ۱۹۹۷ء، جمال اندر جمال (نعت) ۱۹۹۸ء مہکا مہکا حرف حرف (نعت) ۱۹۹۹ء، روشن گلیاں جھلمل کوچے (نعت) ۲۰۰۰ء، کرم' عطا' شرف نصیب (نعت) ۲۰۰۱ء، وابستگی (نعت) ۲۰۰۲ء، رفعتیں (نعت) ۲۰۰۳ء، منزل آگہی (نعت) ۲۰۰۴ء، تجلیاں (نعت) ۲۰۰۵ء، آپ سراپا نور (نعت) ۲۰۰۶ء' کیف آفریں تابانیاں (نعت) ۲۰۰۷ء' شگفتہ شگفتہ (نعت) ۲۰۰۸ء، سرمایہ روحانیت (نعت) ۲۰۰۹ء، مقدس نکہتیں (نعت) ۲۰۱۰ء' شعور بیکراں (نعت) ۲۰۱۱ء' خزینہ الہام (نعت) ۲۰۱۲ء، گلشن جود و کرم (نعت) ۲۰۱۳ء نورانی حقیقت (نعت) ۲۰۱۴ء۔''

ان تمام کاموں پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قمر وارثی اپنی ذات میں انجمن اور ادارہ ہیں۔ فروغ نعت کے لیے مسلسل جدو جہد کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو بار آور بنائے اور ان کی عمر میں برکت نصیب کرے۔

ایسے محبت کرنے والے انسان کم کم ہی نظر آتے ہیں۔

نعت

اس اعتقاد پہ ہم اعتماد رکھتے ہیں
حضورؐ اپنے غلاموں کو یاد رکھتے ہیں

عجیب غم ہے، غمِ مصطفیٰؐ کہ ہم جیسے
ہزار غم ہوں مگر دل کو شاد رکھتے ہیں

وہی ہیں واقفِ مفہومِ اتباعِ رسولؐ
خلافِ نفس جو عزمِ جہاد رکھتے ہیں

رواں ہیں اشک بہ حسنِ خیالِ شاہِ اُممؐ
یہ چشم و دل بھی عجب اتحاد رکھتے ہیں

درِ نبیؐ سے وہ رکھتے ہیں کیوں کرم کی اُمید
جو قول و فعل میں اپنے تضاد رکھتے ہیں

وہ زیرِ سایۂ دامانِ مصطفیٰؐ ہوں گے
قمرؔ جو پاسِ حقوق العباد رکھتے ہیں

غزل

نہ گھر نہ سایۂ دیوار و در میں آتا ہے
سفر کا لطف تو رہ کر سفر میں آتا ہے

جب اہلِ شوق پہنچتے ہیں تا بہ حد جنوں
کمال تب کہیں دستِ ہنر میں آتا ہے

نہ صرف پھول ہی فکرِ نمو سے کھلتے ہیں
غذا ملے تو ثمر بھی شجر میں آتا ہے

بہت کٹھن ہے سمجھنا کہ ایک آنسو بھی
کہاں سے کرکے سفر چشمِ تر میں آتا ہے

جمالِ چہرہ کردار کا ہے یہ اعجاز!
وگرنہ کون کسی کی نظر میں آتا ہے

دلوں کی ہم نفسی چاہتی ہے عمر کہاں
یہ انقلاب تو بس لمحہ بھر میں آتا ہے

قمر وہ لطف اٹھاتا ہے معنویت کا
جو حرف دامنِ فکر و نظر میں آتا ہے

قمر ہاشمی

(۱۹۲۴ء......۱۹۹۴ء)

خانوادۂ سید شہید احمد بریلوی (بالاکوٹ) سے نسبت خصوصی رکھنے والے معروف شاعر سید قمر ہاشمی ۲ر فروری ۱۹۲۴ء کو راجستھان کی ریاست ٹونک میں پیدا ہوئے۔ قمر ہاشمی کا اصلی نام سید اسماعیل جبکہ قمر تخلص قمرؔ ہے۔ ان کے والد مولوی حکیم سید احمد ہاشمی برقؔ اپنے دور کے ایک بڑے جید عالم دین اور نبض شناس تھے۔ انہیں بے شمار احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم زبانی یاد تھیں۔

قمر ہاشمی نے ابتداء میں عربی و فارسی زبانوں میں تحصیل علم کی۔ سید احمد ہاشمی برقؔ مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز تھے۔ ان کا تبادلہ اٹاوہ اور پھر گوالیار کی دیوانی (عدالت) میں ہوا۔ سو قمر ہاشمی بھی اٹاوہ گئے جہاں سے انہوں نے انگریزی اسکول سے تعلیم حاصل کی۔

اپنے برادر بزرگ سید عبداللہ ہاشمی کے علی گڑھ میں گریجویشن کے دور میں علی گڑھ میں مقیم رہے اور میٹرک کیا۔ انٹرمیڈیٹ اور منشی فاضل کے امتحانات پنجاب یونی ورسٹی کے تحت پاس کیے۔ علی گڑھ سے دونوں بھائی کانپور آئے اور یہاں قمر ہاشمی نے سینٹرل آرڈیننس ڈپوٹ (سی۔او۔ڈی) میں ملازمت کی ان کے برادر بزرگ سالک ہاشمی، بی اے (علیگ) ایک مقامی ٹرانسپورٹ کمپنی میں اکاؤنٹس کلرک اور پھر آگرہ یونی ورسٹی سے ایل ایل بی کر کے درس و تدریس سے وابستہ ہو گئے۔ دونوں بھائیوں کے مراسم وہاں موجود مولانا حسرت موہانی، علامہ ناطق لکھنوی، حلیم مسلم کالج کے استاد پروفیسر اویس ادیب، ابوالخیر کشفی، اشتیاق اظہر، مولانا اسماعیل ذبیح اور سرشار صدیقی سے رہے۔ سالک نے حسرت موہانی سے تلمذ حاصل کیا۔ قمر ہاشمی نے ٹونک میں قیام کے دوران اختر شیرانی سے مشورۂ سخن کیا۔ وہ خود کو اختر شیرانی کا شاگرد کہا کرتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد قمر ہاشمی اپنے بھائیوں کے ساتھ پاکستان آئے۔ ٹنڈو آدم میں راجستھان کے مختلف

علاقوں ٹونک، سرونج، جے پور، شیخاواٹی، وغیرہ کے خاندان مقیم تھے۔ یہ لوگ بھی وہاں بس گئے اور قمر ہاشمی نے سرسید ماڈل ہائی اسکول میں ٹیچر کی نوکری کر لی۔ راجستھان کے ڈاکٹر انصاری آج بھی وہاں پر مقیم ہیں۔

کراچی آمد کے بعد سید قمر ہاشمی ڈان اردو کراچی میں سب ایڈیٹر رہے۔ ان کے ساتھ میرٹھ کے فضل صدیقی (بانی مدیر رسالہ ''آج کل'') اور نبی باغ کالج کے پروفیسر خواجہ آشکار حسین وفا بھی تھے۔ ۱۹۵۲ء میں حکیم محمد سعید کے ادارے ہمدرد پاکستان کے شعبۂ مطبوعات سے وابستہ ہوئے۔ ان کے ہمراہ مسعود احمد برکاتی، کوکب جمیل، احمد خان خلیل، حکیم نثار احمد علوی کاکوروی (مصنف شب چراغ) اور احمد ہمدانی وغیرہ بھی تھے۔ اشتہارات کا اسکرپٹ، ہمدرد نونہال کے مضامین خصوصاً نظموں کی جانچ پرکھ، ہمدرد خبرنامے کے نائب مدیر رہے۔ ''دانائی کا آفتاب لینن، ہمہ رنگ و نغمہ، انسانِ رفتگاں کے نوحے، تماشا طلب، آزار'' اور گوتم بدھ کی منظوم سوانح ''نروان'' ان کی فکری و شعری کاوشوں کے طور پر عوام و خواص میں مقبول ہیں۔ ۱۶ر جون ۱۹۹۶ء کو گلستانِ جوہر میں وفات پائی اور محمد شاہ قبرستان نارتھ کراچی میں تدفین ہوئی۔

سید قمر ہاشمی نے طویل نعتیہ نظم ''مرسلِ آخر'' میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی محبت و عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ قمر ہاشمی بیک وقت ایک فقیر اور مجاہد خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ نوعمری سے ہی انجمن ترقی پسند مصنفین میں شامل رہے۔ ۱۹۴۵ء بھوپال کانفرنس میں کرشن چندر، ابراہیم جلیس، رفعت سروش، صہبا لکھنوی، سجاد ظہیر وغیرہ کے ساتھ شریک ہوئے اس لیے انہوں نے اس دور میں اپنی فکر کا محور لینن اور مہاتما بدھ کو بنالیا تھا۔ تاہم بعد میں عمرہ کی سعادت حاصل کی اور تہجد گزار ہو گئے تھے۔

نعت

دنیا میں نہیں جو بھی طلب گارِ محمدؐ
بند اُس پہ ہیں عقبیٰ میں بھی اسرارِ محمدؐ

اللہ رے شیرینیٔ گفتارِ محمدؐ
فردوسِ نظر گیسوئے خم دارِ محمدؐ

کافور ہوئے تجھ سے ضلالت کے اندھیرے
اے صبحِ جہاں تابیِ افکارِ محمدؐ

ہاتھوں کی سعادت ہے کہ لکھتے رہیں اوصاف
اشرف ہے زباں کے لیے تذکارِ محمدؐ

اے ساقیٔ کوثر مری تسکین تمہیؐ ہو
یہ بندۂ عاصی تو ہے بے خوارِ محمدؐ

طیبہ تو شہیدؔ آپؐ کے آبا کا وطن ہے
آتا ہے کبھی یاد چمن زارِ محمدؐ

غزل

میں اپنے ہی بیدار خیالوں کا سفر ہوں
میں اپنے ہی خوابوں کے جزیرے کی سحر ہوں

ہر پاؤں کی تخلیق کا احساس ہے مجھ کو
ہر چند کہ میں سنگِ سرِ راہ گزر ہوں

ہر حرفِ تمنا میں ہے سرخی دل و جاں کی
ہر لفظ یہ کہتا ہے معانی کا شجر ہوں

ہر پل افقِ ذہن پہ تاباں ہے ترا نام
اس قوسِ قزح میں تری یادوں کا سفر ہوں

راتوں میں قمر مشعلِ جاں کہتی ہے مجھ سے
میں ظلمتِ ہستی میں اجالوں کی خبر ہوں

پروفیسر قیصر نجفی

قیام پاکستان سے پہلے اس علاقے میں تعلیمی اداروں کی کمی نمایاں طور پر محسوس کی جاتی تھی۔ تاہم محمد رمضان 1941ء کو ڈیرہ اسماعیل خان (صوبہ سرحد) میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے وقت ان کی عمر 6 سال کے قریب تھی۔ ان کی تمام تعلیم و تربیت میٹرک تا ایل ایل بی قیام پاکستان کے بعد قائم ہونے والے ڈیرہ اسماعیل خان، پشاور اور کراچی کے تعلیمی اداروں میں ہوئی ہے۔

محمد رمضان جو ادبی دنیا میں قیصر نجفی کے نام سے جانے جاتے ہیں درس و تدریس کے مقدس پیشے سے وابستہ ہیں۔ کراچی کے کئی تعلیمی اداروں میں تدریس کے فرائض انجام دیتے ہوئے تاحال وابستہ ہیں۔ کراچی سے شائع ہونے والے نعتیہ ادبی جریدے ''نعت رنگ'' میں بھرپور طریقے سے نقد و نظر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ ایک تازہ کار شاعر ہی نہیں بلکہ بے لاگ تنقید بھی ان کے قلم و قرطاس کا میدان ہے۔ ان کی علمی و ادبی موشگافیاں ان کی تحریروں سے جھلکتی ہیں۔ ''جنگ'' کے کالم نگار بھی ہیں۔

محمد رمضان قیصر نجفی کا نعتیہ مجموعہ ''رب آشنا'' 2002ء میں کراچی سے شائع ہوا جس نے نعتیہ ادب سے تعلق رکھنے والے قارئین کو متاثر کیا۔ اس کے مضامین فہم و فراست کے کئی در وا کرتے ہیں، زبان و بیان پر ان کو مکمل قدرت حاصل ہے، ان کا ایک اور شعری مجموعہ ''شہر جاناں'' (۱۹۹۸ء) میں شائع ہو چکا ہے۔

ان کو حاصل ہونے والے اعزازات کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ ''شہر جاناں'' کو نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد نے ۱۹۹۸ء کا بہترین شعری مجموعہ قرار دیا۔ ۲۰۰۱ء میں ان کے ایک مقالے ''فیض ایک رجحان ساز شاعر'' کو اکادمی ادبیات اور ڈائریکٹوریٹ جنرل فلمز اینڈ پبلیکشنز اسلام آباد نے اول قرار دیا اور انعام سے نوازا۔ نعتیہ مجموعہ ''رب آشنا'' کو آثار و افکار اکادمی کراچی نے ۲۰۰۲ء میں خصوصی انعام دیا۔ ۲۰۰۳ء میں ''ساحر کلچرل اکیڈمی'' لدھیانہ (انڈیا) نے جشن ساحر کے موقع پر اپنا شہرۂ آفاق ایوارڈ ''ادیب انٹرنیشنل ایوارڈ'' اور گولڈ میڈل سے نوازا۔

◆◆◆

نعت

قدرت کے نورِ فکر کا فیضان آپؐ ہیں
مصرعہ ہے کائنات تو دیوان آپؐ ہیں

کرتا ہے وقت جس کی تلاوت بصد نیاز
وہ رحلِ کائنات پہ قرآن آپؐ ہیں

ہے کوئی ماورائے زمان و مکاں اگر
تو بعدِ ربِّ کعبہ وہ انسان آپؐ ہیں

ہر صفحۂ زندگی کا عبارت ہے آپؐ سے
وجہِ وجودِ عالمِ امکان آپؐ ہیں

نوعِ بشر رہے گی صدا جس کے زیرِ بار
انسان پہ خدا کا وہ احسان آپؐ ہیں

قیصر سمجھ سکا ہے فقط اس قدر حضورؐ
اللہ کے وجود کی پہچان آپؐ ہیں

غزل

ہوشیار اے جہانِ خود آرا
رخ بدلتا ہے وقت کا دھارا

ہے کوئی جو مجھے کمک بھیجے
میں ہوں اپنے خلاف صف آرا

میں نے تو خود پہ فتح پائی ہے
ہیں خجل کیوں سکندر و دارا

مجھ کو گانا ہے زندگی کا گیت
لا ذرا موت اپنا اکتارا

جانے کس آسماں پہ ہوں جہاں
ٹوٹ جاتا ہے روز اک تارا

وہ لہو کس کے ہاتھ پہ ڈھونڈے
تو نے اے زندگی جسے مارا

اب چلے ہو سنوارنے قیصرؔ
کھیل ہی جب بگڑ گیا سارا

(۱۹۱۴.....۱۹۸۹)

حلقۂ اربابِ ذوق سے وابستہ اُس کے قیام سے تادمِ آخر اگر کسی ادیب یا شاعر کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ نام قیوم نظر کا ہے۔ ۷ر مارچ ۱۹۱۴ء کو پیدا ہونے والے عبدالقیوم کے والد کا نام خواجہ رحیم بخش تھا۔ پنجاب یونی ورسٹی سے اُردو ادب میں ایم اے کیا۔ مادری زبان و پنجابی میں بھی شاعری کرتے اور مضامین لکھتے رہے۔ کچھ عرصہ اکاؤنٹنٹ جنرل آفس لاہور میں ملازمت کی۔ پھر آرٹس کونسل کے ڈائریکٹر بنا دیئے گئے۔ پنجاب یونی ورسٹی کے پنجابی زبان و ادب کے شعبے سے بھی منسلک رہ کر درس و تدریس میں مشغول رہے۔ ۱۹۴۵ء میں غزلوں اور نظموں کا مجموعہ ''قندیل'' شائع ہوا ''پون جھکولے'' کے عنوان سے گیتوں کا مجموعہ ۱۹۴۶ء میں، نظمیں، غزلیں اور گیت ''سویرا'' نامی مجموعے میں ۱۹۵۴ء میں، ڈراموں کی کتاب ''آ نیڈا او بیرا'' ۱۹۵۵ء اور قومی نغموں کا مجموعہ ''زندہ ہے۔ لاہور'' ۱۹۶۶ء میں پاک بھارت جنگ کے پس منظر میں شائع ہوئے۔ قیوم نظر نے بے شمار حمدیہ و نعتیہ کلام بھی کہا۔ اُن کی نعتوں کا مجموعہ ''نعتِ مصطفیٰ'' (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) بھی ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ پنجابی میں شاعری کا مجموعہ ''توں تے میں'' (تُو اور میں) نثری کتابیں تراجم اور تنقیدی مطالعے پر مبنی کتابیں بھی شائع کیں۔ بچوں کے ادب کے حوالے سے بھی قیوم نظر کا نام شہرت کا حامل رہا ہے۔

''گلگلے'' ۱۹۷۷ء، ''بلبلے اور آلوچے'' ۱۹۷۸ء میں شائع ہونے والی ۱۹۸۰ء میں قومی کتاب کونسل کی حق دار انعامی کتاب قابلِ ذکر ہے۔ قیوم نظر ۲۳ر جون ۱۹۸۹ء کو انتقال کر گئے:

◆◆◆

نعت

میرا ہر عضو ڈھلا حمدِ خدا کہنے کو
دل کی دھڑکن ہے مگر صلِ علیٰ کہنے کو

کچھ اگر ہیں تو وہ قرآں کے حوالے ہی سے ہیں
لفظ ہیں ورنہ کہاں تیری ثنا کہنے کو

تیری پابوسی نے سینہ کیا روشن اس کا
تودۂ سنگ ہی تھا غارِ حرا کہنے کو

تیرے ہی خلق نے صحرا کو زبانِ حق دی
ایک اک ذرہ بنا کوہِ ندا کہنے کو

سایۂ گنبدِ خضرا کا ہے پرتو دراصل
نور افشاں ہے مدینے کی فضا کہنے کو

قُربِ محبوبِ خدا کی ہے تمنا دل میں
ہے اک شخص یہاں محوِ دعا کہنے کو

اُن کی نکہتوں کی اُس کے نفس میں خوشبو
رُوح پرور ہے ترے در کی ہوا کہنے کو

غزل

تیری نگہ سے ، تجھ کو خبر ہے ، کہ کیا ہوا
دل زندگی سے، بار دگر ، آشنا ہوا

اک اک قدم پہ اس کے ہوا سجدہ ریز میں
گزرا تھا جس جہاں کو کبھی روندتا ہوا

دیکھا تجھے تو آرزوؤں کا ہجوم تھا
پایا تجھے تو کچھ نہیں باقی رہا ہوا

دشتِ جنوں میں ریگِ رواں سے خبر ملی
پھرتا رہا ہے تُو بھی مجھے ڈھونڈتا ہوا

انسان دوستی کے تقاضوں کا سلسلہ
انسان دشمنی کی حدوں سے ملا ہوا

اقدار کے فریب میں اب آ چکا تھا
کشتی ڈبو گیا جو خدا ، ناخدا ہوا

پروفیسر کرم حیدری

(۱۹۱۸.....۱۹۸۴ء)

پروفیسر کرم حیدری ۱۲ راگست ۱۹۱۸ء کو ملک حکیم داد کے گھرانے میں تریٹ تحصیل مری میں پیدا ہوئے، گورنمنٹ ہائی اسکول سے مری میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ محکمہ تعلیم سے وابستہ رہتے ہوئے پرائیوٹ طور پر ایم اے اور ۱۹۳۹ء میں بی ٹی کی ڈگری لی۔ کرم حیدری علمی وادبی میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ کی توجہ فنِ موسیقی پر بھی رہی ہے، اور اس فن پر خاصی استعداد کے حامل رہے۔ "حکمتِ بے دار" اور "دوش وفردا" نظموں کے جب کہ "سایۂ گل" غزلوں کا مجموعہ ہے۔ سرکاری ملازمت سے تعلق کے باوجود نہ صرف خود تحریکِ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ اپنے شاگردوں کو بھی ترغیب دلاتے رہے۔

نظریۂ پاکستان، تحریکِ پاکستان اور قائداعظم کے حوالے سے اُن کی متعدد تصانیف کا ذکر ملتا ہے۔ "شعور فن" اُن کے مقالات کا مجموعہ، "صورتیں" خاکوں کی کتاب اور حمدیہ ونعتیہ شاعری کا مجموعہ "خوشبو" کے علاوہ واقعاتی افسانوں کا مجموعہ "نام بنام"، "داستان مری"، "پوٹھوہاری گیت" (تحقیق) "آزادیٔ موہوم"، "ملت کا پاسبان" پروفیسر کرم حیدری کی دیگر تصانیف ہیں۔ تحریکِ پاکستان گولڈ میڈل اور رائٹرز گلڈ ایوارڈ سے بھی اُنھیں نوازا جاچکا ہے۔

پروفیسر کرم حیدری اُردو، پنجابی اور پوٹھوہاری زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے، علم و ادب اور تحقیق کے ساتھ ہی قومی نوعیت کے مضامین اُن کی حب الوطنی پر دال ہیں۔

ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی اسلام آباد کے پروجیکٹ افسر پروفیسر کرم حیدری کا انتقال اسلام آباد میں ۳۱ رجنوری ۱۹۸۴ء کو ہوا تھا، اُن کی آخری آرام گاہ اسلام آباد میں ہے:

◆◆◆

نعت

پھر اسی نقش سے مانگ کر روشنی، بزمِ کون و مکاں کو سجایا گیا
علم و حکمت میں وہ غیر محدود بھی ظاہراً اُمیوں میں اُٹھایا گیا

اُسؐ کے افکار میں جاں فزا روشنی، اُس کی گفتار میں دلنشیں نغمگی
اُسؐ کے کردار میں ہے وہ پاکیزگی جس کو مقصودِ فطرت بنایا گیا

اُس کی شفقت ہے بے حد و بے انتہا اُس کی رحمت تخیل سے بھی ماورا
جو بھی عالم جہاں میں بنایا گیا، اُس کی رحمت سے اُس کو بسایا گیا

میرے احساس میں روشنی اُس کی ہے، میری آواز میں تازگی اُس کی ہے
میری اپنی نہیں زندگی اُسؐ کی ہے جس کو میرا نگہباں بنایا گیا

غزل

میں دشتِ زندگی کو چلا تھا نکھارنے
اک قہقہہ لگایا گزرتی بہار نے

گزرا ہوں جب سلگتے ہوئے نقش چھوڑتا
دیکھا ہے مجھ کو غور سے ہر ریگزار نے

میکش نے جامِ زہر ہی منہ سے لگا لیا
پاگل بنادیا جو نشے کے اُتار نے

انسان حدِ نور سے آگے نکل گیا
چھوڑا مگر نہ اس کو لہو کی پکار نے

ان مہ رخوں کی ہم سے جو یہ بے رخی رہی
جانا پڑے گا، چاند پہ کچھ دن گزارنے

میری سرشت میں تھی محبت کی پرورش
مجھ کو قلم دیا مرے پروردگار نے

بخشا ہے اپنے حسن کا پرتو مجھے کرم
فطرت کے ہر جمیل و حسیں شاہکار نے

کلیم عثمانی

(۱۹۲۸ء......۲۰۰۰ء)

احتشام الٰہی ۲۸/ فروری ۱۹۲۸ء کو دیو بند ضلع سہارنپور میں فضل الٰہی بیکل کے گھر پیدا ہوئے۔ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی آمدِ پاکستان کے وقت آپ کی عمر ۲۱ رسال کے قریب تھی۔

احتشام الٰہی کو ادبی دنیا میں کلیم عثمانی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ان کی وجہ شہرت ملی نغمہ نگاری فلمی نغمہ نگاری اور صحافتی خدمات بھی ہیں، لاہور کے علمی و مجلسی ماحول میں ایک جید ادیب کے طور پر اپنی شناخت رکھتے ہیں اور اپنے علمی و ادبی رسالہ ''لالہ رخ'' کے مدیر کے طور پر بھی جانے جاتے رہے ہیں۔

کلیم عثمانی غزل گو شاعر کے طور پر مقبول رہے ہیں اور ان کے مجموعہ غزل ''دیوار حرف'' کو تا دیر ادبی حلقوں میں پذیرائی حاصل رہی ہے۔ ہر مسلمان اپنی محبتوں اور عقیدتوں کے باب میں اضافہ چاہتا ہے یہ ہر مسلمان کا جزو ایمان بھی ہے، ان کے نعتیہ مجموعے ''ماہ حرا'' میں عقیدت مندی کی اظہار کے لیے خوبصورت پیرائے کو اپنایا گیا ہے جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے قصبہ دیو بند ضلع سہارنپور کے کلیم عثمانی ۲۸/ اگست ۲۰۰۰ء کو خاک لاہور میں پنہاں ہو گئے۔

◆◆◆

نعت

ہو جو توفیق تو بس نعتِ پیمبرؐ لکھوں
کوئی اور حرف نہ اِس صنف سے باہر لکھوں

مجھ سیاہ کار کو بھی جس نے دیا اذنِ سلام
کیوں نہ اُس ذات کو رحمت کا سمندر لکھوں

روز ہوتی ہے جہاں ایک نئی بارشِ نور
کیسے الفاظ میں اُس صبح کا منظر لکھوں

دولتِ صبر و قناعت جسے مل جائے یہاں
آج کے دور کا اُس شخص کو بوذرؓ لکھوں

سب جہانوں میں اُسی نام کا جلتا ہے چراغ
سب جہانوں کا انہیں ہادی و رہبرؐ لکھوں

خاک اُس در کی مری آنکھوں کا سرمہ ہے کلیم
کیوں نہ میں خود کو غنی اور تونگر لکھوں

غزل

ہے اگرچہ شہر میں اپنی شناسائی بہت
پھر بھی رہتا ہے ہمیں احساسِ تنہائی بہت

اب یہ سوچا ہے کہ اپنی ذات میں سمٹے رہیں
ہم نے کر کے دیکھ لی سب سے شناسائی بہت

منہ چھپا کر آستیں میں دیر تک روتے رہے
رات ڈھلتی چاندنی میں اس کی یاد آئی بہت

قطرہ قطرہ اشکِ غم آنکھوں سے آخر بہہ گئے
ہم نے پلکوں کی انہیں زنجیر پہنائی بہت

اپنا سایہ بھی جدا لگتا ہے اپنی ذات سے
ہم نے اس سے دل لگانے کی سزا پائی بہت

اب تو سیلِ درد تھم جائے سکوں دل کو ملے
زخمِ دل میں آ چکی ہے اب تو گہرائی بہت

میں تو جھونکا تھا اسیرِ دام کیا ہوتا کلیم
اس نے زلفوں کی مجھے زنجیر پہنائی بہت

کمال اظہر

نعت میں قدیم وجدید نعت کا خوبصورت امتزاج پیدا کرنے والے کمال اظہر دہلی کے ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جس کے بیشتر افراد شعروادب سے وابستہ تھے، جیسا کہ کمال اظہر کے ماموں ناصر جلالی بلند پایہ عالم دین ہونے کے ساتھ شاعر بھی ہیں۔ کمال اظہر کے نانا سید امیر حمزہ شید اتخلص کرتے تھے، خاندان کے ایک اور بزرگ شاعر کا نام سید صغیر الدین حسن خاور دہلوی ہے، کمال اظہر کی والدہ ماجدہ بھی پُر گو شاعرہ تھیں اور "عفت" تخلص کرتی تھیں، رشتے میں سب سے قریب ہونے کی وجہ سے ناصر جلالی کی شفقت اور تربیت نے کمال اظہر پر اپنے گہرے نقوش ثبت کیے ہیں۔

گریجویشن کی تکمیل کے بعد کمال اظہر کراچی چیمبر آف کامرس میں ملازم ہو گئے، کچھ عرصے بعد کویت چلے گئے تا حال کویت میں مقیم ہیں اور کویت میں یونیورسٹی کے میگزین سیکریٹری کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں، پاکستان آرٹس کونسل کویت کے صدر بھی ہیں۔

کمال اظہر کو شاعری ورثہ میں ملی، انہوں نے دیگر اصناف سخن میں طبع آزمائی کے ساتھ ساتھ نبی کریم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اپنی گہری اور سچی عقیدت کا اظہار کرنے کے لئے نعتیں لکھیں، ان کے نعتیہ مجموعے کا نام "حرفِ عقیدت" ہے۔ جس میں کمال اظہر کا سن ولادت تک تحریر نہیں کیا گیا۔

نعت

دلِ پژمردہ کھل اٹھا بہارِ زندگی آئی
شبِ فرقت میں جب گھونگھٹ اٹھا کر چاندنی آئی

مجھے تھی جستجو جس کی وہی تھا سامنے میرے
عقیدت نے قدم چومے جو دل میں آگہی آئی

لبِ کونین پہ تھا نعرۂ صلِّ علیٰ جاری
جب اِس دنیائے وحشت میں سواری آپ کی آئی

محبت شاہِ والاؐ کی برائی سے بچاتی ہے
یہی تبلیغ کرنے اہلِ حق کی زندگی آئی

لیا نامِ محمدؐ اور مشکل ہو گئی آساں
عقیدت اُن سے مجھ کو تھی تو میرے کام بھی آئی

سلام اُس ذاتِ اقدس پر کہ جس کے نور سے دنیا
چمک اٹھی ، دمک اٹھی ، ہنسی آئی ، خوشی آئی

تھی قسمت اوج پر اظہر مرے باغیچۂ دل کی
محمدؐ مصطفیٰ آئے تو دنیا کی خوشی آئی

غزل

ظلم پھیلا تو ضیا ساتھ چلی
درد اٹھا تو دوا ساتھ چلی

جب تری بزمِ طرب سے نکلے
ہر جگہ غم کی فضا ساتھ چلی

تلخیِ حال مٹانے کے لیے
میرے ماضی کی صدا ساتھ چلی

کچھ مرا شوق بنا راہنما
کچھ بزرگوں کی دعا ساتھ چلی

دل سے کس طرح نکالوں اظہر
اک تمنا جو سدا ساتھ چلی

گستاخ بخاری

گستاخ بخاری وہ واحد شاعر ہیں جن کے اب تک غزل، حمد، نعت اور سلام کے دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ ان اصناف میں صاحب دیوان شاعر ہونے کا اوّلین اعزاز گستاخ بخاری کو حاصل ہے۔ گستاخ بخاری کا خاندانی نام سید محمد منیر حسین شاہ ہے۔ جو ۲۱ رجنوری ۱۹۵۰ء کو جھنگ میں سید ولدار علی شاہ کے گھر پیدا ہوئے۔ جھنگ سے ہی ان کے تعلیمی سلسلے کا آغاز ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں گستاخ بخاری نے بی اے کیا اور ۱۹۷۱ء میں ان کی شادی ہوگئی۔ وہ بچپن ہی سے شاعری کی طرف راغب ہیں۔ ان کی متعدد کتب شائع ہو کر داد تحسین وصول کر چکی ہیں۔ جن میں ''ساونوں کے بعد''، سلکِ غزل، گردابِ گماں، اُسلوبِ بقا، طوافِ ذات، تحمید کردگار، مدیح ممدوحِ خدا، صلوا علی الحسین، صلوا علی الرسول، تفسیرِ لا الٰہ، شامل ہیں۔

گستاخ بخاری نہ صرف زود گو شاعر ہیں بلکہ پختہ کار بھی۔ انہوں نے اپنی شاعری میں مختلف تجربات بھی کیے ہیں۔ جیسے ایک ہی بحر میں پورا دیوان لکھ دینا، مختلف ردیف وقوافی میں زورِ سخن دکھانا اور نئے انداز کی شاعری کے نمونے پیش کرنا۔ آج کل بھی گستاخ بخاری دیگر کتب کی ترتیب میں مصروفِ عمل ہیں۔

نعت

صلِ علیٰ کہہ صلِ علیٰ
یہ ورد الگ یہ ذکر جدا

اللہ کے فرشتے پڑھتے ہیں
خود پڑھتا ہے ہر وقت خدا

انساں کی بخشش کی خاطر
یہ تحفہ ہے عرش سے اترا

جب لفظِ محمد ﷺ نطق پہ ہو
خوشبو کا رہتا ہے غلبہ

یہ سانس بڑی آوارہ تھی
پھر اس پہ اُنؐ کا کرم ہوا

محبوبؐ بھی ہیں مطلوبؐ بھی ہیں
عالم میں نہیں کوئی اُنؐ سا

گستاخ میں اُنؐ کے روضے کو
دن رات کبھی تکتا رہتا

غزل

تھا میرا حُسن اگر بے زبانیاں میری
جہاں میں پھیل گئیں کیوں کہانیاں میری

میں راکھ ہو کے بھی گھل مل گیا فضاؤں میں
ہوئیں نہ راکھ پہ آتش فشانیاں میری

ہر ایک چیز کی میں ست کا تعین ہوں
ہر ایک چیز کرے ترجمانیاں میری

فنا کے بعد بھی مجھ کو فنا کا خوف نہیں
خدا نے لکھی ہیں خود جاودانیاں میری

افق میں ڈوبتے سورج کی یہ تھی آہ و بکا
کوئی سنبھالتا یہ ضوفشانیاں میری

سبھی جہان ہیں میرے مکان کی تمثیل
مگر ہیں پاس مرے لامکانیاں میری

گوہر ملسیانی

میاں طفیل محمد گوہر ملسیانی ۱۵؍ اگست ۱۹۳۴ء کو چودھری صدر الدین کے گھر ملسیان میں تحصیل نکودر، ضلع جالندھر میں پیدا ہوئے۔ موصوف اُردو اور انگریزی میں ایم اے اور درس و تدریس کے شعبہ سے وابستہ ہیں۔ سیاسی اور فکری اعتبار سے تحریکِ اسلامی سے متاثر ہیں۔ آپ کی نعتوں میں فکری وسعتوں کے ساتھ عمل کی تحریک موجود ہے۔ آپ کی کتاب "مظہرِ نور" نعتیہ شاعری میں ایک اچھا اضافہ تصور کیا جاتا ہے۔ اِس کے علاوہ "خیمِ اعلیٰ" اور "عصرِ حاضر کے نعت گو شعراء" آپ کی اہم تصانیف ہیں۔

ڈاکٹر عاصی کرنالی "اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر" صفحہ ۴۰۰ پر رقم طراز ہیں:

"گوہر ملسیانی کی نعتیں جہاں ان کے جذبہ عقیدت و اطاعت کا مظہر ہیں۔ وہیں مقام نبوت، مقاصد نبوت، فضائل نبوت کے مبارک مقدس مضامین سے معمور ہیں۔ گوہر ملسیانی نے حضور اکرم کو تمام کائنات بشری کی ہدایت و راہبری کے طور پر پیش کیا ہے اور حضور کی تعلیمات مقدسہ اور سیرت طیبہ کے انوار سے اپنے اوراق نعت کو منور کیا ہے۔"

نعت

کھو جاؤں میں تو جا کے مدینے کی راہ میں
ڈھونڈوں سکون منزلِ گیتی پناہ میں

کُھل جائیں کائنات کے اُس پر بھی رموز
رکھے جو انقلابِ مدینہ نگاہ میں

تہذیبِ کائنات کے دھارے بدل دیے
کیا حسنِ التفات ہے تیریؐ نگاہ میں

روزِ حساب کیسے دکھائیں گے منہ تجھے
گزری ہے ساری عمر تو کارِ سیاہ میں

گوہرؔ کو تیرے دامنِ رحمت کی آس ہے
ورنہ حیات اُس کی تو گزری گناہ میں

غزل

آنکھ سے قائم رہا ہے روشنی کا سلسلہ
روز و شب ہے جگمگاتا زندگی کا سلسلہ

وقت کے ہر موڑ پر مل کر کسی گمنام سے
بن گیا ہے اک تعلق دوستی کا سلسلہ

بھول سکتا ہی نہیں ہوں حادثہ اس عہد کا
سامنے ہے ایک چشمِ شبنمی کا سلسلہ

فکر و فن کا نور ہے میرے تصور کی اساس
ضوفشاں ہے آفتابِ آگہی کا سلسلہ

سب تلاشِ سایۂ دیوار کے خواہاں ہوئے
دھوپ کے صحرا میں دیکھا دلبری کا سلسلہ

دشتِ وحشت میں رہا جو ساتھ میرے ہم قدم
یاد آتا ہے مجھے اس اجنبی کا سلسلہ

ہر طرف پھیلے ہیں گوہر حکمت کے دائرے
سب سے اچھا دائرہ ہے عاجزی کا سلسلہ

گوہرؔ ہوشیار پوری

(۱۹۳۰ء......۲۰۰۰ء)

محمد اشرف خان 15 / اپریل 1930ء میں حاجی نعمت اللہ خان کے گھر ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ 18 سال کی عمر میں پاکستان آئے۔ حصولِ پاکستان کے منظر نامے کو دیکھا کیا۔ قیامت خیز روح فرساں مناظر تھے۔ ان حالات میں سکھ کا سانس لینا بھی دشوار تھا۔ جبکہ علم و ادب سے تعلق رکھنا بھی ایک مشکل مرحلہ تھا۔

ہوشیار پور بھی غیر منقسم ہندوستان میں علمی و ادبی اور تاریخی پس منظر رکھتا ہے۔ اس علاقے کے کئی اصحاب شعر و ادب کی دنیا میں اپنا تشخص رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں محمد اشرف خان آزادی سے پہلے ہی شعر گوئی کی لذت سے آشنا ہو گئے تھے۔ فطری لگاؤ کے بغیر انسان کٹھن مراحل سے جب گزر رہا ہو شعر نہیں کہہ سکتا۔

محمد اشرف خان ادبی دنیا میں گوہر ہوشیار پوری کے نام سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔ ایک ذود گو شاعر ہیں، ان کے شعری اثاثے یہ ہیں۔ "پیرایہ"، "بساط"، "مٹی میں لہو کے تماشے"، "کچھ نہ کہہ کر بھی"، "جھرنا خوشبو کا"، "ہفت بہار"، "سن تو سہی" ان کتابوں میں ان ایام کا تذکرہ متغزلانہ انداز میں موجود ہے۔ ان کی غزلوں میں جہاں محبت کی کیفیت موجود ہے وہیں ایک جدوجہد کا درس بھی موجود ہے۔

ہر شاعر کی خواہش ہوتی ہے جہاں اس نے علم و حکمت کے موتی بکھیرے ہیں وہیں دینی ادب سے تعلق رکھنے والی صنف ادب نعت رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اظہار عقیدت کی فکر بھی دامن گیر ہو جاتی ہے اور وہ زندگی کی مہلت سے فائدے اٹھاتے ہوئے ختمی مرتبت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حضور نذرانہ محبت و عقیدت پیش کرتا ہے۔ گوہر ہوشیار پوری کا نعتیہ مجموعہ "آرزو حضوری کی" دینی ادب کے قارئین کے لیے ارمغانِ محبت ہے۔ محفل شعر و ادب کے رسیا ہر دل عزیز شاعر گوہر ہوشیار پوری 10 / دسمبر 2000ء میں خاک ساہیوال میں پنہاں ہو گئے اور علم و ادب سے وابستہ افراد کے لیے اپنے نعتیہ و غزلیہ مجموعے چھوڑ گئے۔

نعت

اشرف الانبیاء ، حضورؐ کی ذات
ہادیٔ حق نما ، حضورؐ کی ذات

نام بعد از خدا ، حضورؐ کا نام
ذات بعد از خدا ، حضورؐ کی ذات

آئینہ آئینہ وہ عکس وہ نقش
عکس کیا نقش کیا ، حضورؐ کی ذات

سارے اسمائے حق ، حضورؐ کے اسم
ہے وہ صلّی علیٰ ، حضورؐ کی ذات

سب درود و سلام اِن کے لئے
قبلۂ ہر دعا ، حضورؐ کی ذات

حُسن کی ابتدا ، خدا کا وجود
اور پھر انتہا ، حضورؐ کی ذات

نعت کا دم نہ تھا مگر گوہرؔ
پھول خوشبو ہوا ، حضورؐ کی ذات

غزل

ہے جو بھی جزا و سزا عطا ہو
ہونا ہے جو آج ۔ برملا ہو

اس دن بھی جو سر پہ دھوپ چمکی
جس دن پہ بہت فریفتہ ہو

اس رات بھی نیند اگر نہ آئی
جس رات پہ اس قدر فدا ہو

رنگوں میں وہی تو رنگ نکلا
جو تیری نظر میں جچ گیا ہو

پھولوں میں وہی تو پھول ٹھہرا
جو ترے سلام کو کھلا ہو

اک شخص خدا بنا ہوا ہے
کیا ہو جو یہی برا خدا ہو

سوگند مجھے غزل کی گوہر
میں نے جو زباں سے کچھ کہا ہو

لطیف آثر

۱۰ر ستمبر ۱۹۲۲ء کو لطیف آثر حاجی عیوض علی کے گھر پیدا ہوئے۔ والد کا تعلق سندیلہ ضلع ہردوئی سے تھا۔ اُن کے دادا احمد حسین ہردوئی کے ایک بڑے زمین دار تھے۔ لطیف آثر دھیمے لب ولہجہ کے پُر گو شاعر کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ اُن کے کلام میں اپنے عہد کی نمائندگی موجود ہے۔ غزلوں کی زمین میں نت نئے گل بُوٹے اُگانے والا شاعر اچانک حمدیہ اور نعتیہ شاعری کی طرف آجائے تو اُس کے احباب وقاری اس تبدیلی کو ایک خوش گوار واقعہ تصور کریں گے۔

''صحیفۂ نعت'' کی پہلی نعت ۲۵ر اکتوبر ۱۹۸۸ء کو لکھی گئی اور ۱۷ر جنوری ۱۹۸۹ء تک انہوں نے ایک سو چار نعتیں کہہ ڈالیں۔ لطیف آثر نے اپنے تخلیقی عمل میں ایک نئی منزل تلاش کی ہے۔ اپنی انفرادیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُنہوں نے حضور (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم) کے صفاتی اسماء کو ردیف کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس تجربہ میں وہ کہاں تک کام یاب ہوئے ہیں، اس بارے میں فی الوقت رائے دینی مشکل ہے۔ بہرحال یہ جدت پسندی نعتیہ شاعری میں قابلِ قدر ہے۔ آپ پیشے کے اعتبار سے انجینئر ہیں اور کراچی میں آباد ہیں:

نعت

ہے روشنی جس سے دو جہاں میں وہ رشکِ ماہِ تمام آیا
نثار ہوں جس پہ ہر دو عالم وہ آج عالی مقام آیا

تری محبت کا موجزن تھا جو چشمہ دل میں وہ کام آیا
میں جب بھی تیرے قریب پہنچا تو شور اُٹھا غلام آیا

صدائے حق کو بلند ہونا تھا ارضِ باطل پہ اک نہ اک دن
زمیں پہ اک خوش نگاہ آیا، زمیں پہ اک خوش کلام آیا

مدینے والے کے دم سے روشن ہے شمعِ توحید دو جہاں میں
زباں پہ بعد از خدا جب آیا مدینے والے کا نام آیا

زمین والوں سے تجھ کو برتر سمجھتے آئے ہیں عرش والے
زمیں پہ عرشِ بریں سے تجھ پر دُرود آیا، سلام آیا

غزل

ہوتا ہے طبیعت پر آئینہ گراں اکثر
دیتا ہے نگاہوں کو آئینہ زباں اکثر

ہمراز سمجھتے ہیں اکثر جنہیں وہ اپنا
راز آئینہ کرتی ہے خود ان کی زباں اکثر

آئینے کی عظمت کو کرتے ہیں بیاں شاید
یہ لوح و قلم اکثر یہ کون و مکاں اکثر

جب گلشن ہستی میں موسم ہو بہاروں کا
لگتا ہے نگاہوں کو آئینہ جواں اکثر

آئینے کی نظروں میں آئینہ آخر سب کچھ
آئینے کو کہتا ہوں افلاک زباں اکثر

ماجد خلیل

(۱۹۴۰.....۲۰۱۷)

عبدالماجد سیتاپوری یعنی برصغیر کے معروف شاعر ناصر کاسگنجوی کے معروف تلامذہ میں شمار ہونے والے ماجد خلیل نے یوپی بھارت کے شہر سیتاپور میں 20 مارچ 1940ء کو آنکھ کھولی تھی۔ان کے گھرانے کو ایک مذہبی وہبی خانوادے کی حیثیت حاصل رہی ہے شاید اسی لیے ماجد خلیل نے ''ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر'' کے مصداق نعت گوئی کو اپنے لیے شعار و انتخاب بنانے کو ترجیح دی۔

2001ء میں ماجد خلیل کا نعتیہ مجموعہ ''روشنی ہی روشنی'' شائع ہوا تھا۔2003ء میں وزیر اعظم پاکستان نے ماجد خلیل کے اس نعتیہ مجموعے ''روشنی روشنی'' کو ربیع الاول میں منعقدہ سیرت کانفرس میں قومی ایوارڈ سے نوازا تھا۔ماجد خلیل نے ماسٹرز کی ڈگری لینے کے بعد مختلف اداروں میں ملازمت کی جن میں نجی و سرکاری ملازمتیں دونوں ہی شامل رہی ہیں تاہم ان کی طویل ملازمت سعودی عرب ایئر لائن میں رہی جہاں سے وہ ریٹائرڈ ہوئے لڑکپن ہی سے شعروادب سے لگاؤ رکھنے والے ماجد خلیل نے پہلا باقاعدہ شاعر چودہ برس کی عمر میں کہا تھا۔میر تقی میر، مرزا غالب، مومن دہلوی وغیرہ کی شاعری کے مطالعے نے غزل کی طرف راغب کیا ان کا شمار برصغیر کے معروف شاعر حضرت ناصر کاسگنجوی مرحوم کے جملہ ارشد تلامذہ میں ہوتا ہے تاہم سعودی ائر لائن میں ملازم ہونے کے باعث بار بار مقامات مقدسہ کی زیارت کا موقع ملتا رہا خاندانی پس منظر میں اس کا دخل تھا بس طبع موزوں تو تھے ہی نعت کہنے لگے اور ایک مجموعے بھر نعتیں جمع ہو گئیں۔

ان کا کہنا ہے کہ ''نعت گوئی کی تمنا دل میں تھی اور حطیم میں اس کے لیے دعا بھی مانگی، شاید یہ اسی دعا کا اثر ہے۔'' ماجد خلیل، امیر مینائی اور محسن کاکوروی کی نعتیہ شاعری سے متاثر ہیں ان کے خیال میں نعت میں بامقصد اور بامعنی تنقید ضروری ہے۔ایسے شعراء کا احتساب ہونا چاہیے جو آنحضرتؐ کے مرتبے کا لحاظ نہیں کرتے اور حد سے تجاوز یا غلو کرتے ہیں رسول اللہ کی تعریف اور مقام کا تعین جس طرح قرآن کریم میں کیا گیا ہے اسی کو نعت میں قائم رکھنا چاہیے۔

نعت

ہو چکا ہے نعت گوئی کا اثر سایہ فگن
اب ہے میری ذات پر سچا ہنر سایہ فگن

کہہ رہی ہے آج بھی ہم سے حیاتِ مصطفیٰؐ
دھوپ میں تپ کر ہی ہوتا ہے شجر سایہ فگن

جو یقیں سے کر رہی ہیں سبز گنبد کا طواف
خود پہ اُن نظروں کو رکھا اے چشمِ تر سایہ فگن

ہے یہاں انسان کے سائے کو انساں سے گریز
اور حرم میں بام و در پر بام و در سایہ فگن

اُس کو اِس دنیا کا سورج کیا تپش پہنچائے گا
جس کے ذہن و دل پہ ہے محشر کا ڈر سایہ فگن

مدحتِ محبوبِ ربؐ کا حق ہے یہ ماجدؔ خلیل
فکر پر رکھیے حدیثِ معتبر سایہ فگن

غزل

ہے دشوار مگر یہ کاوش کرسکتا ہوں میں
لفظ سے لہجے کی پیمائش کرسکتا ہوں میں

کل بھی نہ تھی اظہار سے عاری اسلوب زباں
آج بھی ہر لہجے میں گزارش کرسکتا ہوں میں

فرصتِ شوق میسر ہو تو ایک ہی لمحے میں
پیار بھرے لفظوں کی بارش کرسکتا ہوں میں

اک پوری تحریر پہ جو بھاری ٹھہرے وہ لفظ
کرسکتا ہوں صرف، نگارش کرسکتا ہوں میں

آپ وفا کا عہد کریں تو آگے بات بڑھے
خود سر عقل سے دل کی سفارش کرسکتا ہوں میں

بنتے بنتے بن ہی گیا میں اتنا دنیا ساز
اب تو اپنے ساتھ بھی سازش کرسکتا ہوں میں

پوری ہو جانے کا یقیں ہو جائے تو اے ماجد
پہلی خواہش آخری خواہش کرسکتا ہوں میں

ماجد صدیقی

عاشق حسین سیال نور پور ہستی چکوال میں محمد خان سیال کے گھر یکم جون ۱۹۳۸ء کو پیدا ہوئے۔ ایم اے تک تعلیم حاصل کی اور شعبۂ تدریس کے معزز پیشے سے وابستہ رہے، مختلف کالجوں میں تدریس کے دوران بہ طور اُردو زبان وادب کے اُستاد اُن کا احترام بھی کیا گیا اور انہیں شہرت بھی ملی۔

عاشق حسین جنہیں ادبی دنیا ماجد صدیقی کے نام سے یاد کرتی ہے۔ اُردو اور پنجابی اظہار میں یکساں قدرت کے حامل رہے ہیں۔ اُن کے اُردو شاعری کے مجموعوں میں ''کروٹ کروٹ خوشبو''، ''شاد باد منزلِ مراد'' اور ''یہ انسان تماشہ تیں'' جب کہ پنجابی میں ''وتھاں ناپے ہتھ'' ''سونہاں پسندی اکھ''، ''رتجگاں''، ''میں کنے پانی وچ آں''، ''گنگے دیاں رمزاں''، ''بابے دا لبھا''، ''سچ سہاگ'' اور ''چج'' نامی شعری مجموعے اور نثری اظہار میں ''صورت احوال آنکہ، دیگر احوال آنکہ'' کے علاوہ پنجابی میں تراجم کی کتابوں کے عنوانات ''کلامِ شاہ مرادؒ''، ''کلامِ شاہ شریفؒ''، ''رات دی رات''، ''پرتاں'' اور ''راشا'' وغیرہ ہیں۔

ماجد صدیقی کا شمار معتبر شعراء کے زمرے میں کیا جاتا رہا ہے، اُن کے نعتیہ مجموعے ''سرو نور'' کا بڑا چرچا رہا۔ سیرت طیبہ کو اُنہوں نے نعت کا موضوع بنایا تاکہ قاری محض نعت سن کر جھومے نہیں بلکہ اُس کے سامنے ایک پیغام بھی آئے کہ ہمیں کس طرح سے عمل پیرا ہونا چاہیے۔ اُن کے اچھوتے انداز اور مخلصانہ کاوشوں کا ثمرہ قدرت سے یہ ملا کہ ''سرو نور'' (۱۹۷۶ء) جیسے نعتیہ مجموعے کے دو ایڈیشن شائع ہوئے اور اُن کی اسی طرح پذیرائی بھی ہوئی۔

ادبی تاریخ کا اپنا ایک انداز ہے جو انسانوں کو مغالطے میں ڈال سکتا ہے۔ ماجد سیال ادبی

دنیا میں صدیقی کہلاتے اور لکھتے ہیں۔ آئندہ اُن کی نسلوں کو سیال کے بجائے صدیقی کہا جائے گا کیا قلم قبیلے سے وابستہ افراد کے لیے یہ لمحۂ فکریہ نہیں ہے۔ کم از کم اہلِ قلم کو تو اس طرح اپنے حسب نسب سے لاپروائی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے کہ آپ کی ذاتی و خاندانی حیثیت کو اشتباہ کی نظر سے دیکھا جائے، ساتھ ہی شہروں کا لاحقہ اِس صورت میں ہرگز نہیں برتنا چاہیے جب کہ ہمارے آباو اجداد کا اس سے وطنی تعلق نہ رہا ہو۔

◆◆◆

نعت

افزوں اِسی سے روشنی قلب و نظر کی ہے
وہ نام تا ابد جو علامت سحر کی ہے

دیکھیں کہاں کہاں سے کتاب اُس کے لطف کی
تحریر ہر ورق پہ لکھی آب و زر کی ہے

ہے ربط کائنات وہی اُس کی ذات سے
جیسی وجودِ تخم سے نسبت شجر کی ہے

جس کی پہنچ فراز سے تھی ہر نشیب تک
عظمت اُسی سے دیدۂ بینائے تر کی ہے

ماجدؔ یہ سب کرشمۂ صدق و نگاہ ہے
جتنی بھی تیرے پاس لطافت ہنر کی ہے

غزل

دھوکا تھا ہر اک برگ پہ ٹوٹے ہوئے پر کا
وا جس کے لیے رہ گیا دامان شرر کا

میں اشک ہوں میں اوس کا قطرہ ہوں شرر ہوں
انداز ہم ہے مجھے پانی کے سفر کا

کروٹ سی بدلتا ہے اندھیرا تو اسے بھی
دے دیتے ہیں ہم سادہ منش نام سحر کا

تہمت سی لیے پھرتے ہیں صدیوں سے سر اپنے
رسوا ہے بہت نام یہاں اہلِ ہنر کا

قائم نہ رہا خاک سے جب رشتۂ جاں تو
بس دھول پتا پوچھنے آئی تھی شجر کا

جو شاہ کے کاندھوں کی وجاہت کا سبب ہے
دیکھو تو بھلا تاج ہے کس کاسئہ سر کا

اشکوں سے تپاں ہے کبھی آہوں سے خنک ہے
اک عمر سے ماجد یہی موسم ہے نگر کا

مولانا ماہر القادری

(۱۹۰۴.....۱۹۷۸)

منظور حسین ماہر القادری کیسر کلاں ضلع بلند شہر یوپی، بھارت میں ۱۹۰۴ء کو محمد معشوق علی خان کے گھر پیدا ہوئے۔ اُردو اور فارسی کی تعلیم اپنے والد محمد معشوق علی ظریف سے حاصل کی۔ ۱۹۲۴ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے میٹرک پاس کیا۔ انٹر تک آپ کی مروجہ تعلیم تھی۔

ماہر القادری برصغیر کی تقسیم سے پہلے "شاعرِ شباب" کہلاتے تھے۔ غزل گوئی میں منفرد لب و لہجہ کے شاعر تھے۔ کچھ عرصہ آپ حیدر آباد دکن میں مقیم رہے اور آپ کا تعلق مہاراجا کشن پرشاد وزیرِ اعظم ریاست حیدر آباد سے رہا۔ کچھ عرصہ بمبئی میں بھی قیام رہا اور فلموں کے لیے نغمے تخلیق کیے۔

قیامِ پاکستان کے بعد کراچی چلے آئے اور یہیں سے ایک نئے دَور کا آغاز کیا۔ ماہنامہ "فاران" کا اجراء ایک صحت مند ادبی رجحان کو جنم دینے کا سبب بنا۔ آپ میں نقد و تبصرہ کی صلاحیت بہ درجۂ اتم موجود تھی۔ آپ بے لاگ تبصرہ کرتے تھے۔ اپنے ہم عصروں سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے۔ آپ کو زبان و بیان کے محاسن و معائب واضح کرنے پر قدرت حاصل تھی۔

ماہر القادری کی نعتیہ شاعری ایک خاص نقطۂ نظر پر مرکوز دکھائی دیتی ہے۔ آپ کا نعتیہ کلام قرآن و حدیث کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ آپ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ "ذکرِ جمیل" آپ کا نعتیہ مجموعہ ہے۔ جو صحتِ فکر اور مضمونِ تازہ سے مملو ہے۔ ماہر ایک مشاعرہ میں شرکت کے لیے جدہ گئے ہوئے تھے کہ دورانِ مشاعرہ دل کا دورہ پڑا، اور ۱۲ مئی ۱۹۷۸ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ مکہ میں "جنت المعلیٰ" آپ کی آخری آرام گاہ ہے:

ڈاکٹر عاصی کرنالی ''اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر'' صفحہ ۳۸۶ پر تحریر کرتے ہیں:

''ماہر کی حمدوں میں اللہ کی توحید کا اقرار اور اس اقرار کی وسیلے سے عبدیت کامل کے سانچے میں ڈھلنے کا پیغام ملتا ہے۔ وہ ایک بندۂ خدا کی یہ ذمے داری سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی پوری کی پوری زندگی تعلیمات و احکام الٰہی کے اتباع میں گزارے اور کلی طور پر دینی و اخلاقی پیکر بن کر لوگوں کے لیے نمونہ تقلید ہو۔ ہم سب اللہ کے کرم کے محتاج ہیں، وہی ہمارا کارساز حقیقی ہے اس کے سوا کسی اور کا سہارا تکنا اور اسے مدد کے لیے پکارنا خلاف عقیدہ توحید ہے۔ نعت میں ماہر صاحب نے جہاں غزل کی ہیئت میں ثناگستری کا حق ادا کیا ہے۔ وہیں مختلف عنوانات کے تحت نعتیں کہہ کر سیرت رسولؐ کے متنوع پہلوؤں کو ہدایت انسانی کے لیے پیش کیا ہے۔ ان کے چند عنوانات یہ ہیں:

اسیران بدر، ظہور قدسی، حریت کاملہ کا مبلغ اعظم، جانوروں سے حسن سلوک، قال رسولؐ ماہر صاحب کی نعتوں میں جہاں ایک عاشق رسولؐ کے جذب و شوق کی داستانیں رقم ہیں وہیں ان نعتوں کے مقاصد میں سیرت نگاری اور اس کے وسیلے سے فرد اور اجتماع ملت کے جادۂ زندگی کے چراغ روشن کرتا ہے۔''

راقم کے دل میں یہ بات راسخ ہے کہ جو لوگ کسی بھی حوالے سے کوئی دینی کام کرتے ہیں ان کے معاملات زندگی دین کے پیرائے میں نظر آنے چاہئیں۔ کیونکہ آپ دین کے داعی بنے ہوئے ہیں اور داعی دین کا طرۂ امتیاز یہی ہے کہ اس کے اندر خاکساری بدرجۂ اتم موجود ہو۔

نعت

سلام اُس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی
سلام اُس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی

سلام اُس پر کہ اسرارِ محبت جس نے سمجھائے
سلام اُس پر کہ جس نے زخم کھا کر پھول برسائے

سلام اُس پر کہ جس نے خوں کے پیاسوں کو قبائیں دیں
سلام اُس پر کہ جس نے گالیاں سن کر دعائیں دیں

سلام اُس پر کہ دشمن کو حیاتِ جاوداں دے دی
سلام اُس پر کہ ابوسفیانؓ کو جس نے اماں دے دی

سلام اُس پر کہ جس کا ذکر ہے سارے صحائف میں
سلام اُس پر ہوا مجروح جو بازارِ طائف میں

سلام اُس پر کہ جس کے گھر میں چاندی تھی نہ سونا تھا
سلام اُس پر کہ ٹوٹا بوریا جس کا بچھونا تھا

غزل

ان کی خوشی یہی ہے تو اچھا یوں ہی سہی
الفت کا نام آج سے دیوانگی سہی

ہر چند نامراد ہوں پھر بھی ہوں کامیاب
کوشش تو کی ہے کوششِ برباد ہی سہی

غنچوں کے دل سے پوچھیے لطفِ شگفتگی
بادِ صبا پہ تہمتِ آوارگی سہی

جب چھڑ گئی ہے کاکلِ سب رنگ کی غزل
ایسے میں اک قصیدۂ رخسار بھی سہی

ماہؔر سے اجتناب نہ فرمائیں اہلِ دل
اچھوں کے ساتھ ایک گنہگار بھی سہی

مبارک مونگیری

(۱۹۱۴.....۱۹۸۸)

مبارک احمد صوبہ بہار (انڈیا) کے ضلع مونگیر میں ۱۰ر جنوری ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے تھے۔ مبارک تخلص اور مبارک مونگیری قلمی نام تھا۔ مونگیر کالجیٹ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا، اور ریلوے ڈیپارٹمنٹ میں ملازم ہوگئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد مشرقی پاکستان آگئے اور تبادلہ کروا کے چاٹگام میں مستقل قیام رکھا۔ مشرقی پاکستان کے سینئر شعراء میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ ایک مشاق و پختہ گو شاعر کی حیثیت سے اُنھوں نے مشرقی پاکستان اور پھر سقوطِ ڈھاکا کے بعد کراچی میں ادبی زندگی گزاری۔ نام و نمود اور صلہ کی پروا کیے بغیر شعری سفر جاری و ساری رکھا اور "صحرا سے گلستان تک" کا سفر کیا۔ مبارک مونگیری کو نظم اور غزل دونوں اصناف پر عبور حاصل رہا، منقبت بھی لکھی اور نعت کے حوالے سے بھی مبارک مونگیری کا نام ادبی حلقوں میں شناسا رہا ہے۔

بعد از مرگ اُن کا نعتیہ مجموعہ "ذکرِ ارفع" ۱۹۹۴ء میں طبع ہوا تھا جب کہ "صحرا سے گلستان تک" غزلوں کا مجموعہ اُن کی زندگی میں ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا تھا، سادہ لفظوں میں اپنے جذبے کا اظہار روایتی انداز میں کرتے ہوئے اُنھوں نے جو نعتیہ یا منقبتی کلام پیش کیا ہے، اُسے قبولیت عام کا درجہ مل گیا۔ مبارک مونگیری کا انتقال ۶ر اکتوبر ۱۹۸۸ء کو کراچی میں ہی ہوا تھا۔ اُن کے صاحب زادے اقبال مجیدی نے جو خود بھی بہ طور شاعر متعارف ہیں، اپنے والد کا کلام بھی شائع کروایا، اور بلدیہ سے ایک داخلی شارع بھی اُن کے نام پر منظور کروائی جو شادمان ٹاؤن نارتھ کراچی سے ناگن چورنگی تک واقع ہے اور شارع مبارک مونگیری کہلاتی ہے۔

نعت

کوئی کر سکے تیریؑ مدح کیا کہ نہ تاب ہی نہ مجال ہی
نہ رسا ہو ذہن بشر کبھی نہ گزر کناں ہو خیال ہی
تیرےؑ مرتبے سے ہی آشنا وہی رب عز و جلال ہی
کہ ہے رفعنا ذکرک پہ گواہ صدق مقال ہی

تجھے جس نے فخر رسلؑ کیا ہمیں جس نے خیر اُمم کیا
اسی بے نیام کی ہے قسم ہمیں بے نیاز الم کیا
لب مدعا بھی نہ وا ہوئے کہ گدا پہ تو نے کرم کیا
ابھی ہونٹ پر بھی نہ آ سکا ابھی ذہن میں تھا سوال ہی

تیری ذات عظمت کل نبی تیری شان شان تمام ہے
جہاں جبرئیلؑ کے پر جلیں وہ بلند تیرا مقام ہے
جو ہے بادشاہوں سے بھی سوا تیرےؑ آستاں کا غلام ہے
اُسے کہہ سکیں گے انسؓ ہی کچھ یہ بتا سکیں گے بلالؓ ہی

غزل

محرومیوں کا دل پہ آتا ہے کچھ اثر سا
چاہت کے نام سے بھی لگنے لگا ہے ڈر سا

اک آہ میں ڈھلی ہے روداد زندگانی!
عمرِ طویل کا ہے افسانہ مختصر سا

رخصت ہوا ہے دل سے ہر شوق رفتہ رفتہ
یہ شہرِ آرزو بھی بنتا چلا کھنڈر سا

آسودگیِ غم نے کتنا سرور بخشا
اپنے وجود سے بھی رہتا ہوں بے خبر سا

اندازِ پرسشِ غم تھا دلفریب کتنا
وہ دشمنِ تمنا لگتا تھا چارہ گر سا

اشکوں نے ضبطِ غم کی رکھی ہے لاج ہر دم
سو بار گھر کے آیا بادل مگر نہ برسا

راہِ حیات میں ہم تنہا نہیں مبارکؔ
اُن کا خیال ہر دم رہتا ہے ہمسفر سا

پروفیسر محسنؔ احسان

پشاور کا نام ذہن میں آتا ہے تو برصغیر کی مسلم تاریخ جانے کن کن حکمراں خاندانوں کو سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ غزنوی، غلامان، غوری، تغلق، خلجی، سوری، اور مغل کون سا ایسا فاتح ہے جسے سندھ کی تسخیر کے لیے پنجاب کو چھوڑ کر سرحد کو اپنی راہ داری نہ بنانا پڑا ہو، محمد بن قاسم کی وساطت سے اہالیانِ سندھ اور پاکستان کے لوگوں کو عربی زبان کا تحفہ ملا، پشاور نے کابل، غزنی، قندھار، ہرات، بلخ، بخارا، سمرقند و تاشقند اور اس سے بڑھ کر ترکوں، پٹھانوں، مغلوں کا امتزاج اور تہذیبی و ثقافتی قدروں سے ہمیں روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔

شاعری ہو یا تصوف، تہذیب ہو یا ثقافت علوم اسلامی سے مملو ورثہ و میراثِ علم برصغیر کے لوگوں کو ملتی چلی گئی۔" احسان الٰہی صوبہ سرحد کے دارالحکومت پشاور میں ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی طور پر حاصل کرنے کے بعد جامعہ پشاور سے انگریزی ادبیات میں ماسٹرز کی ڈگری لی اور گورنمنٹ اسلامیہ کالج پشاور میں درس و تدریس میں مصروف رہے۔ ایک اُردو شاعر کی حیثیت سے انھوں نے آج سے ۳۵ برس قبل خود کو منوا لیا تھا، دنیا بھر میں جہاں جہاں اُردو بولنے والے، سمجھنے والے ہیں انھیں (احسان الٰہی) کو ادبی نام "محسنؔ احسان" اور سرحد کے نمائندہ شاعر کی حیثیت سے بھی جانتے ہیں۔

ادب جہاں انسانوں کو انسان بنانے اور بننے میں معاون ثابت ہوا کرتا ہے، وہیں اپنی بات کو خوب صورت پیرائے میں بیان کرنے کی صلاحیت کو جلا بھی بخشتا ہے، محسنؔ احسان کی شاعری میں تمام انسانی اقدار کی موجودگی، انسانیت کا احترام اور معاشرتی ناہمواریوں کی نشان دہی نظر آتی ہے۔ دیگر غزل گو شعراء کی طرح محسنؔ احسان نے تواتر سے حمد و نعت اور سلام پر مبنی شاعری

ریڈیو، ٹی وی کے موضوعاتی مشاعروں میں پیش کی، ساتھ ہی اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں اور ادبی رسائل میں بھی اُن کا اِس نوع کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔

محسن احسان کے پانچ شعری مجموعے "ناتمام"، "ناگزیر"، "ناشنیدہ"، "نارسید" اور "سخن ماہتاب" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

"اجمل و اکمل" (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) محسن احسان کی نعتوں کا مجموعہ اظہارِ محبت و عقیدت کے ساتھ حسنِ ادب کا مرقع بھی ہے۔

ڈاکٹر عزیز احسن کا بھرپور علمی و ادبی انداز دیکھیے:

"غزل گو شعرا جب وادیٔ نعت میں قدم رکھتے ہیں تو اپنے معقولانہ طرزِ احساس کو اس طرح بروئے کار لاتے ہیں کہ نعت کی لفظیات اور طرزِ ادا سے ایک خاص قسم کی ندرت پیدا ہو جاتی ہے۔ محسن احسان کی نعت گوئی میں بھی یہی تخلیقی رویہ کار فرما ہے۔ ان کی نعت نگاری ادبیت اور عقیدت کے حسین رنگوں سے مزین ہے۔ محسن نے خوبصورت تراکیب تراش کر زندگی کے اندھیرے اجالے کو جزوِ فن بنایا ہے اور تعلیماتِ محمدی کو موضوعاتِ شعر کے طور پر اختیار کیا ہے۔"

جہاں جہاں اردو زبان بولی اور پڑھی جاتی ہے وہاں کے اہلِ علم محسن احسان سے واقف ہیں۔ شاید ہی کوئی ادب کا ایسا قاری ہو جس نے پروفیسر محسن احسان کو نہ پڑھا ہو۔ ورطۂ حیرت میں ڈالنے والی یہ بات ہے کہ "اردو نعت پاکستان میں" جو ڈاکٹر شہزاد احمد کا پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے اس مقالے کا نعتیہ اور اردو ادب کا قاری جب بغور مطالعہ کرتا ہے تو اس کے دل و دماغ میں یہ بات راسخ ہو جاتی ہے کہ شہزاد احمد کے یہاں اردو ادب سے نعتیہ ادب میں آنے والوں کا کوئی ذکر موجود نہیں ہے۔

نعت

ابر صحرا سے اُٹھا اور سرِ دنیا پھیلا
جس کا سایہ نہ تھا اُس ذات کا سایا پھیلا

تشنگیِ دشت کے ذرّوں کی بجھانے والا
مثلِ شبنم تھا مگر صورتِ دریا پھیلا

بشریت نے ترے آنے پہ آنکھیں کھولیں
اس طرح نام زمانے میں خدا کا پھیلا

کہکشاں ہے تری گردِ کفِ پا سے روشن
تیرا جلوہ ہے جو آفاق میں تنہا پھیلا

کرۂ ارض کو ہے فخر کہ وہ ابرِ کرم
اس پہ برسا جو سرِ عرشِ مُعلّیٰ پھیلا

جو اُتر جائے دلوں میں وہ صدا مجھ کو دے
میری آواز کی تاثیر کو اتنا پھیلا

وہؐ تو سرتا بقدم جود و سخا ہے محسنؔ
تو مگر اتنا نہ دامانِ تمنّا پھیلا

غزل

فقط کاغذ پہ لکھا بار اذیت اترا
جب غزل کہہ لی تو زنگار طبیعت اترا

بھوک سے مرتے رہے خیمۂ افلاک میں لوگ
آسماں سے نہ مگر خوانچۂ نعمت اترا

ماں نے تعویذ بھی باندھا مرے بازو پہ مگر
پھر بھی سر سے نہ یہ سودائے محبت اترا

دل سرائے میں تمنائیں ہیں سر پھوڑائے
کون سی بستی میں وہ مہمانِ مسرت اترا

اپنے قد کی اسے پہچان بہت مشکل تھی
سر سے جب طرۂ دستار فضیلت اترا

میں نہ غم خوار شہنشہ نہ طلب گار کل
مجھ پہ کس واسطے آشوب قیامت اترا

سر کی فصلوں کو بچالے گئے سب لوگ مگر
ایک محسنؔ سرِ میدانِ ہلاکت اترا

خیام العصر مُحسن اعظم مُحسن ملیح آبادی

''خاندانی نام محسن علی خان، قلمی نام محسن اعظم محسن۔ لقب خیام العصر۔ ولدیت امجد حسین خان۔ نسلاً ایمن زئی افغان۔ ولادت تین ستمبر انیس سو انتالیس (۱۹۳۹ء) قصبہ ملیح آباد ضلع لکھنؤ بھارت میں ہوئی۔ موجودہ وطن' شہر کراچی پاکستان۔ تعلیم ایم اے اردو ادبیات۔ ایم اے فارسی ادبیات۔ ایم اے تاریخ اسلام۔ ایم اے معارف اسلامیہ۔ فاضل علوم شرقیہ۔ پیشہ درس و تدریس تھا۔ شعری تصانیف میں پینتیس مجموعے سات شعری کلیات' وجدان' بسیط، دانش و بینش' ذکرئی۔ جاوداں۔ دوہا آرام۔ حرف آخر۔ میں جمع کردیئے ہیں۔ محسن صاحب اب تک ایک لاکھ سے زیادہ اشعار کہہ چکے ہیں اور شعر گوئی جاری ہے۔ کلام مختلف اصناف میں ہے۔ غزلیات' منظومات' رباعیات۔ دوہے' قطعات' ہائیکو' ایک صنف سخن ''سہ گانی'' بھی ایجاد کی ہے۔ حمد و نعت مع حمدیہ و نعتیہ منظومات۔ تین کلیات چھپ چکے ہیں جن میں چھبیس ہزار سے زیادہ اشعار ہیں۔ باقی کلیات جلد چھپنے والے ہیں۔ مرتب ہو چکے ہیں۔

خیام العصر محسن اعظم محسن مشہور ناقدین اور شعراء کی نظر میں منفرد اسلوب کے جدید شاعر ہیں' غزلیات و منظومات میں وہ ایک صف اول کے شاعر ہیں ہی لیکن صنف رباعیات میں وہ اردو شعرا وادب کی چار سو سالہ تاریخ میں رباعی کے سب سے ممتاز اور زیادہ رباعیات کہنے والے شاعر ہیں۔ ان کی رباعیات کے کلیات اول میں اکتیس سو سے زیادہ رباعیات ہیں جو بقول ناقدین نہایت فکر انگیز اور زبان و بیان کے اعتبار سے نہایت معیاری ہیں۔ ابھی تین ہزار سے زیادہ رباعیات چھپنے کو باقی ہیں۔ محسن اعظم نے بارہ ہزار سے زیادہ رباعیاں کہی ہیں ان کی شاعری کے متعلق جید ناقدوں اور شعراء میں سے جوش ملیح آبادی، جگر مرادآبادی، ڈاکٹر غلام مصطفی

خان، احسان دانش، فراق گورکھپوری، عبادت بریلوی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر وزیر آغا، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر وحید الزماں صدیقی، ڈاکٹر عبدالخالق، ڈاکٹر ابوالکارم، ڈاکٹر عبدالتحسین خان، بہار شاہجہان پوری، شبنم رومانی، بہار کوٹی، صہبا اختر، رئیس امروہوی نے جو انتقادی آراء دی ہیں۔ وہ فی الواقع نہایت اہم ہیں۔ مذکورہ حضرات جناب محسن اعظم محسن کو عہد حاضر میں قدر اول کا شاعر مانتے ہیں۔ اور ان کی قادر الکلامی و اسلوب بیان کی تحسین فرماتے ہیں۔ میں نے محسن اعظم ملیح آبادی کے متعلق جو تحقیق کی ہے اور انتقادی تناظر میں انہیں پرکھا ہے واقعی وہ مذکورہ ناقدین و شعراء کی ثقہ رائے کے مطابق صف اوّل کے نہایت معنی آفریں اور فکر انگیز شاعر ہیں۔ جوش ملیح آبادی کی طرح الفاظ پر انہیں قدرت حاصل ہے اور وہ کثیر لفظیات کے شاعر ہیں۔ وہ حمد و نعت کے بھی اہم شاعر ہیں ان کے نعتیہ کلیات ''بنام ذکریٰ'' میں آٹھ ہزار سے زائد اشعار نعتوں حمدوں اور صنف منظومات کی صورت میں ہیں۔ ان کی نعتیں عام فکری روش سے بہت بلند ہیں وہ صاحب اسلوب شاعر ہیں۔ تنقیدی روشنی میں، میں نے یہی سمجھا ہے کہ وہ جملہ اصناف سخن میں فکر تازہ، اور حکیمانہ و فلسفیانہ ذہن کے بیدار دماغ شاعر ہیں۔ پاک و ہند میں ان کے خاصے شاگرد ہیں جو ان کی فنی و عروضی مہارت سے فیض یاب ہوئے ہیں۔

محسن اعظم، شاعر تو بڑے ہیں ہی وہ ایک بڑے نقاد اور محقق ادب و شاعری بھی ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کے کئی ضخیم مجموعے ''انتقادی آئینے'' کے نام سے ہیں جو عنقریب عالمی رنگ ادب پبلی کیشنز کا ادارہ چھاپے گا۔ بطور نمونہ ان کی ایک نعت اور ایک غزل دی جا رہی ہے۔''

نعت

میانِ خالق و مخلوق ہیں دعا کی طرح
وہ جن کی نعت ضروری ہوئی ثنا کی طرح

خدا نہیں ہیں خدا کی قسم خدا کی طرح
مگر بشر بھی نہیں شخصِ بے بقا کی طرح

وہ جن کا نقشِ قدم ہے منارِ آگاہی
وہ جن کی خاکِ کفِ پا ہے کیمیا کی طرح

زہے! وہ شخص کہ جن کی نگاہِ لطف و کرم
محیطِ انفس و آفاق ہے قبا کی طرح

زہے! وہ ذات جو چہرہ نمائے فطرت ہے
ہے کائنات میں آئینہ صفا کی طرح

وہ جن کے دم سے ہوا منضبط نظامِ حیات
جو کائنات میں ہیں روحِ ارتقا کی طرح

وہی ہیں محرمِ اسرارِ لم یزل محسنؔ!
جو ابتدا میں بھی ہیں روحِ ارتقا کی طرح

غزل

عجب ہی پیاس کا صحرا ہے مجھ میں
سمندر خشک ہوجاتا ہے مجھ میں

شعورِ ذات در آیا ہے مجھ میں
میں آئینے میں، آئینا ہے مجھ میں

نظر انداز کردیتا ہوں جس کو
وہ نقطہ پھیلتا جاتا ہے مجھ میں

کسی کو میں سمندر کیسے کہہ دوں
میرا دریا تو خود گرتا ہے مجھ میں

نہ وحشت ہے نہ کوئی واہمہ ہے
عجب مبہوت سناٹا ہے مجھ میں

سفر اپنا میں کیسے ختم کردوں
یہ وقت اب تک کہاں ٹھہرا ہے مجھ میں

خیال آتے ہی اپنا محسن اعظم!
زمانہ کیوں سمٹ آیا ہے مجھ میں

محشر بدایونی

سرزمین بدایوں ہر دور میں گہوارۂ علم و ادب رہا ہے۔ وہیں ۱۹۲۲ء کو فاروق احمد محشر بدایونی حکیم حسین احمد مؤرخ کے گھر پیدا ہوئے۔ اردگرد کی ادبی محفلوں نے شعری حس کو جلا بخشی اور اُن کی تعلیم و تربیت بھی اسی شہر میں ہوئی۔ ۱۹۳۹ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول بدایوں سے میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۴۳ء میں ڈائریکٹریٹ جنرل سپلائی اینڈ ڈیولپمنٹ میں ملازمت اختیار کر لی اور ۱۹۴۷ء میں پاکستان آ کر اسی محکمہ سے منسلک ہو گئے۔ کراچی بورڈ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۵۰ء میں ریڈیو پاکستان کے رسالہ ''آہنگ'' کے نائب مدیر مقرر ہوئے اور ترقی کر کے ۱۹۶۶ء میں مدیر ہو گئے۔ ۱۹۸۲ء میں قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر ساری توجہ اپنی تخلیقی کاوشوں کی طرف مبذول کر دی۔

محشر بدایونی کا شمار اس عہد کے ممتاز غزل گو شعراء میں ہوتا ہے۔ اُنہوں نے تغزل میں اپنا ایک الگ اسلوب اور لہجہ کو اپنایا۔ اُن کی غزلوں کے تین مجموعے ''شہر نوا'' ۱۹۶۴ء، ''غزل دریا'' ۱۹۶۸ء کو آدم جی ادبی انعام سے نوازا گیا اور ''گردشِ کوزہ'' ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئے۔ محشر نے قومی، ملی، دینی اور تعلیمی موضوعات پر اَن گنت نظمیں، گیت اور ترانے سپردِ قلم کیے جو، اُن کی قادرالکلامی کے آئینہ دار ہیں۔

محشر بدایونی کے نعتیہ مجموعۂ کلام کا نام ''حرفِ ثناء'' ہے۔ جس میں اُن کے افکار و جذبات کی وہ روداد موجود ہے جو اُنہوں نے بیدار آنکھوں سے مدینہ میں حاضری کے وقت دیکھی اور اُن کے دل نے محسوس کی:

ڈاکٹر عاصی کرنالی ''اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر'' صفحہ ۳۱۹ پر لکھتے ہیں کہ سحر انصاری ان کی کتاب ''حرفِ ثنا'' کے بارے میں رقمطراز ہیں ''صرف عقیدت ہی نہیں، اقدارِ حیات کا ایک پختہ شعور بھی ملتا ہے جو آدمی کو بہتر انسان بننے کی ترغیب دیتا ہے۔''

◆◆◆

نعت

لب کھلے نعتِ فخرِ زماںؐ کے لیے
کتنی نازک حدیں ہیں زباں کے لیے

گلشنِ نعت میں یہ بصیرت بھی ہو
کون سا گل ہے موزوں کہاں کے لیے

آپؐ رحمت ہیں کہنا ہی کیا آپؐ کا
اور رحمت بھی دونوں جہاں کے لیے

آؤ تو گلشنِ مصطفیٰؐ کی طرف
کیف ہی کیف ہے قلب و جاں کے لیے

آپؐ ہی کے کرم نے سنوارا ہمیں
ہم تو بس رہ گئے تھے خزاں کے لیے

ساعتِ باریابی ہے، **محشر** ادب
عمر ساری پڑی ہے فغاں کے لیے

غزل

کب تک یہ جنوں دشت میں بہکاتا رہے گا
سناٹوں سے کوئی مجھے آواز بھی دے گا

رات اس نئے گھر کے بھی مکیں آ گئے اور اب
اس گھر کا اجالا بھی مرے گھر پہ ہنسے گا

کس سوچ میں تُو غرق ہے کشتی کے جفاکش
طوفاں میں ترا کام تجھے ڈوبنے دے گا

سوچا بھی نہ تھا صبح کو نکلوں گا میں گھر سے
اور شام کو گھر جانے کا رستہ نہ ملے گا

کل بارشِ صد سنگ تھی آج آتشِ صد زخم
جس طرح وہ دن ڈھل گیا یہ دن بھی ڈھلے گا

رہ رہ کے رگ و پے میں کھٹک سی ہے یہ کیسی
کیا دل کا کوئی حرف لہو بن کے رسے گا

محشر سا ہنر ور بھی کہاں ہوگا جو دن رات
ہنگاموں سے بھی نمٹے گا غزلیں بھی کہے گا

معین الدین اثر چشتی

خاندانی نام معین الدین اور ادبی نام معین اثر چشتی ہے ان کے والد غلام نبی رانڈ و اور دادا کا نام حسین بخش رانڈو ہے۔ معین الدین اثر کی تاریخ پیدائش پندرہ مئی انیس سو سینتالیس (۱۹۴۷ء) ہے اور انہوں نے جامعہ کراچی سے ایم اے اردو (فاضل اردو) اور ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ معین الدین عرصہ دراز تک مختلف ملازمتیں بحیثیت اکاؤنٹنٹ کرنے کے بعد اب مارٹل کی تجارت کر رہے ہیں۔ ان کے استاد جناب خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی ہیں۔ انہوں نے شاعری کا آغاز انیس سو ستر (۱۹۷۰ء) میں کیا۔ شعری تصنیفات میں بارش نغمہ (غزلیات)، قلزم نعت (نعتیہ مجموعہ) ان پر مشہور ناقدین کی رائے یہ ہے:

"کلام حمدیہ و نعتیہ اور غزلیہ سادہ و شگفتہ اور اثر آفریں ہے، عروضی و فنی طور پر بھی صاف ہے اس کے علاوہ معاشرتی اور سماجی حالت و واقعات، مشاہدات و افکار اور جمالیات ان کی غزلوں میں موجود ہے۔ بعض اشعار بے حد فکر انگیز ہیں بقول جید ناقد جناب خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی اور بہار شاہجہاں پوری شاعر جمالیات ولسیات رونق حیات کی تنقیدی نظر میں وہ اچھے اور سلیقہ مند شعرا کی صف کے شعر ہیں۔ ان کے کلام کا بڑا حصہ اسلوب سادہ سے مزین ہے فکر و نظر کے اعتبار سے اچھے شاعر ہیں ان کی شاعری میں جمود نہیں ان کے شعروں میں بڑی زندگی ہے۔ حالات حاضرہ پر ان کی نظر گہری ہے۔ جو ان کی غزلوں سے ظاہر ہوتی ہے۔"

نعت

زیست کانٹا ہے پھول ہو جائے
یہ تمنا قبول ہو جائے

شاہ دیںؐ کی اگر توجہ ہو
رحمتوں کا نزول ہو جائے

اذن مل جائے چاند تاروں کو
انؐ کے قدموں کی دھول ہو جائے

یا نبیؐ آپ کی اطاعت ہی!
زندگی کا اصول ہو جائے

جس کو حاصل ہو آپؐ کا سایہ
پھر وہ کیسے ملول ہو جائے

آپؐ کی آرزو رہے باقی
ہر تمنا فضول ہو جائے

ذکرِ محبوبؐ کبریا ہو اثر
روشنی کا نزول ہو جائے

غزل

جس قدر صاحب ادراک ہوئے جاتے ہیں
لوگ تو اور بھی سفاک ہوئے جاتے ہیں

اتفاقات زمانہ ہی اسے کہتے ہیں
جو زمیں تھے بھی افلاک ہوئے جاتے ہیں

جانے کیا بات ہے، یہ آپ کے دیدار کے بعد
میرے جذبات بھی بے باک ہوئے جاتے ہیں

یہ غلاظت میں جو تم پھینک رہے ہو پتھر
اس سے تو پاک بھی ناپاک ہوئے جاتے ہیں

زندگی جن کی گذرتی نہیں ادراک کے ساتھ
رفتہ رفتہ وہ یہاں خاک ہوئے جاتے ہیں

تیکھی نظروں سے نہ دیکھو مجھے اے ماہ رخو!
میرے انفاس بھی دراک ہوئے جاتے ہیں

یہ مری آہ و فغاں ہی کا اثر ہے اے اثر
دیکھو کلیوں کے بھی دل چاک ہوئے جاتے ہیں

مظفؔر وارثی

مظفر وارثی میرٹھ میں صوفی وارثی کے گھر ۲۳ر دسمبر ۱۹۳۳ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیم میٹرک تک ہے۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان میں ملازم رہے۔ صوفی مشرب انسان تھے۔

عصر حاضر کے نعت گو شعراء میں مظفر وارثی کو منفرد مقام حاصل ہے۔ وہ "شاعرِ رسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم)" کہلانے کے حق دار ہیں۔ غزل گوئی کے تنگ کوچے سے نکل کر اور حقیقی فکر کے علم بردار بن کر انہوں نے شاعری میں ایک ایسے سحر انگیز تخیل کو پروان چڑھایا ہے جس کی مثال کم ملتی ہے۔ اکبر وارثی کے فکری ورثہ کو انہوں نے آگے بڑھایا اور اس میں متعدد تجربے کیے۔ نعت کی ہمہ گیری میں اضافہ کیا اور اُس کے حسن کو نکھارنے اور سنوارنے میں کوشاں رہے۔

آپ کے نعتیہ مجموعے "بابِ حرا"، "نورِ ازل" اور "کعبۂ عشق" چھپ کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ لاہور میں مقیم ہیں۔ حمد پر مشتمل بھی اُن کا ایک مجموعہ ہے۔

◆◆◆

نعت

تجھ کو آنکھوں میں لیے جب میں یہ دنیا دیکھوں
ہر سحر میں ترے ماتھے کا اجالا دیکھوں

آئینہ بن کے جو ساری بشریت آئے
کوئی تصویر، کوئی عکس نہ تجھ سا دیکھوں

میری بینائیوں کے پر سے نکل آتے ہیں
جب خلاؤں میں ترا نقشِ کفِ پا دیکھوں

کیا سمائے مرے لفظوں میں بڑائی تیری
صف میں نبیوں کو ترا چاہنے والا دیکھوں

تریؐ انگشتِ تصور سے بھی چشمے پھوٹیں
تیرے صحرا میں کسی کو بھی نہ پیاسا دیکھوں

غزل

مہک ملی ہے ، حرارت شکار کرنے سے
گلاب بن گیا شعلہ بھی ، پیار کرنے سے

چمن کے رنگ ہزاروں ، دکھائے رنگ اپنا
لگے وہ اور بھی سادہ، نکھار کرنے سے

صدائیں ٹوٹ رہی ہیں فضا سے ٹکرا کر
سکوت اور بھی پھیلے ، پکار کرنے سے

شب فراق کو آب حیات پورا دو
طلب کی عمر بڑھے، انتظار کرنے سے

خود اپنے خون سے ڈھانپی برہنگی اپنی
قبا ملی ہے ، بدن تار تار کرنے سے

مرے دکھوں نے مجھے قہقہوں میں دفنایا
مرا ہوں، زندہ دلی اختیار کرنے سے

جو حلق تر کرے وہ ایک بوند ہے کافی
بجھے نہ پیاس، سمندر کو پار کرنے سے

مقبول نقش

(۱۹۲۲ء......۲۰۰۵ء)

جمشید پور (ٹاٹا نگر) بہار کا صنعتی علاقہ ہے جس نے ہندوستان کی معیشت کو مستحکم کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ اسی جمشید پور میں ۱۹۱۹ء میں عبدالسبحان نے جنم لیا۔ جنھوں نے مقبول نقش کے نام سے پہلے مشرقی پاکستان میں اور بعد ازاں کراچی میں شہرت پائی۔ مقبول نقش کو مشرقی پاکستان میں وہی مقام حاصل تھا جیسا لاہور میں شاعرِ مزدور احسان دانش کو ملا۔ ہجرت کے بعد ۱۹۵۲ء سے ڈھاکہ میں اور بعد میں چٹاگانگ میں قیام کیا۔ چٹاگانگ کی ادبی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیتے رہے۔ پیشے کے لحاظ سے ٹھیکیداری کرتے رہے۔

ڈھاکہ سے ان کی ایک طویل نظم "جوئے خوں" کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہے۔ وہ نہ صرف زود گو بلکہ بسیار گو شاعر کے طور پر بھی اپنی منفرد شناخت رکھتے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد کراچی آ گئے۔ ۱۹۸۰ء میں ان کی غزلوں کا ایک مجموعہ "نوشتہ" چھپا تھا۔ جبکہ "پیچم خیال" رباعیات، قطعات، ثلاثی کا مجموعہ "خوشبو کی دھنک" ہائیکو نظمیں اور اردو ماہیے اور ان کی دوسری تصانیف شائع ہوئیں۔

مقبول نقش نے حمد و سلام اور نعتیں بھی کہیں۔ ان کی آخری کتاب نعتوں کا مجموعہ "حرف حرف کائنات" کے نام سے شائع ہوا۔ مقبول نقش کی نعتیہ شاعری محبت اور عقیدت پر استوار ہے۔ اور ان کی غزلوں میں اپنے عہد کی تہذیبی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اظہار و بیان کا سلیقہ بدرجۂ اتم ان

کے ہاں موجود ہے۔

مقبول نقش سابق مشرقی پاکستان میں اختر حامد خان کے ساتھ شریکِ کار رہے۔ اور وہاں کی ادبی محفلوں میں سرگرم عمل رہا کرتے تھے۔ کراچی میں بھی مقبول نقش کا حلقہ احباب رہا۔ تاہم کراچی میں وہ بیشتر گوشہ نشین ہی رہا کرتے تھے۔ مقبول نقش کا انتقال کراچی میں ۳۱ رجنوری ۲۰۰۵ء بروز پیر ہوا۔ کراچی کی خاک میں پنہاں ہوئے۔

پاکستان کے نعت گو شعراء حصہ دوم ص ۳۵۴ پر ہم نے ولادت ۱۹۱۹ء اور ۳۱ رجنوری ۲۰۰۵ء وفات درج کی ہے۔ دبستانوں کا دبستان میں سالِ ولادت ۱۹۲۲ء درج کیا گیا ہے۔ ہمارے اہلِ قلم میں مقبول نقش کا سالِ ولادت ۱۹۲۱ء لکھا ہے۔

نعت

سجدہ حریمِ پاک میں ربِ الانام کا
یا روضۂ رسولؐ پہ موقع سلام کا

دامن میں اپنے دیکھنا اے بختِ نارسا
شاید کہ کوئی عمر کا حصّہ ہو کام کا

کیوں جان رہروانِ مدینہ کریں نثار
پیغام مل رہا ہے حیاتِ دوام کا

اب دیکھیے دیارِ نبیؐ کب نظر میں آئے
ویسے تو قافلہ ہے رواں صبح و شام کا

طے ہو رہی ہیں یوں بھی محبت کی منزلیں
پابند ہر نفس ہے درود و سلام کا

کس سے بیاں ہو خاکِ مدینہ کی عظمتیں
ہر ذرّہ جب حریف ہو ماہِ تمام کا

از روئے فکرِ نعت تعجب نہیں ہے نقشؔ!
کھل جائے راز مجھ پہ بھی حسنِ کلام کا

غزل

کبھی خودی تو کبھی بے خودی میں رہتے ہیں
تلاشِ منزل خود آگہی میں رہتے ہیں

ہیں زاویے بھی نگاہِ جہاں کے غور طلب
ہزار عیب و ہنر آدمی میں رہتے ہیں

نظر کے واسطے اک فاصلہ ضروری ہے
وہ دوریوں میں کہ ہمسائگی میں رہتے ہیں

انہیں خبر ہے جو تیرے مزاج داں بھی ہیں
کچھ اور رخ بھی تری بے رخی میں رہتے ہیں

شکستِ دل کا ہو عالم کہ دردِ دل کی فضا
ہم اہلِ شوق عجب سرخوشی میں رہتے ہیں

منظرؔ عارفی

کراچی پاکستان کا دل ہے، تہذیبی و تمدنی اعتبار سے یہ شہر پاکستان کے دیگر شہروں سے مختلف ہے، یہاں پر کثیر نسلی آبادیاں کچی پکی بستیوں کی صورت میں موجود ہیں، یہاں کے اعلیٰ تعلیمی ادارے طلباء کو علم و ادب اور خود آگاہی کے زیور سے مرصع کرتے ہیں، یہاں کا علمی و ادبی ماحول علمی میلان و طبع رکھنے والوں کو بہت جلد ''کام کا آدمی'' بنا دیتا ہے۔

منظر عارفی کے والدین تقسیم ہند کے بعد الٰہ آباد یوپی (بھارت) سے ہجرت کر کے پاکستان آئے اور کراچی میں مستقل طور پر آباد ہو گئے، اسی شہر میں منظر ۲۲/ اگست ۱۹۶۵ء کو پیدا ہوئے، اسی شہر کے تعلیمی اداروں سے پہلی جماعت سے بی اے تک تعلیم حاصل کی۔

منظر عارفی نے ۸۰ کی دہائی میں شعر و سخن کا آغاز کیا تو استادالشعراء عارف اکبر آبادی کے تلمیذ بنے، وہ ایک ادبی رسالے ''سربکف'' کے مدیر اعلیٰ ہیں ''سربکف'' واقعی اسم بامسمیٰ ہے، خصوصاً ہمارا شہر اور عموماً پوری ملت اسلامیہ کے ''پاؤں'' طالع آزماؤں اور مغربی استعمار کے گرداب میں بے طرح الجھے ہوئے ہیں، اپنی بقا کے لیے جس سے نکلنا خصوصاً ہمارے شہر اور عموماً پوری ملت اسلامیہ کے لیے ناگزیر ہے، منظر عارفی کی کتاب ''پاؤں میں گرداب'' میں انہیں رویوں کی چہرہ نمائی ہے جو اگرچہ تلخ ہیں لیکن حقیقت سے بعید قطعی نہیں ہیں، ''پاؤں میں گرداب'' ہماری زندگی کی مختلف جہتوں سے پردہ اٹھاتی ہے۔

میں خود بھی اسی شہر کا باسی ہوں، منہ اندھیرے گھر سے روزگار کے لیے نکل جانا اور پھر کوچہ سخن کی دشت نوردی آسان کام نہیں۔ نعتیہ افکار پر مشتمل ''اللہ کی سنت'' جنوری ۲۰۰۹ء میں شائع

ہونے والا نعتیہ مجموعہ جب میں نے دیکھنا شروع کیا تو ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا کہ شاعر نے نعتیہ شاعری کے مروجہ (پرانے) انداز تخاطب سے ہٹ کر الفاظ کو نئے اور دل آویز سلیقے اور قرینے سے برتا ہے، ہمارے نعتیہ مجموعوں کے سرورق پر بیت اللہ شریف اور مسجد نبوی شریف کے طغروں کی اشاعت لازم بن چکی ہے، حالانکہ آج بھی شائع ہونے والی تفسیر اور سیرت کی کتابوں کے سرورق پر اس کا کوئی تصور نہیں، منظر عارفی نے اپنے نعتیہ مجموعے کے سرورق پر اس سے بچنے کی روایت تازہ کی ہے اور نام کی مناسبت سے "کتاب" کے سمبل کو منظر کیا ہے، بیشک قرآن حکیم تمام کا تمام نعت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مزین ہے، کتاب کا سرورق کتاب کے نام کا بھرپور عکاس ہے۔ گزشتہ سال ۲۰۱۶ء میں "کراچی کا دبستان نعت" کے نام سے منظر عارفی کی تحقیق وترتیب پر مشتمل کتاب شائع ہوئی جو کراچی کے نعت گو شعرا پر ایک دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

وہ ثنا خوانِ رسول ہوتے ہوئے بھی اپنی بدعملی کو بدعملی ہی سمجھتے ہیں اور اس پر شرمندہ ہیں، انہوں نے واعظِ دینی کو کہیں مطعون نہیں کیا، نہ ہی علماء حق کے مقابلے میں اپنے آپ کو اعلیٰ اور برتر سمجھا، آپ نعتیہ مجموعے اٹھا کر دیکھیں ان موضوعات سے الا ماشاء اللہ شاید ہی کوئی مجموعہ نعت محفوظ ملے۔ مجموعہ "اللہ کی سنت" تادیر ادبی حلقوں میں یاد رکھا جائے گا۔

نعت

یہ تاج خود اپنے سر پہ رکھنا شرف یہ خود اپنے نام لکھنا
بلال جیسے نصیب پالو تو خود کو ان کا غلام لکھنا

ہمیں خدا کی کتاب یہ بھی بتا رہی ہے بنامِ احمدؐ
رؤف لکھنا کریم لکھنا عظیم و ذی احتشام لکھنا

ثنائے محبوب کبریا میں کچھ ایسی بن جائے اپنی عادت
سلام پڑھ کر درود لکھنا درود پڑھ کر سلام لکھنا

ہو دل میں ایمان لب مودب اور ان کی سیرت کا علم وافر
پھر ان کی شانِ مقدسہ میں لرزتے ڈرتے کلام لکھنا

خدا نے ان کے لئے کیا ہے انہیں کا ذکر بلند اونچا
خدا کی سنت یہی ہے پیارے نبیؐ کو عالی مقام لکھنا

جو ذکرِ صبحِ مدینہ کرنا تو قرآں کی روشنی میں کرنا
قلم میں ایماں کا نور بھرنا تو شہرِ طیبہ کی شام لکھنا

بغیر توفیقِ ربِّ احمدؐ کسی سے ممکن نہیں ہے منظر
انہیں تسلسل سے یاد رکھنا انہیں مسلسل مدام لکھنا

غزل

مجھ کو احساس ہے محدودِ نوا ہوں میں بھی
چپ سے گھبرا کے مگر چیخ پڑا ہوں میں بھی

مجھ کو درکار ہے اے زیست گواہی تیری
عمر بھر تیرے تصرف میں رہا ہوں میں بھی

میں کسی حال میں ثابت نہیں ہونے والا
کچھ نہیں صرف زمانے کی ہوا ہوں میں بھی

کون سے زاویۂ فکر سے سوچا جائے
اک تسلسل سے یہی سوچ رہا ہوں میں بھی

آپ کو بھی یہ توقع نہیں ہوگی مجھ سے
رسمِ دنیا کی طرح آپ کو چاہوں میں بھی

بزمِ اُردو ! مری جانب سے نہ ہو صرفِ نظر
تیری دہلیز پہ چھوٹا سا دیا ہوں میں بھی

اپنے منظر میں کسی منظرِ نورفتہ ہوں
اپنے گنبد میں کسی بانگِ درا ہوں میں بھی

پروفیسر منظرؔ ایوبی

بدایوں روہیل کھنڈ یوپی میں واقع ایک ایسا شہر ہے جو صدیوں سے علم و ادب اور شعر و سخن کا گہوارہ کہلاتا رہا ہے۔ منور بدایونی و محشر بدایونی، دلاور فگار، شکیل بدایونی جیسے اردو دنیا کے مایہ ناز شعراء کا تعلق اسی علاقے سے رہا ہے۔ اسی شہر میں علی احمد ایوبی نامی زمیں دار کے ہاں عزیز احمد ایوبی ۴/ اگست ۱۹۳۲ء کو پیدا ہوئے۔ ابھی دس برس کی عمر کو پہنچے تھے کہ ان کے والد کی وفات ہوگئی جس کے بعد زمینوں کی دیکھ بھال اس کا تمام نظام ان کی والدہ کے شانوں پر آ پڑا۔ زر، زمین کا تنازعہ اور برصغیر میں تقسیم کے حالات و واقعات بیک وقت رونما ہونے لگے، ہندو مسلم فسادات کے نتیجے میں ان کے خاندان کی جائیدادیں، گھر بار سب لٹ گیا اور کسمپرسی کے عالم میں یہ خاندان ہجرت کے سنگین مرحلے سے دوچار ہوتا ۱۹۵۰ء میں لاہور اور بعد ازاں کراچی پہنچا۔

عزیز احمد ایوبی شعر و ادب کی دنیا میں منظر ایوبی بن گئے، ابتدائی تعلیم بدایوں کے دینی مکتب میں عربی و فارسی کے ساتھ حاصل کی تھی۔ اسلامیہ اسکول و کالج سے میٹرک و انٹر پاس کر کے لاہور سے ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ کراچی آئے تو یہاں سے بی کام اور پھر کراچی یونی ورسٹی سے ایم اے اردو کے امتحانات پاس کر لیے۔ ادب اور تعلیم کے میدان میں ۶۰ برس سے سرگرم عمل رہنے والے منظر ایوبی کو ملک میں اور صوبائی سطح پر اہمیت و پذیرائی حاصل ہے۔

منظر ایوبی ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک کے عشرے میں سرکاری ملازم رہے پھر درس و تدریس

کے شعبے میں آ گئے۔ گورنمنٹ ڈگری کالج سندھ کے کالجوں اور کورنگی انٹرمیڈیٹ کالج میں پڑھاتے ہوئے ریٹائر ہوئے۔ ادیبوں شاعروں کی تصانیف پر پیش لفظ اور دیباچے، تحقیقی مقالے اور ریڈیائی فیچر لکھنے کے ساتھ ان کی شاعری بھی جاری رہی۔ رائٹرز گلڈ کے ترجمان ماہنامہ ''ہم قلم'' کے مدیر شیم احمد کے ساتھ یہ نائب مدیر رہے۔

منظر ایوبی کے شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے نعتیہ مجموعے ''متاعِ آخر'' کی اشاعت پر کراچی میں تقریب رونمائی بھی ہو چکی ہے سندھ کی وزارتِ ثقافت نے ان کے مجموعے کو کتب خانوں اور مقتدر شخصیات تک پہنچانے کے لیے ہدیہ کیا۔ ۲۰۱۷ میں منظر ایوبی کے اعزاز میں آرٹس کونسل کراچی میں کمال اعتراف کی تقریب منعقد کی گئی۔

''متاعِ آخرت'' ایک ایسے شاعر کا تخلیقی اظہار ہے جس کے دل میں حبِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہے اور جو سیرت و کردار، اخلاق حسنہ اور جملہ فضائل و مناقب کے ذکر کو بھی عمدہ اور دلنشیں پیرائے میں بیان کرنے کا خوگر واہل ہے۔

نعت

کمالِ عشق کی منزل اگر مدینہ ہے
مجھے بھی فخر مرا راہبر مدینہ ہے

نظر کے سامنے دربارِ مصطفیٰ نہ سہی
مری زباں پہ تو شام و سحر مدینہ ہے

بچھے ہیں چاند ستارے ہزار رستوں میں
قدم اُدھر ہی اُٹھیں گے جدھر مدینہ ہے

قدم قدم پہ نبیؐ کی نشانیاں ہیں جہاں
وہ اپنی وضع کا واحد نگر مدینہ ہے

کسی کی ہرزہ سرائی سے کیا غرض منظر
ہمارا محورِ فکر و نظر مدینہ ہے

عجیب رشتۂ روح و بدن ہے ایوبیؔ
رہوں کہیں پہ مرا گھر نگر مدینہ ہے

غزل

گر وقت کو گواہ بنایا نہ جائے گا
صدیوں کا قرض تم سے چکایا نہ جائے گا

یہ شہر اپنی آخری جائے پناہ ہے
اب کوئی ایسا شہر بسایا نہ جائے گا

جس حال میں، جہاں ہے، اسے رہنے دیجیے
وہ یاد آگیا تو بھلایا نہ جائے گا

دنیا ہمارے دکھ سے نہیں باخبر، نہ ہو
دل چیر کے تو سب کو دکھایا نہ جائے گا

تھوڑی سی روشنی کے لیے گھر ہی پھونک دے
ایسا چراغ ہم سے جلایا نہ جائے گا

جب تک کہ قدر دانِ سخن ہیں بقیدِ زیست
دامن مشاعروں سے چھڑایا نہ جائے گا

مہر پیلی بھیتی

(۱۸۹۶ـ۱۹۸۹۵)

تذکرہ نویسوں میں ایک اہم نام عتیق احمد مہر پیلی بھیتی کا بھی ہے۔ جو اردو شاعر و ادیب احمد خلیق کے برادر بھی تھے، ۱۸۹۶ء میں ہندوستان کے شہر پیلی بھیت میں پیدا ہونے کی نسبت سے مہر پیلی بھیتی کہلائے، آپ کا خاندان اسلامی معاشرتی اور اخلاقی ماحول کا آئینہ دار تھا جس کا پرتو آپ پر براہ راست پڑا، اپنے دور کی مروجہ درس گاہوں میں آپ کی تعلیم مکمل ہوئی، ۲۵ـ۱۹۲۴ء میں پیلی بھیت میں ایجوکیشن کانفرنس ایورویدک کالج میں منعقد ہوئی جس میں ہندوستان کے بڑے بڑے علماء، سیاست دان اور مشاہیر نے ''اردو کی اہمیت وضرورت'' کے بیان کی موافقت میں تقاریر کیں، آخری اجلاس میں سر سلمان ندوی کی صدارت میں مشاعرہ ہوا، مہر پیلی بھیتی کو اس مشاعرے میں پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔

''شعراء و شاعرات پاکستان'' مہر پیلی بھیتی کی مرتب کردہ اہم کتاب ہے جسے ان کے دور کے مشاہیر نے ادبی اور علمی اہمیت کی تاریخی دستاویز اور مسلم معاشرے کی بہترین آئینہ دار و ترجمان تسلیم کیا ہے۔

آپ کا شعری مجموعہ ''عقیدت گل کدہ حرم'' (۱۹۶۰ء) اور نعتوں کا مجموعہ ''رحمت گل'' زیور

طبع سے آراستہ ہو کر منظرِ عام پر آیا۔ "رحمتِ کُل" مہر پیلی بھیتی کی نعتوں کا انتخاب ہے جس کے مرتب ڈاکٹر جہاں احمد سلطانی ہیں، یہ انتخاب مہر پیلی بھیتی کی حیات میں ان کی اجازت سے شائع کیا گیا، اس کا سنِ طباعت ۱۴۰۴ھ بمطابق ۱۹۸۴ء ہے۔

کراچی میں مقیم شعرائے پیلی بھیت ایوب پیام، خواجہ رضی حیدر اور سید منیر جعفری کی طرح مہر پیلی بھیتی کی بھی خاصی پذیرائی ہوئی۔ مہر پیلی بھیتی استاد الشعراء مجید پیلی بھیتی جانشین حضرت حافظ پیلی بھیتی کے اہم تلامذہ میں سے تھے۔

۱۸۹۶ء میں (سو سال سے زائد مدت قبل) پیدا ہونے والے پیلی بھیت کے فرزند مہر پیلی بھیتی ۱۹۸۵ء میں پیوند خاک کراچی ہوئے۔ ان کا ایک ناول "شمعیں نہ بجھیں" بھی شائع ہو چکا ہے۔

نعت

رات ہو دن ہو کہ ہو شام و سحر یا مصطفیٰؐ
آپ ہی کا ذکر ہے آٹھوں پہر یا مصطفیٰؐ

کوئی ہم دم ہے نہ کوئی ہم سفر یا مصطفیٰؐ
بے کسی ہے اور گردِ رہ گزر یا مصطفیٰؐ

نذرِ گوہر کر رہی ہے چشمِ تر یا مصطفیٰؐ
ایک جلوے کے لئے تابِ نظر یا مصطفیٰؐ

گمرہی بہکا کے لے آئی ہمیں ایسی جگہ
بے مقام و بے نشاں ہے رہ گزر یا مصطفیٰؐ

آ کے بیٹھے ہیں فریبِ رنگ و بو کے دام میں
بے بسی ہے اور ہم بے بال و پر یا مصطفیٰؐ

آپؐ کا در چھوڑنے کی یہ سزا ہم کو ملی
پھر رہے ہیں خاک بر سر دربدر یا مصطفیٰؐ

پا شکستہ مہر ہے کب سے اسیرِ رنج و غم
اس کے حالِ زار پر بھی اک نظر یا مصطفیٰؐ

غزل

مروت ہے ' محبت ہے ' اخوت ہے
نظر کے روبرو میرے ' مری یادوں کی جنت ہے

جہاں خوابوں نے بند آنکھوں میں اک دنیا بسائی تھی
وہاں بیدار آنکھوں میں مسرت ہی مسرت ہے

نہ جانے کون سے جذبات نے جاں ڈال دی مجھ میں
چراغ آخر شب میں ہر شب کی حرارت ہے

مرے ہی واسطے جیسے ورق تاریخ نے الٹا
بحمد اللہ میرے سامنے پہلی سی صحبت ہے

ناصر کاسگنجوی

(۱۹۲۸ء۔ ۲۰۰۲ء)

ناصر محمود خاں ولد احمد خان کاس گنجوی ضلع ایٹہ میں دس اکتوبر ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۴ء میں اُنہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اُن کے دادا کے پاس کتابوں کا ذخیرہ تھا جسے باقاعدہ لائبریری کی شکل میں رکھا گیا تھا۔ جہاں اُن کے والد بھی مطالعہ کیا کرتے تھے، گھریلو زندگی ٹھاٹ باٹ سے گزر رہی تھی، نادر و نایاب کتابوں تک رسائی نے اُن میں مطالعے کا شوق پیدا کر دیا، دن کتابوں کی ورق گردانی میں اور شام کے اوقات میں کھیلوں میں مصروف رہا کرتے۔ کانپور کے اخبارات و رسائل روزنامہ ''زمانہ''، ''پیمانہ'' اور اودھ کا رسالہ ''مے خانہ'' باقاعدگی سے اُن کے ہاں آتے تھے، تاہم اُنہیں اخبار پڑھنے سے زیادہ دل چسپ مشغلہ کتابیں پڑھنا لگتا تھا۔ معروف شعرا کے دواوین اور تجلی کے مضامین، عبدالحلیم شرر کے ناول، مولانا راشد الخیری کے ناول بہت مرغوب تھے۔

ناصر کاس گنجوی ۱۹۴۹ء میں ترکِ سکونت کر کے کراچی پہنچے۔ کراچی میں رہ کر گریجویشن کیا مگر کوشش کے باوجود ایم اے اُردو کرنے کی خواہش پوری نہ کر سکے۔

پاکستان آنے کے بعد اُن کو اورینٹ ایئرویز میں ملازمت ملی، جو بعد میں پی آئی اے کے نام سے موسوم ہوئی۔ دو ڈھائی سال بعد جب ایئر لائن میں تبدیلی آئی تو اُن کی ملازمت نہ رہی۔ مرکزی حکومت کے دفاتر اِن دنوں کراچی میں ہوا کرتے تھے۔ یہ دارالحکومت بھی تھا اور ایک اہم انڈسٹریل زون بھی، چناں چہ انڈسٹری وزارتِ پیداوار کے ٹیکسٹائل محکمے میں اور بعد ازاں محکمۂ

سرمایہ کاری، فروغ برآمدات و سپلائز میں خدمات انجام دیں۔

فلم "جان پہچان" کے گانے لکھے۔ "خمار دوش" اور "سرودِ امروز" اُن کے دو شعری مجموعے ہیں۔ اِن کے علاوہ دو اور کتابیں اور نعتیہ مجموعہ "دیارِ گُل" شائع ہو چکا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس نعتیہ مجموعہ میں (جو آپ کی آخری تصنیف ہے) کے مرتبین اگر ناصرؔ کاس گنجوی کے حالاتِ زندگی کا کچھ احاطہ کر دیتے۔

ناصرؔ کاس گنجوی کو عمر کے آخری حصے میں کینسر کے موذی مرض نے جیتے جی مار رکھا تھا۔ وہ بہت ہی بددل اور رنجیدہ رہنے لگے تھے۔ آخر کار ۲۶ رجون ۲۰۰۲ء کو اس مرض نے اُن کی زندگی کا خاتمہ کر دیا اور وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ ناصرؔ کاس گنجوی کی نعتیں کس رنگ کی ہیں، اس کا اندازہ پڑھنے والے ہی کر سکتے ہیں۔

نعت

مرے فکر و فن کی جنت یہی کام مہکا مہکا
وہ حسیں حسیں پیمبر، وہ پیام مہکا مہکا

ہے نفس نفس معطّر، ہیں نظر نظر اُجالے
کہ طلوع ہو رہا ہے کوئی نام مہکا مہکا

سرِ آستانِ سرورؐ پڑھوں نعت جھوم کر میں
اسی بے خودی کو حاصل ہو دوام مہکا مہکا

جہاں آپ محوِ راحت جہاں قدسیوں کی جنت
وہ زمیں کا ایک ٹکڑا ہے دوام مہکا مہکا

کوئی اس گلِ رسالت کی شگفتگی تو دیکھے
جو بنا دے تپتے صحرا کو مقام مہکا مہکا

جسے نعت کہہ کے دنیا مجھے دے رہی ہے عزت
ہے مری زباں پہ ناصرؔ وہ کلام مہکا مہکا

غزل

ڈھل گئی شام تو اکثر یہی دھوکا گزرا
جیسے آہٹ ہوئی تیری ترا سایا گزرا

ابرِ آوارہ کا ٹکڑا سرِ صحرا گزرا
یا غمِ دوست میں تسکین کا لمحہ گزرا

شکرِ محرومی بھی کیا چیز ہے اللہ اللہ
دل پہ جو وقت برا وقت تھا اچھا گزرا

دست در دست رواں اہل طلب ہیں جس پر
دل اسی جادہ بے نام سے تنہا گزرا

خامشی نے بھی سنائے ہیں بہت افسانے
خشک آنکھوں سے بھی طوفانِ تمنا گزرا

تیری راہوں پہ تجھے کیسے بتاؤں اے دوست
آج کیا گزری ہے مجھ پر جو اکیلا گزرا

نیند کچھ ہم کو ہی آتی نہیں ناصر ورنہ
اپنی قسمت کو تو سوئے ہوئے عرصہ گزرا

ناصؔر جلالی دہلوی، سید

(۱۸۸۷ء۔۱۹۶۵ء)

سید محمد ناصر جلالی دہلوی کی حمد چند نعتوں، منظومات اور متفرق اشعار پر مشتمل ''تبرکاتِ ناصر'' واقعتاً پاکستان کے نعت گو شعراء اور ان کے قارئین کے لیے تبرک ہی ہیں جنہیں ان کے بھانجے محمد کمال اظہر (مزاحیہ شاعر مقیم کویت) نے اگست ۱۹۹۹ء میں کراچی سے شائع کرایا تھا۔
سید ناصر جلالی نے دہلی سے ۲ر دسمبر ۱۹۴۷ء پاکستان ہجرت کی اور کراچی میں قیام کیا۔

یہاں سے انہوں نے ماہ نامہ ''اذان'' کا اجراء کیا۔ ۱۹۵۲ء تک اس کی اشاعت کا پتہ چلتا ہے۔ سید ناصر جلالی دلی کی تہذیبِ رفتہ کا چلتا پھرتا نمونہ تھے۔ ان کے پرستاروں اور عقیدت مندوں میں جگر مراد آبادی، محمد حسن عسکری، سلیم احمد اور ابراہیم جلیس بھی تھے۔ صوفی و درویش کے در پر کسی مسلک، کسی نظریے کے فرد کے داخلے کی ممانعت نہیں ہوتی۔ بقول کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ:

''ناصر جلالی ایسی تقریر کیا کرتے تھے جیسے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں۔ ہندو مسلم اتحاد تحریک میں عید اور دیوالی مسلمان و ہندو، سکھ سب مل کر منایا کرتے تھے۔ قبلہ ناصر جلالی اس تحریک کی حمایت میں بولنے والے مقبول ترین مقرر مانے جاتے تھے۔ وہ ایک شعلہ بیان مقرر ہی نہیں بلکہ ادیب و شاعر بھی اچھے تھے۔ گو ان کو مشاعروں میں جا کر شعر سنانے کا قطعی شوق نہیں تھا مگر اپنے ہم خیال باذوق دوستوں کو خوب جم کر شعر سنایا کرتے تھے''۔

سید ناصر جلالی کی تاریخِ وفات و سن ولادت کا ''تبرکاتِ ناصر'' میں مضمون نگاروں یا مرتب و ناشر نے کوئی ذکر نہیں کیا۔ ان کی نعتوں میں ایک بے ساختہ وارفتگی اور والہانہ عقیدت مندی ہے۔ صوفیائے کے مسلک میں شریعت سے زیادہ طریقت اور عقیدت کا ادراک و اظہار ملتا ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت ان تبرکات کی ہے جنہیں نقل کرنے سے ہم گریز کرنا بہتر سمجھتے ہیں۔ ناصر

جلالی کا سن وفات ۳ر دسمبر ۱۹۶۵ء کراچی ہے۔ ''پاکستان کے ماہ و سال'' میں ۳۱ر دسمبر ۱۹۶۶ء صفحہ نمبر ۲۳۳ پر درج ہے۔

ماہنامہ اذان کراچی کے بانی ۱۸۸۷ء دہلی میں پیدا ہونے والے مولانا سید امیر حمزہ نقوی کے فرزند صوفی شاعر ادیب وخطیب تھے۔ ۳ر دسمبر ۱۹۶۵ء کو بزرگ شاعر سید ناصر جلالی دہلوی کا کراچی میں ہی انتقال ہوا۔ خاموش کالونی کراچی کا پرانا قبرستان ان کی ابدی آرام گاہ بنا۔ سندھی زبان میں ترجمہ وتفسیر قرآن پاک ان کی اہم کاوش ہے۔

ریڈیو پاکستان کے کئی پروڈیوسر اسکرپٹ رائیٹر اور کہنہ مشق شاعر و اہلِ قلم ان کے مداح رہے۔

نعت

یہی ہے ناصرِ مسکیں کی آرزو یا رب
قبول بزمِ محمدؐ میں ہو سلام مرا

کس کا ہوں طلبگار بتا دو تمہیں ناصر
مکی ، مدنی ، ہاشمی و مطلبی کا

تعظیم کر رہی ہے میری تمام دنیا
کس باوقار کی میں تعظیم کر رہا ہوں

دنیا سے نہیں مطلب ، مطلب ہے تو بس یہ ہے
لے کر میں حضوری میں نذرِ دل و جاں جاؤں

غزل

اہل جہاں سمجھتے ہیں کھویا گیا ہوں میں
اکثر مقام قدس میں دیکھا گیا ہوں میں

دنیا کو جستجو سے کہیں جب نہ مل سکا
آخر تو بزم دوست میں پایا گیا ہوں میں

احباب دیکھتے ہیں حقارت سے کس لیے
آیا نہیں ہوں بزم میں لایا گیا ہوں میں

پنہاں ہے ہر کلام میں فرزانگیٔ عشق
دیوانہ ہر کلام سے سمجھا گیا ہوں میں

گلشن کی ہر بہار سے رخصت ہوئی بہار
گلشن کی ہر بہار سے گھبرا گیا ہوں میں

کتنی طویل عمر ہے، کتنا دراز سن
جینے سے اپنے آپ بھی اکتا گیا ہوں میں

دنیا کی کشمکش سے کنارا کیے ہوئے
ناصر حضورِ دوست میں اب آ گیا ہوں میں

ڈاکٹر نثار احمد نثار

ڈاکٹر نثار احمد نثار ۲/ جنوری ۱۹۵۰ء میں کراچی میں پیدا ہوئے، والد کا نام احمد دہلوی تھا۔ ابتدا آپ نے بھی اپنے آپ کو دہلوی لکھا، پھر دہلوی لکھنا موقوف کر دیا۔ البتہ ہومیو پیتھک ڈاکٹر ہونے کی رعایت سے خود کو ڈاکٹر لکھتے ہیں اور ڈاکٹر پکارے جاتے ہیں، ۱۹۶۶ء میں گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول نمبر ا کورنگی نمبر ۴ سے میٹرک کیا، ۱۹۶۷ء میں گورنمنٹ ٹیچرز ٹریننگ کالج برنس روڈ، کراچی سے پرائمری ٹیچرز سرٹیفکیٹ کورس کیا، یہی زمانہ سفر شاعری کے آغاز کا ہے، مزید تعلیم کے حصول کا سفر ایم اے، بی ایڈ اور ایم ایڈ تک جاری رہا۔

۱۹۶۸ء میں کالج کے سالانہ میگزین کے لیے ایک نظم "معلم" لکھی جس پر کالج کے پروفیسر محمد نعیم عارفی سے اصلاح لی، اصلاح کا سلسلہ جاری رہا، جب نعیم عارفی سعودی عرب چلے گئے تو ۱۹۸۰ء میں شامی اشرفی سے اصلاح لی، موصوف عالم دین تھے اور لانڈھی میں نورانی مسجد کے امام وخطیب تھے۔ بعد ازاں صابر براری مرحوم، ڈاکٹر شاہد الوری مرحوم اختر سعیدی اور مستان شاہ سے بھی مشورۂ سخن کرتے رہے، ۲۰۰۲ء میں راغب مراد آبادی کے تلامذہ میں باقاعدہ شامل ہوئے اور، ۱۷ اویں گریڈ میں گورنمنٹ آف سندھ محکمۂ تعلیم میں ملازم رہے۔

مہتاب شاہ ویلفیئر سوسائٹی رجسٹرڈ کے جنرل سیکریٹری ہیں، پاکستان اتحاد احباب ویلفیئر سوسائٹی رجسٹرڈ کے جوائنٹ سیکریٹری ہیں، سندھ سپروائزر یونین رجسٹرڈ کے خازن ہیں، "بزم یارانِ سخن" کراچی کے چیئرمین، سروس آف ایجوکیشن سوسائٹی کے پبلسٹی سیکریٹری بھی ہیں، ہفت روزہ "پرائم اسپورٹس" کراچی، ہفت روزہ "دفاعِ پاکستان" کراچی اور ماہنامہ "شعلے" کراچی میں اعزازی رپورٹر ہیں، ماہنامہ "صدائے احباب" کراچی کے اعزازی ایڈیٹر بنائے گئے ہیں، مشہور شاعر شاہد الوری مرحوم آپ کے سسر تھے۔

ڈاکٹر نثار احمد نثار نے غزل گوئی کے ساتھ ساتھ تنقید بھی لکھی، ان کے نعتیہ مجموعے کا نام "نور الہدیٰ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)" ہے جو ۲۰۰۴ء میں کراچی سے شائع ہوا۔

◆◆◆

نعت

نور الھدیٰ محمدؐ کیف الوریٰ محمدؐ
ہیں سر بہ سر نقیب شانِ خدا محمدؐ

ویسے تو ہر نبیؑ ہے شہکارِ علم لیکن
عرفان و آگہی کی ہیں انتہا محمدؐ

سب کچھ بنایا رب نے ان کی خوشی کی خاطر
تخلیقِ دو جہاں کی ٹھہرے بنا محمدؐ

طوفان کیوں نہ گزرے کشتی سے منہ چھپا کر
لکھا ہوا اگر ہو کشتی پہ یا محمدؐ

دربارِ مصطفیٰؐ سے ملتے ہیں دین و دنیا
مخلوق کبریا کا ہیں مدعا محمدؐ

خوفِ حسابِ محشر لاحق تو ہے ہمیں بھی
ہم عاصیوں کے لیکن ہیں آسرا محمدؐ

تب سے نثار مجھ پر لطفِ خدا ہے بے حد
وردِ زباں ہے جب سے صلِّ علیٰ محمدؐ

غزل

زخم تازہ ہوگیا میرے دلِ بیمار کا
جب سُنا اس کی زباں سے تذکرہ اغیار کا

ہجر کی تاریکیوں میں کٹ رہی ہے زندگی
طائرِ دل منتظر ہے صبح کے آثار کا

بارشِ سنگِ ملامت کا بھی ہوتا ہے اثر
شرط یہ ہے اس کی زد میں جسم ہو خود دار کا

کیا تدارک کر رہے ہیں آج کے اہلِ ہنر
مشرقی تہذیب کی گرتی ہوئی دیوار کا

لب کشائی جرم ہے شہرِ نگاراں میں اگر
کام اشکوں سے میں لوں گا قوتِ اظہار کا

سُرخیوں سے آرہی ہے بو تعصب کی نثار
ہر ورق ڈوبا ہُوا ہے زہر میں اخبار کا

نسیم سحر

راولپنڈی کی قدیم تاریخ تو اپنی جگہ موجود ہے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی یہاں پر تاریخی واقعات رونما ہوئے ہیں۔ یہاں کے لیاقت باغ میں قائدِ ملت لیاقت علی خان ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو شہید کر دیئے گئے۔ جس سے ہمارے جمہوری عمل کو نقصان پہنچا۔ اس شہادت سے جاگیرداروں کو ملک پر گرفت کرنے میں مدد ملی۔ ٹھیک ۵۶ سال کے بعد اسی تاریخ کو دہرایا گیا۔ ۲۷ دسمبر ۲۰۰۷ء کو دو (۲) مرتبہ وزیرِ اعظم رہنے کے بعد تیسری مرتبہ ممکنہ وزیرِ اعظم بے نظیر بھٹو جمہوری عمل کے تسلسل کی خواہش رکھتی تھیں ان کو بھی قائدِ ملت کی طرح شہید کر دیا گیا۔ ہم آج بھی وہیں کھڑے ہیں جہاں کل کھڑے تھے۔

محمد نسیم ملک ۱۹۴۱ء میں راولپنڈی میں ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جہاں شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے افراد اس خاندان میں پہلے ہی سے موجود تھے۔ نسیم ملک کو ادبی دنیا میں نسیم سحر کے نام سے جانا جاتا ہے۔ مسلم ہائی اسکول نمبر 2 رتی محلہ سے ۱۹۶۰ء میں میٹرک پاس کیا۔ اس زمانے کے اساتذہ طلبہ کو اپنے بچوں کی طرح انسان بنانے میں مصروف رہا کرتے تھے۔ بی اے پاس کرنے کے بعد حالات زندگی کو بہتر بنانے میں لگ گئے۔ تاہم خاندانی وراثت میں آنے والی علمی سمجھ بوجھ نے انہیں متحرک رکھا۔

نسیم سحر سچے انسان ہیں۔ اپنے ماضی و حال پر واضح گفتگو کرتے ہیں پدرم سلطان بود کے قائل نہیں ان دنوں سعودیہ میں ملازمت کر رہے ہیں کئی بار عمرہ حج کی سعادت حاصل کر چکے ہیں وہ ایک ایسے ملک میں ملازمت کر رہے ہیں جہاں دین و دنیا کی بہت ساری نعمتیں موجود ہیں۔ بار بار کی زیارت دل میں محبت و عقیدت کے چراغ ہی روشن نہیں کرتی بلکہ انسان کو غور و فکر کرنے کی بھی دعوت دیتی ہے۔ وہاں کا معاشرہ قرآن کا مطلوب مومن بننے کی ترغیب دیتا ہے۔ جناب کا نعتیہ مجموعہ "یہ جو سلسلے ہیں کلام کے" آپ اس کو پڑھ کر دیکھیں کہ اس میں کتنا داعیانہ جذبہ موجود ہے:

◆◆◆

نعت

خیرالبشرؐ کی ذات کا فیضان دیکھیے
شہرِ نبیؐ کو رشکِ خیابان دیکھیے

لائے ہیں تیرگی سے اسے روشنی میں وہ
نوعِ بشر پہ اُنؐ کا یہ احسان دیکھیے

کہنے لگا ہوں نعتِ رسولِ کریمؐ میں
حرف میں اب ایک گلستان دیکھیے

بس اُن کی پیروی میں ہے اپنی سلامتی
سمجھیں گے کب یہ نکتہ مسلمان دیکھیے

سارے یقیں اُنہیؐ نے کیے ہیں عطا تسیم
میں کیا ہوں اور اُن پہ مرا مان دیکھیے

غزل

یہ مختلف مزاج کی رعنائی دیکھنا
پانی پہ مدتوں سے جمی کائی دیکھنا

جب بھی کسی پہاڑ کی اونچائی دیکھنا
آگے جو آنے والی ہے وہ کھائی دیکھنا

افسوس میں دکھا نہ سکوں گا وہ معجزہ
جو چاہتی ہے چشم تمنائی دیکھنا

کمزور پڑنے والے ہیں رشتے قریب کے
ہونے لگا ہے اب جو مرے بھائی دیکھنا

یکجا ہیں اور پھر بھی ہیں گم اپنے آپ میں
ہر فرد خاندان کی تنہائی دیکھنا

اب زہر ہی پلاتے ہیں تریاق کی جگہ
رائج ہے اب جو طرز مسیحائی دیکھنا

لشکر کے سب سپاہی مرے دوست تھے حکیم
میدان جنگ میں مری پسپائی دیکھنا

نصیرؔ کوٹی

(۱۹۳۶ء۔۲۰۱۶ء)

نصیر اللہ خان قصبہ کوٹ ضلع فتح پوری (ہسوہ) اُتر پردیش صوبے بھارت میں ۵ ستمبر ۱۹۳۶ء کو پیدا ہوئے۔ شعر و ادب کی دنیا میں انھیں نصیر کوٹی کے نام سے پہچانا اور یاد کیا جاتا ہے، اپنے ہم وطن استاد شاعر محمود الحسن المعروف ''بہار کوٹی'' سے شرفِ تلمذ حاصل کیا۔

تقسیم کے بعد پاکستان ہجرت کی اور کراچی کو اپنا دار القرار بنایا۔ انٹر پاس کرنے کے بعد فاضل اُردو کی سند حاصل کر چکے تھے، درس و تدریس کے مقدس شعبے سے وابستہ ہوئے اور اس عہد میں جب تک کہ انسانی قدریں پامال نہیں ہوئی تھیں، رشتۂ جسم و روح کو برقرار رکھنے کے لیے سادہ تختیوں اور طلب علم کے متوالے دلوں پر اَن مٹ نقوش ثبت کرتے رہے، نئی کراچی میں قیام کو ۴۰ برس ہوئے مختلف مدارس، سیکنڈری اسکولز میں بہ طور اُستاد اور پھر صدر مدرس کی حیثیت سے سبک دوش ہوئے، علاقے میں اُن کی نیک نامی کی شہرت آج بھی اسی طرح ہے۔

نصیر کوٹی مرنجان مرنج ہی نہیں زود رنج بھی ہیں، روایتی انداز میں خیر مقدمی کلمات اُن کی زبان سے بھلے لگتے ہیں۔ شائستگی، تہذیب، رواداری اور پاس داری کی اُن کے یہاں کمی نہیں، تاہم اگر کسی کی طرف سے دل میں میل آجائے تو برملا اظہار سے نہیں چوکتے۔ صاف دل اور صاف گو انسان ہیں۔ زیادہ دیر تک رنجش اُن کے سینے میں قیام نہیں کر سکتی، اپنا دل صاف کر لیتے ہیں۔

نعتیہ اظہار میں احترام اور حدِ عبد و معبود کا التزام روا رکھتے ہیں، اُن کا خیال ہے ''جسے نبیؐ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سیرت پر چلنے سے عار ہے اور محض حبِ نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا دعوے دار ہے وہ نہ اچھی نعت لکھ سکتا ہے نہ ہی اچھا انسان بن سکتا ہے۔'' غزلوں کے مجموعے ''لذتِ آزار'' کے بعد نعتوں کا مجموعہ ''سیلِ تجلی'' بھی اشاعت پذیر ہو کر قبولِ عام کی سند حاصل کر چکا ہے۔

21 دسمبر 2016ء کو نصیر کوٹی جہانِ رنگ و بو چھوڑ کر سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔ کراچی کے ادبی حلقوں میں تادیر ان کی سانحۂ ارتحال کو یاد رکھا جائے گا۔ ان سے استفادہ کرنے والوں کو چاہیے کہ ان کی ادبی خدمات پر بھرپور کام کریں۔

نعت

دشمنِ جاں بھی کیا کرتے تھے مدحت آپؐ کی
کذب پر غالب رہی پیہم صداقت آپؐ کی

ماورائے نقص اندازِ عقیدت ہو اگر
شیشۂ دل میں نظر آتی ہے صورت آپؐ کی

جس نے اپنایا اُسے اوجِ ثریا مل گیا
سرخرو کرتی ہے انساں کو ہدایت آپؐ کی

آسماں بجلی گرائے، آگ پھیلائے زمیں
ٹوٹ جائے گر خطا کاروں سے نسبت آپؐ کی

کس روش پر آپؐ نے چلنے کو فرمایا مگر
کس ڈگر پر جا رہی ہے آج امّت آپؐ کی

کیا ہوا کج فہم ہیں اب تک اگر ناآشنا
ہر نظر کی دسترس میں کب ہے عظمت آپؐ کی

غزل

بزم رنگ و بو کا ہوں میں رازداں تنہا
ہے مری زمیں تنہا اور آسماں تنہا

رہروانِ منزل ہی جب بچھڑ چکے سارے
کیا کرے گا منزل پر میر کارواں تنہا

رہ گزر میں یکسوئی انجمن میں تنہائی
ہم ترے تصور میں تھے کہاں کہاں تنہا

زندگی کی راہیں اب پر خطر ہیں اس درجہ
آپ چل نہیں سکتے دو قدم یہاں تنہا

ذوق بندگی ہو تو بندگی کو کافی ہیں
اک مری جبیں تنہا تیرا آستاں تنہا

ان سے حال دل کہنا اے نصیرؔ لازم ہے
خامشی نہیں ہوتی غم کی ترجماں تنہا

نظیر احمد شاہجہاں پوری

(۱۹۰۸......۱۹۹۸ء)

سید نظیر علی نظیر رام پوری کے ہم عصر دبستانِ لانڈھی کورنگی کے معروف شاعر نظیر احمد خان نظیر شاہ جہاں پوری ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ نعتیہ شعری مجموعہ "ارم در ارم" شائع ہو چکا ہے۔ لانڈھی میں قیام رہا۔ جون ۱۹۹۸ء کو انتقال ہوا اور وہیں آخری آرام گاہ بنی۔

بزمِ حمیدی، پیرزادہ عاشق کیرانوی، اسماعیل انیس، ڈاکٹر تقی دہلوی، جوہر سعیدی، مہتاب نظیری، نظیر رام پوری، احتاب علی کمال نقوی، مہر نقوی، ڈاکٹر یوسف جاوید کے ہمراہ گاہے گاہے مشاعروں میں شریک رہے۔ شعرائے لانڈھی کورنگی میں آپ کو شامل کیا جاتا ہے۔

◆◆◆

نعت

دل چاہتا ہے مدحتِ خیرالبشرؐ کروں
کاغذ پہ حرف حرف کو شمس و قمر کروں

اپنی عقیدتوں کو شریکِ سفر کروں
اس طرح نعت گوئی کو پاکیزہ تر کروں

محویّتِ خیالِ مدینہ رہے مدام
قرباں تصورات میں قلب و نظر کروں

ہر نقشِ رہ گزار کو چوموں ہزار بار
اس طرح طے مدینے کی ہر رہ گزر کروں

بن جاؤں بے نظیر فنا ہو کے اے نظیر
جاں کو نثار روضۂ خیرالبشرؐ کروں

غزل

اُن کے در پر یوں کر آئے سجدۂ مستانہ ہم
کھینچ کر لے آئے روحِ کعبہ و بت خانہ ہم

بے خودی سی بے خودی ہے اب نہیں یہ بھی خبر
اپنا قصہ کہہ رہے ہیں یا ترا افسانہ ہم

آج تک لکھتے رہے خونِ جگر سے حالِ دل
اب بدل دیں گے نظامِ سرخیِ افسانہ ہم

وہ اگر خود بیں ہیں دل بھی ہے ہمارا خود پسند
گفتگو ان سے کریں گے آج بے باکانہ ہم

تم مجسم کیف و مستی ہم سراپا ذوق و شوق
زینتِ مے خانہ تم ہو رونقِ مے خانہ ہم

مدعا یہ ہے کہ قائم ہو کوئی عنوانِ حشر
عشق کا قصہ کہیں یا حسن کا افسانہ ہم

تابِ نظارہ پہ ہم کو ناز تھا بے حد نظیرؔ
ہو گئے محفل میں اس کی آپ سے بیگانہ ہم

نعیم صدیقی

فضل الرحمٰن نعیم صدیقی ۱۹۲۲ء میں چکوال ضلع جہلم میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد حضرت شاہ مراد، پنجابی کے مشہور شاعر، کی درگاہ کے سجادہ نشین تھے۔

نعیم صدیقی نے ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی۔ ۱۹۴۱ء میں مولانا مودودی نے جماعتِ اسلامی کی داغ بیل ڈالی تو نعیم صدیق بھی اس میں شامل ہو گئے۔ قیامِ پاکستان تک دارالعلوم پٹھان کوٹ میں مقیم رہے۔ جماعتِ اسلامی میں مختلف ادوار میں مختلف عہدوں پر کام کرتے رہے۔ ۱۹۳۵ء میں ''تعمیرِ انسانیت'' ۱۹۴۹ء میں ہفت روزہ ''شہاب'' اور ۱۹۶۲ء میں ماہنامہ ''سیارہ'' جاری کیا۔ ''سیارہ'' نے قابلِ قدر نمبر نکالے۔ مولانا مودودی کے سانحۂ ارتحال کے بعد ''ترجمان القرآن'' کی ادارتی ذمے داریاں بھی سنبھال لیں۔ سیرت پر اُن کی تصنیف ''محسنِ انسانیت'' ایک نئے انداز کی کتاب ہے۔ ایک اچھے ناقد اور افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک پُرگو اور تحریکی شاعر ہیں۔ متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ''نور کی ندیاں رواں'' ایک اعلیٰ درجے کا نعتیہ مجموعہ ہے۔

ڈاکٹر عاصی کرنالی ''اردو حمد و نعت پر فارسی شعری روایت کا اثر'' صفحہ ۵۹۵ پر رقم طراز ہیں:

''نعیم صدیقی اپنی نعتیہ تصنیف ''نور کی ندیاں'' کے خود نوشت دیباچے میں نعت نگاری کے یہی خطوط متعین کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں'' میرے سامنے تین تقاضے بیک وقت رہتے ہیں حضورؐ کی دعوت انقلاب کا ابھارنا، اس انقلاب کی روح کو کارفرما کرنے کے لیے نعت کے پیرایوں میں نئے اضافی تجربے کرنا اور فنی ولسانی حسن کی حباب آسا نازک لطافتوں کا تحفظ کرنا بلکہ ان کو نشو و نما دینا۔''

◆◆◆

نعت

ٹھوکریں کھا کے اک زمانے تک
آ گیا تیرے آستانے تک

عمر ساری قفس میں کاٹی ہے
آج پہنچا ہوں آشیانے تک

زندگی اپنا ساتھ دے کہ نہ دے
تیرگی کا حصار ڈھانے تک

دیکھیے کتنے گھر اُجڑتے ہیں
ایک دنیا نئی بسانے تک

ایک شب ہے یہ دے گی ساتھ کہاں
قصۂ دردِ دل سنانے تک

غزل

سبک سبک کبھی گزرے ہیں وہ صبا کی طرح
کبھی برس گئے جذبوں پہ وہ گھٹا کی طرح

اذیتوں کا تسلسل، عقوبتوں کا سموم
یہ زندگی ہے کسی جرم کی سزا کی طرح

قصور وارِ محبت ہیں ہم ' ہمارے لیے
کوئی سزا نہیں اس ترکِ اعتنا کی طرح

ہمیشہ ڈرتے ' سکڑتے ، جھجکتے رہتے رہے
نباہی ہم نے شرافت ، مگر خطا کی طرح

تمہارے ہاتھ کی شمشیر یا عدو کے ہوں تیر
کسی کی ضرب نہیں ہے مری دعا کی طرح

ہم اپنی ایک جبیں کو کہاں کہاں بانٹیں
ہر ایک سجدہ طلب ہم سے ہے خدا کی طرح

بغور لرزشِ برگِ سمن کو دیکھتا ہوں
کہ اس میں بات ہے کوئی تری ادا کی طرح

نگار فاروقی

(۱۹۲۴ء.....۲۰۰۴ء)

آگرہ گہوارہ علم و ادب کے ساتھ ساتھ صوفیاء، علماء، مشائخ اور دیگر علوم و فنون سے تعلق رکھنے والوں کا بھی گہوارہ رہا ہے۔ شاہ جہاں کا تعمیر کردہ تاج محل اپنی خوب صورتی و دل نوازی میں اپنی مثال آپ ہے۔ حکیم محبوب حسین کے گھر ماہ اکتوبر 1924ء کو ضامن حسین پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دہلی میں حاصل کی۔ والدہ کے ساتھ ہجرت کر کے 1949ء میں پاکستان آئے۔ کراچی کے علاقے پاپوش نگر میں آباد ہو گئے۔

ضامن حسین کو ادبی دنیا میں نگار فاروقی کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ شاعری کا جرثومہ خاندانی طور پر منتقل ہوا۔ کراچی اپنی تہذیبی و تمدنی اعتبار سے ملک کے تمام شہروں سے مختلف ماحول رکھتا ہے اور اس کی آب و ہوا میں علم و ادب کی کشش ہمہ وقت موجود رہتی ہے۔ کہیں کا بھی رہنے والا ہو جب یہاں آتا ہے یہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔

نگار فاروقی نے شعر و ادب میں خاصا نام کمایا۔ ان کے شاعرانہ کلام پر تو اہل نقد و نظر ہی رائے قائم کر سکتے ہیں۔ پہلا مجموعہ "بیت غزال" دوسرا مجموعہ "حرف حرف کائنات" اس کے علاوہ نعتوں کا مجموعہ "ازل تا ابد" جبکہ "چراغ العالمین" حمدیہ مجموعہ ہے۔ غیر مطبوعہ مجموعے "ایک آگ غم تنہائی کی"، "رشتوں کی فصل" ہائیکو ہیں۔

اگر پاکستان میں شعرائے غزل کے کلام کو عہد بہ عہد تعین کر کے پڑھا جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ پاکستان کے سیاسی، سماجی وغیرہ پس منظر کو شعراء نے اشعار کے قالب میں ڈھالنے کی خوبصورت کوشش کی ہے۔ یہی حال پاکستان میں فروغ پانے والے نعتیہ ادب کا ہے۔ یہاں کے شعراء کی نعتوں میں بھی یہ تمام چیزیں موجود ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ بہ نظر غائر ان کا مطالعہ کیا جائے۔

آگرہ کا ضامن حسین جو ادبی دنیا میں نگار فاروقی کہلاتا ہے۔ 2004ء میں خاک کراچی میں پنہاں ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم کا دروازہ اپنی شان سے ان کے لیے کشادہ کر دے:

نعت

نہ کیوں لفظوں سے پھوٹے روشنی، مضموں سے خوشبو
جو شامل نعت کے اشعار میں دل کا لہو کر لیں

بٹے ہیں اس قدر فرقوں میں پہچانے نہیں جاتے
کہاں ہمت کسی سے دین پر ہم گفتگو کر لیں

کیا ہے دامنِ اسلام چاک اپنے ہی لوگوں نے
ہمیں مہلت نہیں اتنی کہ دامن کو رفو کر لیں

قیامت میں رسولؐ اللہ کو کیا منہ دکھائیں گے
سرِ بزمِ جہاں تو جتنا چاہیں ہاؤ ہو کر لیں

مگر سچائی جو اسلام کی ہے مٹ نہیں سکتی
مخالف بولہب سی دشمنی بھی ہو بہو کر لیں

نگارؔ آقاؐ سے اپنے کیا کہیں گے یہ تو ہم سوچیں
مدینے میں پہنچنے ہی سے پہلے جستجو کر لیں

غزل

میرا جنوں مرے لیے رسوائی بن گیا
پھر یہ ہوا کہ شہر تماشائی بن گیا

اُترا جو میری روح میں خوشبو تھا، رنگ تھا
سمٹا تو میری آنکھ کی بینائی بن گیا

دیکھا تھا اس کو میں نے شب ماہتاب میں
یہ اتفاق وجہ شناسائی بن گیا

میں بھی عذاب ترک تعلق میں گھر گیا
وہ بھی سمندروں کی سی گہرائی بن گیا

یہ کھیل دھوپ چھاؤں کے کتنے عجیب ہیں
جو اجنبی تھا آج مرا بھائی بن گیا

کہتے ہیں جس کو شاعری آساں نہ تھی نگار
اب یہ ہنر بھی قافیہ پیمائی بن گیا

پروفیسر ہارون الرشید

کلکتہ کا جب ذکر آتا ہے تو ماضی کے دریچوں سے اَن گنت تاریخی واقعات تسلسل کے ساتھ نظروں کے سامنے فلم کی مانند متحرک ہو جاتے ہیں۔ علم و ادب اور تاریخ کے حوالے سے اس شہر کی جو اہمیت ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ فورٹ ولیم کالج اُردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کا مرکز رہا ہے۔ اس شہر میں تحریکِ آزادی کے مجاہد اور ''الہلال'' کے ایڈیٹر نے علم و ادب کی ایک نئی تاریخ مرتب کی۔ تحریکِ آزادیٔ پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والوں کا تعلق بھی اِسی شہر سے رہا ہے، علی الخصوص مشرقی پاکستان میں مقیم اور سکونت اختیار کرنے والے محبِ وطن پاکستانیوں کا ایک مضبوط حوالہ اِسی شہر کی نسبت سے بنتا رہا ہے۔

غازی پور، اُتر پردیش سے ہجرت کر کے کلکتہ کو بسانے والے ایک خاندان کے فرد غلام حسین کے فرزند ہارون الرشید نے اِسی کلکتہ میں ۳؍ جولائی ۱۹۳۷ء کو جنم لیا اور یہ خاندان ۱۹۵۰ء میں جب دوسری مرتبہ آمادۂ ہجرت ہوا تو فقط ۱۳؍ برس کی عمر میں ہارون الرشید کو مشرقی پاکستان کا دارالحکومت ڈھاکا بسانا پڑا، اور وہ اِس قافلے میں شریک ہو گئے جس نے پاکستان کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی ترقی کے عمل کو تیز تر کرنے اور اس کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لیے پے در پے قربانیاں دے کر عملی ثبوت بہم پہنچایا۔

ہارون الرشید نے ڈھاکا سے میٹرک، انٹر، بی اے کے امتحانات پاس کیے اور ۲۳؍ برس کی عمر میں ڈھاکا یونی ورسٹی سے ہی اُردو ادب میں ایم اے کیا۔

''۱۸۵۷ء کے بعد اُردو شاعری کے میلانات'' کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی سند کے لیے اُن کا ڈھاکا یونی ورسٹی میں اندراج ہو چکا تھا۔ تاہم بوجوہ پی ایچ ڈی کا مرحلہ طے نہ ہو سکا۔ اس کا ازالہ اُنھوں نے ''اُردو ادب اور اسلام'' کے عنوان سے ایک تحقیقی و تنقیدی کتاب لکھ کر کیا جو دو جلدوں میں ''اسلامک پبلی کیشن لاہور'' سے زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر اُردو دنیا میں معتبر

قارئین، اہلِ قلم اور ناقدین سے قبولیت کا اعزاز حاصل کر چکی ہے۔ اُردو زبان میں تنقیدی پیرائے میں اسلامی فکروفن کو قبل ازیں اس طرح شاذ ہی اجاگر کیا گیا ہوگا، انھوں نے اُردو ادب کا جائزہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں لیا ہے۔

پروفیسر ہارون الرشید ڈھاکا اور کراچی کے مختلف کالجوں میں تدریس کے فرائض ادا کرتے رہے، اور اپنے تنقیدی رجحان کی عکاسی اپنی کتابوں میں کرتے ہوئے باشعور، اہلِ عقل و دانش سے خراجِ تحسین حاصل کرتے رہے۔ قدیم وجدید علوم کو دینی علوم سے ہم آہنگ رکھنے کی کوشش میں اُن کی مساعی کی داد اُن کے حامیوں نے بھی دی اور "دوسری صف" کے اختلاف رکھنے والے سمجھ دار اہلِ بینش نے بھی۔ تذکروں سے پروفیسر ہارون الرشید کی دل چسپی کی آئینہ دار اُن کی کتاب "محفل جو اُجڑ گئی" میں مشرقی پاکستان میں اُردو ادب کا اجمالی جائزہ پیش کرنے کے علاوہ وہاں مستقل قیام کرنے والے یا عارضی طور پر بسے رہنے والے اہلِ قلم، ادیبوں، شاعروں، صحافیوں کی اُردو زبان وادب کی خدمات، تصانیف، بزرگ دانش وروں کی محفلوں کا ذکر دل نشین پیرائے میں کیا گیا ہے۔ کتاب کے اختتامیہ میں اُن کتابوں کی فہرست پیش کی گئی جو اس دور میں شائع ہوئی ہیں۔

پروفیسر ہارون الرشید کے پاس نثر کے ساتھ ہی قدرت کی ودیعت کردہ شعری وتخلیقی اظہار کی صلاحیت بھی موجود رہی ہے جسے بروئے کار لاتے ہوئے انھوں نے شاعری کی اور نعتیہ اظہار کے لیے اس پیرایہ کو منتخب کیا، اُن کا نعتیہ مجموعہ "طوبیٰ" حمد ونعت اور منقبت پر مشتمل "خاصے" کی چیز ہے، جب کہ پیش آمدہ کتابوں کا بھی اہلِ ذوق انتظار کر رہے ہیں۔

مطبوعہ کتابیں:

(الف) اردو ادب (تاریخ، تنقید، تحقیق، تذکرہ)

ا۔ "اُردو ادب اور اسلام" (جلدِ اول، شعری جائزہ) ۲۔ "اُردو ادب اور اسلام" (جلدِ دوم نثری جائزہ)، ۳۔ محفل جو اجڑ گئی (سابق مشرقی پاکستان کی ادبی تاریخ وتذکرہ)، ۴۔ دو ہجرتوں کے اہلِ قلم (تاریخ وتذکرہ)، ۵۔ نوائے مشرق (تاریخ وتذکرہ)، ۶۔ اردو کا دینی ادب (تاریخ وتنقید)، ۷۔ اردو کا دینی ادب (ترمیم واضافہ شدہ دوسرا ایڈیشن)، ۸۔ اردو کا جدید نثری ادب)،

(تاریخ وتنقید)،۹۔ جدید اردو شاعری (تاریخ وتنقید)،۱۰۔ اردو کا قدیم ادب (تاریخ وتنقید)
،۱۱۔ سرگزشتِ آصف (علامہ آصف بنارسی کی سوانح/کلام)

ب۔ دینی اور فکری جائزے

۱۲۔ ملتِ واحدہ (ملت کا سیاسی جائزہ)،۱۳۔ نیاز فتح پوری کے مذہبی افکار،۱۴۔ تحقیق و اجتہاد (سات محقق علماء کے افکار کا جائزہ)،۱۵۔ دین ودانش (۲۰ علمی کتابوں کا جائزہ)،۱۶۔ ہمارا معاشرہ اور اسلام،۱۷۔ غلام احمد پرویز کے افکار،۱۸۔ اردو نعت گوئی کا تنقیدی جائزہ،۱۹۔ ایک گم نام دینی محقق (محمد عثمان قریشی مرحوم)،عرفان درویش (تاثراتی مضامین)

ج۔ شاعری

۲۱۔ طوبیٰ (حمد، نعت، منقبت)،۲۲۔ متاعِ درد (سانحہ مشرقی پاکستان سے متعلق شعری مجموعہ) ۲۳۔ نقوش سارے (کلیات)،۲۴۔ منقبتِ صحابہ کرام (انتخاب) ۲۵۔ سوغات (بچوں کے لیے نظمیں)،۲۶۔ نوائے پریشان (اشعار)

د۔ ناول

۲۷۔ اپنے لہو کی آگ میں۔ ۲۸۔ منزل ہے کہاں تیری!

و۔ خودنوشت

۲۹۔ زندگی نامہ

زیرِ طبع

۳۰۔ اسلامی ادب

غیر مطبوعہ

۳۱۔ نقد ونظر (تنقیدی مضامین) ۳۲۔ فکر وفن (مضامین، تبصرے، تجزیے)
۳۳۔ نگارشاتِ ہارون۔ اہلِ علم کی نظر میں (مرتب: انور فرہاد)
پروفیسر موصوف کا قیام اورنگی ٹاؤن میں رہا ہے اور اب اُدھر کئی برس سے نارتھ کراچی میں مقیم ہیں۔

◆◆◆

نعت

دیکھ لو میرا معیار ذوقِ سفر
میرا ہادی و رہبر ہے خیر البشرؐ

علم و حکمت کا منبع تھی جس کی نظر
فیض سے اس کے رخشاں ہے میرا ہنر

میرا محبوب ، خالق کا محبوب ہے
داد پائے نہ کیوں میرا حسنِ نظر

اس کی ٹھوکر میں کیوں جاہِ دنیا نہ ہو
جس کے قدموں میں ہوں سیکڑوں تاجور

سیرتِ مصطفیٰؐ کو نہ اپنائے جو
ملک و ملت کا کیسے بنے راہبر

دعویٔ الفت کا ہے اور نہیں اتباع
کس کو دیتے ہیں دھوکا یہ " اہلِ نظر "

کہہ دو ہاروںؔ ، دانشوروں سے یہ تم
اتباعِ نبیؐ میں ہے سارا ہنر!

غزل

جلنے لگی ہے رات، جلانے لگی ہے رات
خوابیدہ حسرتوں کو جگانے لگی ہے رات

آنے لگا ہے یاد غزالوں کا بانکپن
ہلچل سی ایک دل میں مچانے لگی ہے رات

میخانۂ الم ہے کھلا آؤ دوستو!
بھر بھر کے جامِ درد پلانے لگی ہے رات

عبرت کے بے شمار تماشے ہیں سامنے
کیا کیا مری نظر کو دکھانے لگی ہے رات

مژدہ ہے آج دیدۂ بیدار کے لیے
رازِ دروں سے پردہ اُٹھانے لگی ہے رات

وہ ماہتابِ شوق کہ جس کی تھی جستجو
جلوہ اسی کا آج دکھانے لگی ہے رات

ہارونؔ! آج نیند نہ آئے گی رات بھر
نغمہ دلِ حزیں کا سُنانے لگی ہے رات

یوسف راہی چاٹگامی

یوسف راہی چاٹگامی مشرقی پاکستان میں 1953ء میں پیدا ہوئے وہیں۔ ان کی تعلیم وتربیت کے مدارج طے ہوئے۔ کالج کے زمانے سے ہی ادبی مشاغل شروع ہو گئے تھے جس وقت جس وقت سانحۂ مشرقی پاکستان وجود میں آیا اس وقت ایک متحرک صحافی کا کردار ادا کر رہے تھے۔

1983ء میں پاکستان آئے اور روزنامہ جسارت سے اپنی ادبی اور صحافتی زندگی کا آغاز کیا سابقہ مشرقی پاکستان اور مشرقی پاکستان سے آنے والے افراد کے مسائل سے پردہ اٹھاتے رہے اور مستقل بنیادوں پر آج بھی وہ لکھ رہے ہیں۔

یوسف راہی کی غزلوں کا مجموعہ "اشکِ سوزاں" کے نام سے 2011ء میں شائع ہو کر ادبی حلقوں میں آیا۔ اس مجموعے کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور اہلِ ادب اپنی بساط کے مطابق اپنی آراء کا اظہار کرتے رہے۔

یوسف راہی چاٹگامی کو نعتِ سرورِ دو عالمؐ سے لگاؤ ہے اور ان کی نعتیں محبت وعقیدت کی لامتناہی داستانیں اپنے دامن میں رکھتی ہیں۔ "ولائے محمد ﷺ" میں جو مضامین بے ساختہ دل میں اُترتے ہیں ان میں مہاجرت کی کسک رکھنے والے اشعار ہیں اور شاید یہ اس لیے ممکن ہوا کہ انہوں نے خود بھی مہاجرت کی دشوار اور پر کٹھن مقامات کو مشرقی پاکستان میں دیکھا ہے جس کی جھلک اس نعتیہ مجموعے میں موجود ہے۔

یوسف راہی چاٹگامی کی نعتیں ہوں یا غزلیہ شاعری ان میں قومیت، پاکستانیت اور مذہب سے والہانہ لگاؤ موجود ہے آج کل ماہنامہ زاویہ نگاہ کے مدیر اور Intertaction کے مدیر منتظم ہیں۔

یوسف راہی چاٹگامی کا اہم کام یہ ہے کہ انہوں نے اردو شاعری کی ایک نئی صنف سخن "چوکھبی" کے نام سے اختراع کی ہے جو ابھی عہدِ طفولیت میں ہے جب یہ جوان ہو کر ادبی منظرنامے پر طلوع ہو گی تو ہر سخن گو اس کا شیدائی نظر آئے گا اور شعراء کی کثیر تعداد اس صنفِ سخن کی طرف متوجہ ہو گی اور یہ نئی صنفِ سخن پاکستان میں جاپان کی ہائیکو کی طرح مقبول ہو جائے گی۔

◆◆◆

نعت

مرے حضورؐ ہیں جلوہ فشاں مدینے میں
کہ آتے ہیں کبھی اہلِ جہاں مدینے میں

ملی ہے قلب کو مرے اماں مدینے میں
کہ ہیں حبیب خدائے جہاں مدینے میں

جبینِ شوق کے سجدے کہاں لٹاؤں میں
رسولِ پاکؐ کا ہے آستاں مدینے میں

نہیں ہے اس کے سوا اب کوئی تڑپ دل میں
بناؤں اپنا بھی میں آشیاں مدینے میں

مجھے یقین ہے اس بات کا کبھی نہ کبھی
بلائیں گے وہ مجھے بے گماں مدینے میں

کہی ہیں میں نے عقیدت سے جو نئی نعتیں
سُنا رہی ہے وہ نعتیں زباں مدینے میں

چلو کہ لوگ انہیؐ کی اماں میں رہتے ہیں
ملے گی تم کو بھی راحتؔ اماں مدینے میں

غزل

یہی نہیں کہ میں گھر بار چھوڑ آیا ہوں
تمام کوچہ و بازار چھوڑ آیا ہوں

ترے دیار کی ظلمت میں روشنی کے لیے
جنونِ عشق کے انوار چھوڑ آیا ہوں

کبھی تو لوگ ، زبانِ خموش کھولیں گے
متاعِ جراتِ اظہار چھوڑ آیا ہوں

یقین ہے کہ ابھارے گا اک نیا سورج
وہ حوصلہ جو سردار چھوڑ آیا ہوں

قدم، قدم پہ لہو سے جلا کے راہوں میں
چراغ عظمتِ کردار چھوڑ آیا ہوں

نبات و قند کی شامل مٹھاس ہے جس میں
محبتوں کی وہ گفتار چھوڑ آیا ہوں

میں اس کی انجمنِ رنگ و نور میں راحتؔ
مرا خلوص، مرا پیار چھوڑ آیا ہوں

یوسف ظفرؔ

(۱۹۱۴ـ۱۹۷۲)

شیخ محمد یوسف مری میں یکم دسمبر ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے۔ اُن کا قلمی نام یوسف ظفر ہے۔ ۱۹۳۶ء میں اُن کو جوشؔ ملیح آبادی کی ادارت میں نکلنے والے رسالہ ''کلیم'' اور جسٹس محمد دین ہمایوں کے رسالے ''ہمایوں'' میں کام کرنے کے مواقع ملے۔ قیامِ پاکستان سے قبل ''حلقۂ اربابِ ذوق'' کی نشستوں میں شرکت سے ادبی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔

میراجی نے جب تجویز پیش کی کہ حلقے میں پڑھی جانے والی تخلیقات پر صرف واہ واہ نہ کی جائے بلکہ اُسے نقد و نظر کے معیار پر پرکھا بھی جائے۔ تو میاں بشیر احمد ''ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح'' (نغمہ لکھنے والے) اور ایم ڈی تاثیر کی حمایت و ستائش کے علاوہ حکیم احمد شجاع، حرماں خیر آبادی، مضطر ہاشمی اور تاجور نجیب آبادی جیسے اہم لوگوں نے اِس تجویز کی مخالفت بھی کی۔ تاہم آگے چل کر سب متفق ہو گئے اور سب سے پہلی تنقیدی نشست سید عابد علی عابد پروفیسر اورینٹل کالج لاہور کی صدارت میں ہوئی جس میں یوسف ظفر نے اپنی غزل تنقید کے لیے پیش کی تھی۔

حلقۂ اربابِ ذوق میں متحرک ہونے کے بعد یوسف ظفر اور قیوم نظر نے اُس کو خاصا فعال کر دیا تھا۔ وجیہ السیما عرفانی بھی اُس کی نشستوں میں شریک ہوتے تھے۔ یوسف ظفر نے احسان دانش سے سلسلۂ تلمذ جوڑا مگر پھر اُنہوں نے یہ کہہ کر ''اب اُستاد شاگرد کا زمانہ نہیں رہا، ہر ایک کو خود کوشش کرنا چاہیے، اپنے سلسلۂ شاگردی کو ختم کر دیا تھا۔

یوسف ظفر نے مروّجہ تعلیم کے حصول کے لیے ۱۹۳۶ء میں بی اے کیا اور شعبۂ صحافت سے وابستہ ہو گئے۔ ''زنداں''، ''زہر خنداں''، ''صدا بہ صحرا''، ''نوائے ساز''، ''حریمِ وطن'' (قومی نغمے و نظمیں) اور ''عشق پیچاں'' اُن کے مجموعے ہیں۔ ''عشق پیچاں'' ۱۹۷۲ء میں قیام راولپنڈی کے دوران مکمل ہوئی اور اگست ۱۹۷۳ء میں لاہور سے طبع ہوئی۔ اِس مجموعے میں حمد و نعت، سلام، نغمے، نظمیں اور غزلیں ہیں۔ یوسف ظفر نے حج بھی کر لیا تھا اور زیاراتِ مقاماتِ مقدسہ کے بعد سے اُن کی نعتیہ شاعری میں روحانیت کا ارتکاز محسوس ہوتا ہے اور پڑھنے والے کے دل پر اُس کے اثرات مرتب ہونے لگتے ہیں۔ یوسف ظفر کے انتقال کے کافی عرصے بعد اُن کی کلیات بھی طبع کی گئی۔ آپ ۷؍مارچ ۱۹۷۲ء کو راولپنڈی میں خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

نعت

جہاں میں تیری محبت جہاں پناہؐ ملی
کہ اس کے فیض سے توفیق لا الہ ملی

طواف کعبہ ہے منتہِ رسا کی بات مگر
مرا نصیب مجھے تیریؐ گردِ راہ ملی

حرم سے لائی حریمِ جمال میں قسمت
وہاں نگاہ، یہاں دولتِ نگاہ ملی

یہاں ہوں میں بھی جہاں تیرے نقشِ پا کے طفیل
حقیر ذرّوں کو تقدیرِ مہر و ماہ ملی

میں تیرے نقشِ کفِ پا پہ جاں نثار کروں
کہ اس کے صدقے میں ہر اک کو عزّ و جاہ ملی

ملے کبوترِ بامِ حرم کا سایہ مجھے
تو یہ کہوں کہ دو عالم کی عزّ و جاہ ملی

حضورِ مہرِ نبوت میں لے گیا ہوں ظفرؔ
مجھے حیات میں جو بھی شبِ سیاہ ملی

غزل

تیری صورت دیکھنا تھی ہر پریشانی گئی
ایک ہی جلوے سے جلووں کی فراوانی گئی

دیکھ کر تجھ کو بھلا کیا دیکھنے دے شوق دید
عمر بھر دنیا کی صورت بھی نہ پہچانی گئی

دیر تک صحرا میں بھی آیا نہ صحرا کا خیال
دور تک ہمراہ اپنے گھر کی ویرانی گئی

سانس لینے ہی کو میری زندگی سمجھا گیا
میری محرومی ہی میری آرزو جانی گئی

جانتے ہیں وہ ظفر تیرے دل و دیدہ کی بات
ہم بھی ان سے عرض کر دیں گے اگر مانی گئی

سید محمد قاسم...... بہ حیثیت محقق و مدون

سید محمد قاسم نے اپنی عمرِ عزیز کا زیادہ تر حصہ نعتیہ ادب کی خدمت، تحقیق و تدوین اور ترتیب میں صرف کیا ہے، جو زندگی کا بہترین استعمال اور جائز مقصد بھی ہے۔ زندگی کا اس سے بہتر مصرف اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ توصیفِ ربانی اور محبوبِ سبحانی کی شاد مدحت میں گزرے۔ انھوں نے "پاکستان کے نعت گو شعرا" کے عنوان سے ایک سلسلہ تصنیف کیا ہے، جس میں پاکستان بھر کے صاحبِ کتاب نعت گو شعرا کا تذکرہ اور ان کا منتخب نعتیہ کلام شاملِ اشاعت کیا گیا ہے۔ اس سلسلے کی تین جلدیں شائع ہو کر فروخت ہو چکی ہیں اور اب چوتھی غیر مطبوعہ جلد کو یکجا کر کے جامع ایڈیشن تیار کیا جا رہا ہے جو عن قریب منظرِ عام پر آنے والا ہے۔ سید محمد قاسم کی ایک اور تذکرہ نگاری کی کتاب "خاک میں پنہاں صورتیں" بھی نہ صرف زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئی بلکہ اس نے قارئینِ شعر و سخن، ناقدینِ فن و ہنر اور مشاہیرانِ اردو ادب سے داد و تحسین بھی وصول کی۔ یہ کراچی کے پانچ سو سے زائد مرحوم اہلِ قلم پر تذکرہ نگاری کا اولین کام ہے۔ موصوف اس کی دوسری جلد بھی لکھ رہے ہیں۔ حال ہی میں سید محمد قاسم کی ایک اور تازہ تصنیف "پاکستان میں غزل کے نعت گو شعرا" منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی ہے جو اپنی نوعیت کا ایک منفرد کام ہے جس نے سید محمد قاسم کو ان کے ہم عصر تذکرہ نگاروں میں ممتاز کر دیا ہے۔ "پاکستان میں غزل کے نعت گو شعرا" میں اُن شعرا کا تذکرہ ہے جن کے غزل و نعت کے مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں۔ تذکرہ نگار نے شعرا کے کوائف کے ساتھ ساتھ ان کی ایک ایک منتخب غزل و نعت بھی شاملِ اشاعت کی ہے۔ پاکستان میں اس موضوع پر یہ ایک منفرد کتاب ہے۔

شاعر علی شاعر
0336-2085325

ناشر: رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی

Rang-e-Adab Publications
Office # 5 - Kitab Market, Urdu Bazar, Karachi.
0345-2610434
021-32761100
rangeadab@yahoo.com
0336-2085325
0300-2054154
/rangeadab

Rs: 800/-